الحاقِ کشمیر

اسرار احمد آزاد

اِلحاقِ کشمیر

اسرار احمد آزاد

لالہ رُخ پبلیکیشنز سری نگر (کشمیر)

قیمت :- تین روپے

پبلشر:- لالہ رخ پبلیکیشنز سری نگر (کشمیر)
پرنٹر:- زوڈیک پریس، دہلی

فہرست مضامین

پیش لفظ

ریاست جموں و کشمیر ہندوستان کا ایک لاینفک جزو ہونے کے باوجود اپنی بعض خصوصیات کے لحاظ سے ہند یونین کے دوسرے اجزاء میں ایک امتیازی حیثیت رکھتی ہے اور اس کی یہ اہمیت کچھ اسی بات پر منحصر نہیں کہ تقسیم ہند کے نازک ترین اور صبر آزما لمحات میں اس ریاست کے حکمران، عوامی رہنماؤں اور عوام نے اسے ہندوستان کے ساتھ ملحق کر دینے کا فیصلہ کیا تھا اور اس کے رہنما اور عوام آج بھی اپنے اس دور رس نظرانہ فیصلے پر قائم ہیں یا پھر ہند یونین کے آئین میں اس ریاست کو ایک مخصوص امتیازی درجہ دیا گیا ہے بلکہ اس کی حقیقی اہمیت اس کے اس تاریخی، تہذیبی اور ثقافتی پس منظر میں پوشیدہ ہے جس نے اسے ہزاروں سال سے مختلف قوموں، تہذیبوں اور مذہبی عقیدوں کا سنگم بنائے رکھا ہے۔ اس کی اسی تاریخی خصوصیت نے اس کے باشندوں کو رواداری، آزادی، جمہوریت، مساوات اور سیکولرازم کی تعلیم دی ہے اور انھوں نے ہندوستان کے ساتھ الحاق کا جو فیصلہ کیا تھا وہ بھی ان کے اسی تاریخی پس منظر پر مبنی ہے۔

کسی ملک کی تاریخ کو اگر اس ملک کے باشندوں کے قومی کردار کی تشکیل اور تعمیر میں کوئی دخل ہوتا ہے تو پھر کشمیر کا تمام تر ماضی اور حال بھی تاریخ کے اسی عمل سے متاثر نظر آتا ہے اور کشمیر کے باشندے پچھلی تین دہائیوں سے اپنے جس قومی کردار کا مظاہرہ کرتے رہے ہیں اس میں بھی یہی تاریخی عوامل و اسباب کارفرما رہے ہیں۔

کشمیر کی تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں چار ہزار سال تک خود وہاں کے باشندوں کی حکومت قائم رہی تھی۔ اس مدت میں اس کے بعض حکمران اس وادی ہی پر نہیں بلکہ اس کی سرحدوں کے پار ہندوستان کے دوسرے علاقوں حتیٰ کہ وسط ایشیا، تبت اور چین کے بعض حصوں پر بھی حکومت کرتے رہے تھے اور ولادتِ مسیح سے ڈھائی سو سال پہلے اشوک اعظم نے اسے فتح کرکے اس پر اپنی حکومت بھی قائم کر لی تھی لیکن حکومت کے ان ہر دو ادوار میں کشمیر ہندوستان ہی کا حصہ رہا تھا۔

چودھویں صدی عیسوی میں جب کشمیر کی عنانِ حکومت اس کے پرانے حکمرانوں کے ہاتھوں سے نکل کر مسلمانوں کے ہاتھوں میں پہونچی تب بھی اس کی مذکورہ بالا خصوصیت پوری طرح برقرار رہی۔ چنانچہ تاریخ بتاتی ہے کہ سلاطینِ کشمیر کا مورثِ اعلیٰ شاہ مرزا شمس الدین برسرِ حکومت آنے سے برسوں پہلے کشمیر ہی کو اپنا وطن بنا چکا تھا اور اس خاندان کے دورِ حکومت کے آخری ایام میں چکوں کی جو چند روزہ حکومت قائم ہوئی تھی اس کے بانیوں کا مورثِ اعلیٰ لنکر چک بھی دردستان سے آ کر کشمیر ہی میں آباد ہو گیا تھا۔ اس طرح چودھویں صدی عیسوی کے تقریباً وسط سے لے کر سولھویں صدی کے اواخر تک کشمیر پر جن مسلمان بادشاہوں کی حکومت قائم رہی تھی اول تو وہ سب کشمیر ہی کے باشندے تھے اور دوسرے انھوں نے اسے کسی دور میں بھی ہندوستان سے باہر کی کسی حکومت کے ساتھ وابستہ نہیں کیا بلکہ اس تمام زمانہ میں یہ ریاست بھی ہندوستان کی دوسری ریاستوں کی طرح اپنے معاملات میں آزاد اور خود مختار رہنے کے باوجود ہندوستان ہی کا ایک حصہ رہی اور گزشتہ چار ہزار سال سے تہذیب اور ثقافت کے لحاظ سے باقی ماندہ ہندوستان کے ساتھ اس کا جو تعلق چلا آ رہا تھا اس میں کوئی فرق رونما نہیں ہوا۔ لیکن جب سولھویں صدی عیسوی کے اواخر میں اشوک اعظم کی طرح اکبر اعظم نے اسے فتح کیا تو یہ ریاست از سرِ نو ہندوستان کی مرکزی حکومت کے ماتحت آ گئی۔

اٹھارویں صدی عیسوی کے وسط میں جب خود ہندوستان میں مغل خاندان کا زوال شروع ہو چکا تھا اور سلطنت مغلیہ کے مختلف علاقوں کے صوبیدار عملاً خود مختار ہوتے جا رہے تھے احمد شاہ دُرّانی کی سرکردگی میں افغانوں نے کشمیر پر یورش کر کے اس پر قبضہ کر لیا اور اس طرح پہلی بار ہندوستان کی اس ریاست میں غیر ملکی حکومت قائم ہوئی لیکن اس غیر ملکی حکومت کی مدّت کچھ زیادہ طویل ثابت نہیں ہو سکی اور جس طرح ۱۹۴۷ء میں قبائلی حملہ آوروں کے مقابلہ کے لئے کشمیر کے باشندوں نے ہندوستان سے فوجی امداد طلب کی تھی اسی طرح ان کی درخواست پر پنجاب کے حکمراں مہاراجہ رنجیت سنگھ نے ۱۸۱۹ء میں اپنی فوج بھیج کر کشمیر کی غیر ملکی حکومت کو شکست دی اور ہزاروں سال کے بعد عارضی طور پر ہندوستان سے اس ریاست کا جو سیاسی اور علاقائی رشتہ ٹوٹ گیا تھا اسے از سرِ نو وابستہ کر دیا۔

تاریخی واقعات کی رفتار قومی زندگی کے کسی ایک ہی گوشے کو متاثر نہیں کرتی بلکہ وہ قوموں کی زندگی کے ہر پہلو پر اثر انداز ہوتی ہے۔ یہی واقعات قوموں کی تہذیب اور ثقافت کے دھاروں کے رُخ بدل کر انھیں نئی نئی راہوں پر ڈالتے ہیں اور ان کے کردار میں پختگی اور استقلال پیدا کرنے کے موجب ثابت ہوتے ہیں۔ اس زاویۂ نظر سے بھی کشمیر ایک مثالی حیثیت رکھتا ہے۔

کشمیر کی طویل تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کے دوسرے حصّوں کی طرح وہاں بھی ہزاروں سال تک قدیم مذہبی عقائد، فلسفہ اور تہذیب کو فروغ حاصل رہا ہے۔ پھر اشوک اعظم کی بدولت وہاں بودھ مت کو پہونچنے کا موقع ملا ہے اور اس کے زمانہ نیز اس کے جانشینوں کے دورِ حکومت میں وہاں بودھ مت کی تبلیغ بھی ہوتی رہی ہے۔ مسلمان ہندوؤں کے عہدِ حکومت ہی میں وہاں پہونچ چکے تھے جن میں سنّی اور شیعہ دونوں ہی عقائد کے مسلمان شامل تھے اور انھوں نے کشمیر ہی کو اپنا وطن بنا لیا تھا۔ پھر اسی قدر نہیں بلکہ مورخ فرشتہ کے بیان کے مطابق عراق کے ایک باشندہ شمس الدین نے کشمیر میں اقامت اختیار کر کے اپنا نام میر محمد نوربخش رکھ کر مذہب نوربخش کے

نام سے ایک نئے مذہب کی دعوت بھی دی تھی اور قیاس کہتا ہے کہ کشمیر کی سرزمین زرتشت اور کنفیوشس کے مذہبی خیالات سے بھی ناآشنا نہیں تھی اور اس طرح یہ وادی مذہبی عقائد کے دھاروں کا ایک زبردست سنگم بن گئی تھی۔ لیکن جس طرح بہشت بریں میں پہونچ کر انسانوں کے مذہبی اختلافات باقی نہیں رہیں گے اسی طرح اس بہشت ارضی میں مذاہب عالم کے اس اجتماع نے تصادم کی شکل اختیار نہیں کی بلکہ شیر و شکر کی طرح مل جل کر رہتے اور اسی لئے اس سرزمین میں اس فلسفہ کو بھی بے حد فروغ حاصل ہوا جسے تصوّف کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے اور جس کا واحد مقصد مختلف مذاہب کے ماننے والوں کے خیالات میں اعتدال پیدا کر کے انھیں ایک دوسرے کے دوش بدوش معرفت حق اور خدمت خلق کی راہ پر چلانا ہے۔

تصوّف کے زاویۂ نظر سے بھی کشمیر کے باشندوں نے ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔ کشمیر کی یہ وادی ہی للیشوری یعنی لل دید یا لله عارفہ اور مشہور کشمیری صوفی نند رشی یا شیخ نورالدین کی جنم بھومی ہے اور جب تیمور لنگ کے جبر و ظلم سے تنگ آ کر وسط ایشیا کے ممتاز درویش سید علی ہمدانی رحمۃ نے ترک وطن کیا تھا تو انھیں اسی وادی میں پہونچ کر سکون اور اطمینان حاصل ہوا تھا۔ ان صوفیوں اور درویشوں نے جن میں ہندو سادھو اور رشی نیز مسلمان صوفی اور پیر دونوں ہی شامل ہیں، کشمیر میں مذہبی رواداری اور میل ملاپ کی جو فضا پیدا کی تھی کشمیر کے عوام آج تک اسی فضا میں سانس لیتے ہیں۔ ان کی زبان پہ آج بھی انھیں بزرگوں کے اقوال چڑھے ہوئے ہیں، آج بھی وہ اپنے ان روحانی اور اخلاقی پیشواؤں کو محبت اور عقیدت کے ساتھ یاد کرتے ہیں اور ان کی زندگی میں انھیں بزرگوں کی تعلیمات کا رنگ جھلکتا ہوا نظر آتا ہے۔

کشمیر کی سرزمین پہ مذاہب عالم کا یہ اجتماع اور اختلاط ان افراد اور قوموں کی بدولت ہوا تھا جو اس وادی کے ہر چہار اطراف سے وہاں آتی رہی تھیں۔ یہ قومیں اپنے مذہب ہی نہیں بلکہ اپنے علوم و فنون اور اپنے رواجات اور رسوم بھی ساتھ لائی تھیں لیکن جس طرح وہاں پہونچ کر مذہبی عقائد کی شدت

میں اعتدال پیدا ہو گیا تھا اسی طرح ان قوموں کے تہذیبی، ثقافتی، علمی اور فنی مزاج میں امتزاج بھی پیدا ہو گیا تھا اور ہر قوم کی تہذیبی اور ثقافتی خصوصیات، کشمیر کی قدیم تہذیب اور ثقافت پر اپنے تابناک نقوش ثبت کر کے خود اس میں مدغم ہو گئی تھیں۔

اس سلسلے میں زبان، رسم و رواج اور تعمیرات کا تذکرہ بھی بے محل نہ ہوگا۔ یہ امر محتاج بیان نہیں کہ آریہ قوم کی زبان سنسکرت تھی اور آریہ جب اقصائے عالم میں پھیلے تو ہر ملک میں ان کی زبان بھی ان کے ساتھ گئی تھی لیکن ہر ملک کے مقامی حالات اور ضرورتوں نے اس زبان کی شکل کو بدل دیا تھا۔ مگر ہندوستان میں چونکہ سنسکرت کو ایک مذہبی زبان کی حیثیت سے محفوظ رکھا گیا تھا اور اس کا پڑھنا لکھنا صرف برہمنوں ہی کے لئے مخصوص کر دیا گیا تھا اس لئے اس وسیع ملک کے ہر خطہ میں مقامی زبانیں بھی وجود میں آ گئی تھیں جنھیں پراکرت یا عوام کی زبان کہا جاتا تھا اور کشمیر بھی اس قاعدہ سے مستثنیٰ نہیں تھا۔ چنانچہ مسلمانوں کی آمد سے پہلے کشمیر میں بھی خواص کی زبان سنسکرت اور عوام کی زبان کشمیری تھی لیکن مسلمان جب کشمیر میں پہونچے تو ان کے ساتھ وہاں فارسی زبان کا سکہ بھی رائج ہوا۔ چنانچہ آج کی کشمیری زبان میں سنسکرت الفاظ کے دوش بدوش فارسی اور اس کے توسط سے ان زبانوں کے الفاظ بھی موجود ہیں جن سے خود فارسی زبان متاثر ہوئی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ سنسکرت کی ترقی میں بھی کوئی رکاوٹ نہیں پیش آئی۔ چنانچہ ۱۳۸۵ء میں جگدر بھٹ نے استوتی کسمانجلی، ۱۴۷۷ء میں سری کنٹھ نے بال بودھنی، ۱۵۰۵ء میں ولبھ دیو نے پدا ولی اور ۱۵۷۷ء میں شیو ویدیا نے وجیان بھیرو ایسی کتابیں لکھی تھیں اور مسلمانوں ہی کے دور حکومت میں ملا احمد علامہ نے مہابھارت اور راج ترنگنی کو فارسی زبان میں منتقل کیا تھا۔

کشمیر میں علم اور زبان کی اس ہم آہنگی کی بدولت جہاں مسلمان سنسکرت سیکھنے پر فخر محسوس کرتے تھے وہاں ہندو بھی فارسی زبان کو سیکھنے کی خواہش میں ان سے پیچھے نہیں رہتے تھے۔ چنانچہ اسی دور کے فارسی داں ہندوؤں میں پنڈت تارا رام ترکی بیتاب، پنڈت راج کول عرض بیگی اور پنڈت

راج کاک دھر فرخ خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں۔ بنیاب کا منظوم جنگ نامہ آج بھی فردوسی کے
شاہنامہ کو دعوتِ مبارزت دے رہا ہے اور عرض بیگی کا فارسی کلام ادبی زاویۂ نظر سے غنی کے بعد بہترین
سمجھا جاتا ہے۔ یہاں منشی بھوانی داس کا چرو کا ذکر کر دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔ پنڈت بھوانی داس
نے فارسی نظم میں بحرِ طویل کا ایک نیا ڈھنگ اختیار کیا تھا اور یہ ڈھنگ آج بھی مقبول ہے۔ پھر زبانوں
کے معاملے میں اہلِ کشمیر کی وسعتِ نظر اور رواداری اسی حد تک ختم نہیں ہو جاتی بلکہ وہ کشمیری زبان کی
ترقی اور تزئین میں بھی اسی طرح مل جل کر حصہ لیتے رہے ہیں اور کشمیری زبان کو ترقی دینے میں جو ہندو
اور مسلمان پیش پیش رہے ہیں ان میں للہ عارفہ، نند رشی، حبہ خاتون، ارنیمال، روپ بھوانی، راجنگ تشی کانٹھ
محمود غنی، ولی اللہ متو، پیر مقبول شاہ کرالواری، میر رسول، پرمانند، لکشمن، پرکاش رام، کرشن داس
عزیز درویش، وہاب خان، عبدالاحد آزاد اور غلام احمد مہجور کے نام ہمیشہ یادگار رہیں گے۔

یہاں اس بات کو بھی سمجھ لینا چاہیئے کہ کشمیر کے اہلِ علم و قلم نے جس زبان میں بھی اظہارِ خیال
کیا ہے انھوں نے نہ صرف اسی زبان کے اعلیٰ معیار کو قائم رکھا ہے بلکہ خود اپنے ماحول اور اپنی قدیم روایات
سے بھی انحراف نہیں کیا اور اس طرح ہمیں کشمیر کے ہندو اور مسلمان شاعروں اور ادیبوں کے کلام اور تحریرات
میں خیالات اور تصورات کی ایک حیرت انگیز ہم آہنگی نظر آتی ہے۔

کشمیر کے باشندوں کی سماجی زندگی میں بھی بہت بڑی حد تک یکسانیت پائی جاتی ہے۔ مثلاً
بہت سے میلوں میں ہندو اور مسلمان مل کر شریک ہوتے ہیں۔ دونوں فرقوں کی مقدس زیارت گاہیں
بھی عموماً پاس پاس ہی واقع ہوئی ہیں اور ان پر سالانہ اجتماع کی تاریخیں بھی عموماً ایک ہی ہیں کشمیری
ہندوؤں اور مسلمانوں کے لباس میں بھی کچھ زیادہ فرق نہیں حتّٰی کہ شادی بیاہ تیز پیدائش اور موت کی
بعض رسمیں بھی تھوڑے تھوڑے اختلاف سے ایک ہی جیسی ہیں۔ مثلاً بچہ کی پیدائش کے موقع پر کشمیری پنڈت
دونوں زیارت گاہوں پر جانے اور درویشوں سے دعائیں کراتے ہیں اور دونوں فرقوں کے بے اولاد افراد
منوتیں رکھ کر اولاد پانے کی دعا کرتے ہیں۔ اسی طرح بچے کی پیدائش کے بعد ہندوؤں اور مسلمانوں میں

زچہ کو ساتویں ہی دن نہلایا جاتا ہے اور اس موقع پر جو رسوم ادا کی جاتی ہیں وہ اپنے مذہبی حصّوں کو چھوڑ کر تقریباً ایک ہی جیسی ہوتی ہیں۔

سرزمین کشمیر اپنے قدرتی حسن کے ساتھ ساتھ اپنی فن کارانہ روایات اور فنِ تعمیر کے لئے بھی مشہور ہے اور اس کی فنّی روایات اور فنِ تعمیر میں بھی اس کے باشندوں کی وسعتِ نظر، مختلف ممتاز فنونِ تعمیر سے خوشہ چینی کے جذبہ اور بنیادی خیالات و تصوّرات کی یگانگت اور ہم آہنگی کا اظہار ہوتا ہے۔ چنانچہ ہندوؤں کے عہدِ حکومت کی تعمیرات یونانی اور بودھ فنِ تعمیر سے متاثر نظر آتی ہیں اور مسلمانوں کے دورِ حکومت کی تعمیرات میں بودھ اور ہندوؤں کے فنونِ تعمیرات کے خدوخال اُبھرے ہوئے معلوم ہوتے ہیں اور کشمیر کی تاریخ کے مطالعہ نیز باشندگانِ کشمیر کی زندگی کے مشاہدہ کے بعد یہ نتیجہ اخذ کر لینا کچھ مشکل کام نہیں رہ جاتا کہ کشمیر ما قبل از تاریخ ہی سے ہندوستان کا ایک ایسا حصّہ رہا ہے جس میں انسانیت کی اعلیٰ قدریں کامل درخشانی کے ساتھ کارفرما رہی ہیں۔ اس کے باشندوں نے رواداری، وسعتِ نظر اور موجودہ زمانہ کی سیاسی اصطلاح میں سیکولرازم کو اپنی زندگی کا شعار بنائے رکھا ہے۔ وہاں کے مسلمان سلاطین نے بھی کسی دور میں اس سرزمین کو ہندوستان سے علیحدہ نہیں سمجھا۔ اس خطۂ ارض کی تہذیب اور ثقافت ہندوستان ہی کی تہذیب و ثقافت کی آئینہ دار رہی ہے اور اس کے باشندے اپنے ہر آڑے وقت میں ہندوستان ہی کی امداد و اعانت پر بھروسہ کرتے رہے ہیں۔

۱۹۴۷ء میں ہندوستان کی تقسیم کے وقت کے حالات میں، کشمیر کے باشندوں نے جن کی اکثریت مسلمانوں پر مشتمل ہے، ہندوستان کے ساتھ الحاق کا جو فیصلہ کیا تھا وہ بادی النظر میں ایک عجیب سا فیصلہ معلوم ہوتا ہے لیکن جب ہم اسے کشمیر کی ہزاروں سالہ تاریخ کی روشنی میں دیکھتے ہیں تو یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ کشمیر کے باشندوں کے لئے اپنے تاریخی راستہ طبعی اور جغرافیائی ماحول، جمہوری نظریۂ حیات اور مذہبی رواداری کے جذبہ سے انحراف ممکن ہی نہیں ہو سکتا تھا۔

کشمیر کے بیشتر باشندے مسلمان مرد ہیں اور ان کے مذہبی عقائد کی پختگی نیز شعائرِ اسلامی

کے ساتھ ان کی عقیدت اور وابستگی کو دوسرے مسلمانوں کے مقابلے میں کسی طرح بھی کم تر نہیں کہا جا سکتا

لیکن مولانا آزاد مرحوم کے الفاظ میں

"یہ کہنا کہ جو علاقے جغرافیائی، اقتصادی، لسانی اور ثقافتی اعتبار سے مختلف ہیں انھیں مذہبی مماثلت کی بنیاد پر متحد کیا جا سکتا ہے، انسان کو سب سے بڑے فریب میں مبتلا کرتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اسلام نے نسلی، لسانی، اقتصادی اور سیاسی حدود کو توڑ کر ایک معاشرہ قائم کرنے کی کوشش کی تھی لیکن تاریخ سے ثابت ہوتا ہے کہ چند دہائیوں یا زیادہ سے زیادہ ایک صدی کے بعد اسلام بھی محض اسلام کے نام پر مختلف اسلامی ملکوں کو ایک ریاست میں متحد نہیں کر سکا۔"

کشمیر کے باشندوں کے لئے محض مذہب کے نام پر پاکستان کے ساتھ متحد ہو جانا، ہندوستان کے ساتھ قائم شدہ اپنے جغرافیائی، تاریخی، اقتصادی، لسانی اور ثقافتی تعلقات کو منقطع کر لینا اور اپنے سیکولر سیاسی رجحانات کو فراموش کر دینا ممکن نہیں ہو سکتا تھا۔ اور اسی لئے انھوں نے اپنے مستقبل کو ہندوستان کے ساتھ وابستہ کر کے وہ راہ اختیار کی ہے جو سیاسی اور سماجی طور پر بالغ نظر اور شعور یافتہ قومیں اختیار کیا کرتی ہیں۔

پھر اسی قدر نہیں بلکہ کشمیر کی سیاسی بیداری کی تاریخ بھی ہندوستان ہی کی سیاسی بیداری کی تاریخ کے ساتھ وابستہ رہی ہے۔ چنانچہ انگریزوں کی حکومت کے اس دور میں جب برطانوی ہند کے باشندے اپنے وطن کی آزادی کی جدوجہد میں مصروف تھے اور ہندوستانی ریاستوں کے باشندے دیسی حکمرانوں کی سخت ترین گرفت میں پھنسے ہوئے ہونے کے سبب سے بظاہر اس جدوجہد سے بےتعلق معلوم ہوتے تھے، ریاست جموں اور کشمیر کے باشندے، برطانوی ہند کے باشندوں کی اس جدوجہد کے نہ صرف مؤید ہی تھے بلکہ خود اپنے عزیز وطن کو دہاں کی مطلق العنان حکومت سے نجات دلانے کی جرأت مندانہ کوششوں میں بھی مصروف تھے اور دوسری طرف خود اُن کی جدوجہد کو پورے قوم پرور ہندوستان کی تائید اور حمایت حاصل

تھی اور حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان کی قومی جدوجہد ہی کی بدولت کشمیر کے باشندوں کی جدوجہد بھی نہ صرف عالم وجود میں آئی تھی بلکہ اس جدوجہد کو قوم پرور ہندوستان ہی نے تقویت بھی پہونچائی تھی اور کشمیر کے باشندوں نے ہندوستان کے ساتھ وابستہ رہنے کا جو فیصلہ کیا ہے اس میں اس امر کو بھی بہت زیادہ دخل حاصل ہے۔

سطور بالا میں کشمیر کے باشندوں کے جس قومی کردار کا ذکر کیا گیا ہے اگرچہ وہ بجائے خود ایک سیکولر جمہوری ملک کے ساتھ اس کی وابستگی کے لئے ایک طاقت ور محرک کی حیثیت رکھتا تھا لیکن اسے جن خارجی اسباب و عوامل سے تقویت ملی تھی وہ بھی کچھ کم اہمیت کے حامل نہیں تھے اور یہاں ان کا تذکرہ کر دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔

یہ امر محتاجِ بیان نہیں کہ انڈین نیشنل کانگریس ہمیشہ سے متحدہ قومیت کی علم بردار رہی ہے اور آزادیٔ وطن کے حصول تک ملک کے تمام حریت خواہ اور قوم پرور عناصر کانگریس ہی کے ساتھ وابستہ تھے۔ ان قوم پرور عناصر میں ہندوستان کے ممتاز ترین مسلمان علماء، دانش ور اور سیاست دان شامل تھے اور قومی آزادی کی جدوجہد میں مسلمانوں نے بھی اس ملک کے دوسرے قوم پرور عناصر سے کچھ کم قربانیاں نہیں کی تھیں۔ حتیٰ کہ فرقہ پرستی کے شباب کے اس زمانہ میں جب ایک طرف تو مسلم لیگ، ملک کی تقسیم کے مطالبہ پر اصرار کر رہی تھی اور دوسری طرف وہ 'انڈین نیشنل کانگریس' کو 'ہندو جماعت' کے نام سے موسوم کرتی تھی، ہندوستان کے قوم پرور مسلمان غیر معمولی جرأت اور استقلال کے ساتھ نہ صرف تقسیم ہند کے مطالبہ ہی کی مخالفت کر رہے تھے بلکہ کانگریس کے ساتھ ان کی وابستگی، کانگریس کے غیر فرقہ وارانہ کردار کا ناقابلِ تردید ثبوت بھی پیش کر رہی تھی۔ کشمیر کے باشندے ہندوستان کے بے شمار قوم پرور مسلمانوں کے اس ایثار اور استقلال سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے تھے جن کا مظاہرہ وہ ہندوستان کی آزادی، متحدہ قومیت کی تشکیل و تعمیر اور ہندوستان میں سیکولر جمہوریہ کے قیام کے سلسلے میں کر رہے تھے اور وہ اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتے تھے کہ مسلم لیگ، جو مسلمانوں کی نمائندہ جماعت ہونے کی مدعی ہے،

کشمیر کے باشندوں کی جن کی اکثریت مسلمانوں پر مشتمل ہے، تحریکِ آزادی کی مخالفت کر رہی ہے، لیکن انڈین نیشنل کانگریس ہر ممکن طریقہ سے اس تحریک کو کامیاب بنانے کی کوششوں میں مصروف ہے۔ اور کشمیر کے رہنماؤں اور عوام نے ہندوستان کے ساتھ الحاق کا جو فیصلہ کیا تھا اس میں ہندوستان کے قوم پرور مسلمانوں کے اخلاص، عزم اور استقلال نیز انڈین نیشنل کانگریس کے غیر فرقہ وارانہ کردار کو بھی بہت زیادہ دخل حاصل تھا۔ اس طرح کشمیر کے باشندوں پر ہندوستان کی تمام سیاسی جدوجہد، قوم پرور مسلمانوں کے نظریات اور کانگریس کے غیر فرقہ وارانہ کردار نیز کشمیر کے باشندوں کی جدوجہد میں اس کی غیر مشروط اعانت وحمایت کا جو ردِ عمل ظاہر ہوا اس سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ ان کے سیاسی رجحانات کس قدر ترقی پسندانہ اور ہندوستان کے سیاسی رجحانات سے کس قدر قریب تھے اور اس واقعہ سے یہی ہندوستان کی دوسری ریاستوں پر ریاست جموں اور کشمیر کی فوقیت ثابت ہوتی ہے۔

پھر ۱۹۴۷ء کے فرقہ وارانہ ہنگاموں کے طوفانی دور میں اس ریاست کے باشندوں نے اپنی جس غیر فرقہ وارانہ سالمیت اور یکجہتی کا مظاہرہ کیا تھا وہ بجائے خود اس امر کا ثبوت ہے کہ ہزاروں سال سے ان کی قومی زندگی میں محبت، یگانگت، سماجی رواداری اور مذہبی وسعتِ نظر کے جو عناصر کارفرما رہے تھے وہ پریشان اور سطحی نہیں بلکہ حقیقی تھے لیکن کیا یہ امر موجبِ حیرت اور افسوس نہیں کہ ہندیونین کی ایک ایسی ریاست کے متعلق جس کا ماضی بے حد تابناک رہا ہے، جس کی تہذیب اور ثقافت، ہندوستان کی حقیقی تہذیب اور ثقافت کی نمائندگی کرتی رہی ہے، جس کے باشندے ہزاروں سال سے سیکولرازم کے حقیقی مفہوم کے حامل اور اس پر کاربند رہے ہیں، جس کے حُسن خداداد کو شاہانِ سلف نے سراہا ہے، جس کا دامن ہر مذہب کے ماننے والوں کی روحانی تگ و تاز کا میدان بنا رہا ہے اور جس کے باشندے اپنے سیاسی اور سماجی رجحانات اور تصورات کی بنا پر آج بھی نہ صرف ہندوستان کے ساتھ وابستہ ہیں بلکہ اس وابستگی پر فخر اور مسرت بھی محسوس کرتے ہیں اور سب

کے بعد ایک ایسی اہم ریاست کے متعلق جس کے محلِ وقوع نے آج اسے بین اقوامی اہمیت کا حامل بنا رکھا ہے، اردو زبان میں کوئی ایسی کتاب موجود نہیں جو ملک کے اردو داں باشندوں کو اس ریاست سے متعلق بیر حاصل، ذمہ دارانہ اور اطمینان بخش معلومات بہم پہونچا سکے۔

یہاں اس بات کو بھی ذہن نشین کر لینا چاہیئے کہ ہندوستان کے ساتھ ریاست جموں اور کشمیر کا الحاق ریاست کے حکمران اور عوامی راہنماؤں کی درخواست اور خواہش پر ۲۶- اکتوبر ۱۹۴۷ء کو اس ریاست کی تاریخ کے ان نازک ترین لمحات میں عمل میں آیا تھا جب کشمیر کے ہمسایہ ملک، پاکستان کے اشارہ اور اعانت سے قبائلی باشندوں نے نہ صرف پوری قوت سے اس پر حملہ ہی کر دیا تھا بلکہ وہ سری نگر کے قریب بھی آ پہونچے تھے اور اگرچہ ریاست کے باہمت فرزندوں نے اپنی تمام تر لیکن محدود قوتوں کو اپنے عزیز وطن کی مدافعت پر مرکوز کر دیا تھا لیکن یہ بات ظاہر ہے کہ اگر انھیں ہندوستان سے بروقت فوجی اور اخلاقی امداد نہ مل سکتی تو آج کشمیر اپنی آزادی پر فخر نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن ہندوستان کے ساتھ ریاست جموں اور کشمیر کے اس الحاق کی بدولت داخلی اور بین اقوامی طور پر بعض ایسے سوالات بھی پیدا ہو گئے ہیں جو کشمیر کی تاریخ میں ایک نئے باب کا عنوان بنے ہوئے ہیں اور اس باب میں وہ تمام اقدامات اور تغیرات شامل ہیں جو اکتوبر ۱۹۴۷ء کے اواخر سے اس وقت تک خود ریاست کے اندر یا اس ریاست کے نام پر ریاست کی حدود سے باہر پیش آتے رہے ہیں اور جنھیں سمجھنے اور سمجھانے کی ضرورت اور اہمیت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن جہاں تک ملک کے بے شمار اردو داں باشندوں کا تعلق ہے ان کی اس اہم ضرورت کو پورا کرنے کے لئے بھی کوئی قابلِ ذکر کتاب موجود نہیں۔

پیشِ نظر کتاب کی ترتیب اور اشاعت کا مقصد ملک کے اردو داں طبقہ کی ان ہی ضرورتوں کو پورا اور اس خلاء کو پُر کرنا ہے جو کشمیر اور اس کی گوناگوں اہمیتوں کے متعلق پورے ملک میں موجود نظر آتا ہے اور اسی لئے اس کی ترتیب میں اس بات کو مدِ نظر رکھا گیا ہے کہ اس کے ذریعہ سے

نہ صرف ریاست جموں و کشمیر کے ماضی ہی کے متعلق مفید اور دلچسپ معلومات حاصل ہو سکیں بلکہ اس سے متعلق تمام تر موجودہ مسائل کا صحیح صحیح علم بھی حاصل کیا جا سکے اور اس کے ماضی اور حال کی روشنی میں اس کے مستقبل کا اندازہ بھی ہو جائے۔

اس کتاب کی ترتیب میں جن کتابوں، اخبارات، رسالوں اور دستاویزات سے استفادہ کیا گیا ہے ان کی فہرست بہت زیادہ طویل ہے اور اسے اس کتاب کے ساتھ منسلک کرنا ممکن نہیں ہو سکتا لیکن ان سب کتابوں اور رسالوں کے مصنفین، مقالہ نگار اور مدیر شکریہ کے مستحق ہیں۔

توقع ہے کہ یہ کتاب اپنے بنیادی مقصد کو پورا کر سکے گی اور اس کی بدولت ملک کا اردو داں طبقہ کشمیر اور اس سے تعلق رکھنے والے تمام تر مسائل سے پوری طرح واقف ہو سکے گا۔

پہلا باب

جغرافیائی اور تاریخی حالات

برطانوی دورِ حکومت میں جہاں برِ صغیرِ ہند "برطانوی ہندوستان" اور "ہندوستانی ہندوستان" کے نام سے دو حصوں میں منقسم تھا وہاں "ہندوستانی ہندوستان" بھی ۵۶۲ ریاستوں میں بٹا ہوا تھا اور ان ہندوستانی ریاستوں میں ریاست جموں اور کشمیر کو رقبہ کے لحاظ سے پہلا اور آبادی کے اعتبار سے چوتھا درجہ حاصل تھا چنانچہ برطانوی دورِ حکومت کی آخری مردم شماری کے مطابق ۱۹۴۱ء میں اس ریاست کی آبادی ۴۰۲۲۰۰۰ افراد پر مشتمل تھی اور ۱۹۵۱ء کی مردم شماری کے اعداد و شمار سے معلوم ہوتا ہے کہ دس سال میں اس کی آبادی ۴۳۲۸۲۸۰ افراد تک پہونچ گئی تھی۔

ریاست جموں اور کشمیر جو ہندوستان کی تقسیم سے پہلے بھی اپنی تاریخ، تہذیب اور ثقافت کے زاویۂ نظر سے غیر منقسم ہندوستان کی ایک اہم ریاست سمجھی جاتی تھی اور تقسیمِ ہند کے بعد ہندوستان کے ساتھ الحاق کے فیصلہ کی بدولت آج ہند یونین کے ایک لاینفک جزو کی حیثیت رکھتی ہے، ہندوستان کے شمالی مغربی گوشہ میں کوہستان ہمالہ کے درمیان واقع ہے۔ اس کا رقبہ ۸۴۴۷۱ مربع میل ہے اور اس کے مشرق میں تبت، شمال میں عوامی چین کا علاقہ

سنکیانگ اور افغانستان، مغرب میں پاکستان اور جنوب میں ہندوستان کی دوسری ریاست پنجاب واقع ہے اور اس طرح آج کے ہندوستان کا یہ حصہ ہمیشہ سے مختلف تہذیبوں، قوموں، زبانوں اور مذہبوں کا سنگم بنا رہا ہے اور اس کے اسی محلِ وقوع نے آج اسے بین اقوامی توجہ کا مرکز بنا رکھا ہے۔

کوہستان ہمالہ کے قلب میں واقع، ہندیونین کی یہ ریاست اپنے گردوپیش کے برف پوش پہاڑوں، خوبصورت چشموں اور آبشاروں، نیلگوں پانی سے لبریز وسیع جھیلوں، فراخ وادیوں نیز پھولوں کی کثرت اور پھلوں کی فراوانی کی بدولت بجا طور پر "جنتِ ارضی" کہلاتی ہے اور اگرچہ یہ طبیعی خصوصیات اس ریاست کے بیشتر حصہ میں پائی جاتی ہیں لیکن ان کا حقیقی مرکز کوہستان ہمالہ اور کوہستان قراقرم کے بلند سلسلوں میں گھرا ہوا وہ بلند اور بیضوی شکل کا میدان ہے جسے وادیٔ کشمیر کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ یہ میدان سطح سمندر سے ۵ ہزار فٹ سے ۶ ہزار فٹ تک بلند ہے اور اس کا عرض ۲۵ میل اور طول ۸۰ میل سے کسی قدر زیادہ ہے اور اس کے ان ہی طبعی حالات کی بدولت اس کے مختلف مقامات کی آب وہوا میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے چنانچہ ایک جانب تو وہاں کے پہاڑی علاقوں میں خون کو منجمد کر دینے والی سردی پڑتی ہے اور دوسری طرف سری نگر ایسے میدانی علاقوں میں معتدل اور خوشگوار موسم بھی ملتا ہے اور اس خطۂ ارض کے یہی وہ ظاہری اور باطنی محاسن ہیں جن کی بدولت، اس سرزمین پر قدم رکھتے ہی مغل شہنشاہ جہانگیر کی زبان سے بے ساختہ یہ الفاظ نکل گئے تھے کہ ــ کشمیر بہشتِ ارضی ہے، واعظ جس بہشت کا تذکرہ کرتے اور شعراء جس بہشت کی تعریف میں گیت گاتے رہے ہیں وہ کشمیر ہی ہے۔

وادیٔ کشمیر کا شمار دنیا کے معدودے چند زرخیز ترین علاقوں میں کیا جاتا ہے اور اس میں بھی ثروت مندی اور دل کشی کے اعتبار سے وہ حصہ خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہے جہاں سے دریائے جہلم اور معاون دریا سندھ اور لدر ہو کر گذرتے ہیں۔ دریائے جہلم شمال میں کھنہ بل سے

لے کر جنوب میں بارہ مولا تک قابلِ جہاز رانی ہے۔ کھنہ بل اور بارہ مولا کا یہ درمیانی فاصلہ تقریباً ۹۰ میل ہے۔ ریاست جموں اور کشمیر اور بیرونی دنیا کے درمیان تجارت اور آمدورفت کے لئے دریائے جہلم ایک آبی شاہراہ کی حیثیت رکھتا ہے اور غالباً دنیا بھر میں وادیٔ کشمیر کے علاوہ ایسی کوئی دوسری وادی موجود نہیں جو اس قدر بلندی پر واقع ہونے کے ساتھ ساتھ اتنی وسیع بھی ہو اور اس میں جہلم جیسا زبردست دریا کم وبیش ایک سو میل تک بہتا ہوا چلا گیا ہو۔

کشمیر کے حسین قدرتی مناظر، صحت بخش آب وہوا اور اس کی غیر معمولی زرخیزی اور ثروت مندی کی طرح اس کی تاریخ بھی بے حد دلچسپ اور پُر قلموں واقعات کی حامل رہی ہے اور کشمیر کے ان ہی طبعی حالات اور تاریخی احوال نے خود کشمیری قوم کے مزاج اور قومی کردار کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

ہندو دیومالا کی کہانیوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ وادیٔ کشمیر کسی زمانے میں ایک بہت بڑی جھیل اور ستی سر کے نام سے موسوم تھی۔ ستی، شیوجی کی دوشیزہ پاربتی جی کا دوسرا نام ہے اور ان روایات کے مطابق وہ اس جھیل کے شمال میں واقع پہاڑ ہرکھ سے اپنی کشتی میں سوار ہوکر، جنوب میں واقع جھیل کنسرناگ تک جایا کرتی تھیں۔ اسی جھیل میں ایک خوفناک دیو جسے خود برہما کی سرپرستی حاصل تھی بہت سے ناگ، بکش اور پشاچ بھی رہتے تھے۔ یہ آبی مخلوق ساحل پر بسنے والے انسانوں کو نہ صرف ہلاک ہی کر دیتی تھی بلکہ وہ اس جھیل کے قرب وجوار سے زندگی کے ہر نشان کو بھی مٹا دیتی تھی اور اس طرح جھیل کے گردونواح کا تمام تر علاقہ ویران ہوگیا تھا۔

حسنِ اتفاق سے ساتویں منو کے زمانہ میں اس طرف سے رشی پرجاپتی کیشپ کا گذر ہوا وہ مراچی کے فرزند اور برہما کے پوتے تھے اور جب انھیں اپنے فرزند نیل ناگ سے اس تباہ کاری کا حال معلوم ہوا جو جل دیو اور اس کے ماتحتوں نے برپا کر رکھی تھی تو انھوں نے اس بات کا عہد کرلیا کہ وہ لوگوں کو اس خبیث آبی مخلوق سے نجات دلائے بغیر چین نہیں لیں گے۔ چنانچہ انھوں نے اسی جگہ

بیٹھ کر تپسیا شروع کردی اور ایک ہزار سال تک اسی حالت میں رہنے کے بعد جب وہ جل دیو کا مقابلہ کرنے کے لئے اُٹھے تو جل دیو پانی میں جا چھپا۔ رشی پرجاپتی کیشپ کی اس بے بسی کو دیکھ کر تین دیوتاؤں یعنی برہمن، اوپندر اور رودر کو ان پر بے حد ترس آیا اور ان کی سفارش سے وشنو مہاراج خود رشی کیشپ کی امداد کے لئے زمین پر آئے اور انھوں نے بارہ مولا کے قریب پہاڑ کے دامن میں اپنے ہل کی نوک سے ایک ایسا سوراخ بنادیا جس کے ذریعہ سے جھیل کا تمام پانی خشک ہوگیا۔

وشنو جی کی اس عنایت سے جھیل کا پانی تو زمین میں ضرور جذب ہوگیا تھا لیکن خود جل دیو کا کوئی پتہ نہیں چل سکا تھا۔ وہ نشیبی زمین میں کسی جگہ جا چھپا تھا اور اگرچہ دیوتا اپنے ایک ہاتھ میں سورج اور دوسرے میں چاند کی مشعلیں لے کر اسے ڈھونڈنے میں مصروف تھے لیکن وہ کسی کو بھی نظر نہ آتا تھا۔ دیوتاؤں کی اس پریشانی کو دیکھ کر سریکا یعنی پاروتی جی کو رحم آگیا اور انھوں نے مینا کے روپ میں ظاہر ہوکر اپنی چونچ میں ایک کنکری لی اور اسے تاک کر جل دیو پر گرادیا۔ اس طرح اس خبیث دیو نے اس کنکری کے نیچے دب کر جان دے دی۔ لیکن یہ کنکری آہستہ آہستہ بڑھنے اور پھیلنے لگی اور وہ اس 'سریکا پربت' میں تبدیل ہوگئی جو اب 'ہاری پربت' کہلاتا ہے اور اس پر پاروتی جی کی یادگار کے طور پر ایک مندر بھی بنا ہوا ہے۔

بہرحال رشی کیشپ کی تپسیا کی بدولت جھیل کا پانی خشک ہو کر جو زمین نمودار ہوئی تھی، ابتدا میں اسے 'کیشپ مر' یعنی کیشپ کی قیام گاہ کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا اور 'کشمیر' اسی کیشپ کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔

ہندو دیومالا کی یہ کہانی اسی جگہ ختم نہیں ہوجاتی بلکہ اس سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ اگرچہ جل دیو کی ہلاکت کے بعد چھوٹے جل دیوؤں کی ہمتیں بھی پست ہوگئی تھیں اور انھوں نے انسانوں کو ستانا چھوڑ دیا تھا اور اسی لئے گرمی کے موسم میں آس پاس کے میدانوں سے لوگ وہاں جانے بھی لگے تھے۔ لیکن وہ سردی کے زمانے میں واپس چلے آتے تھے اور اس طرح اس موسم میں انس

وادی پر دیووں ہی کا قبضہ رہتا تھا۔ لیکن اسے انسان کی خوش نصیبی سمجھنا چاہیئے کہ ایک سال موسم سرما میں ایک ضعیف برہمن کو اس وادی میں رہنے پر مجبور ہو جانا پڑا۔ اور جب ان خبیث دیووں نے اس بوڑھے اور کمزور برہمن کو نقصان پہونچانا چاہا تو اپنی کیشپ کے فرزند نیل ناگ نے وہاں پہونچ کر نہ صرف اسے نقصان ہی سے محفوظ رکھا بلکہ اسے 'نیل مت پران' بھی عنایت کیا جس کے مطالعہ کی بدولت کشمیر کے برہمن ان تدابیر سے واقف ہو گئے جن سے ان خبیث دیووں کو ہلاک کیا جا سکتا تھا۔ اس طرح ان دیووں کی ہلاکت کے بعد اس وادی میں انسانی آبادی کا آغاز ہوا۔ پہر سن عیسوی کے آغاز سے تقریباً دو ہزار سال پہلے جنت کی کچھ پریوں اور آکاش کی دیویوں نے اس وادی میں آکر جھیلوں اور دریاؤں کی شکل میں وہاں رہنا شروع کر دیا۔ رفتہ رفتہ ان ہی جھیلوں اور دریاؤں کے کناروں پر بستیاں بس گئیں جن میں راجا حکومت کرنے لگے اور یہ راجا اور ان کی پرجا گرمی کے موسم میں پوری وادی میں گھوم پھر کر اس کی قدرتی ثروت مندی اور دلکشی کو دوبالا کرنے لگے۔

دیو مالا کی یہ کہانی اپنی جگہ درست ہے یا نہیں؟ یہاں اس پر بحث و نظر کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی لیکن یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ اس کہانی کی طرح نہ صرف کشمیر کی سرزمین ہی انسانی وہم و قیاس سے کہیں زیادہ حسن، جاذبیت اور دلکشی کی حامل واقع ہوئی ہے بلکہ اس کے باشندوں کی امن پسندی، وسعت نظر اور رواداری بجائے خود اُن کی روحانی اور اخلاقی قدروں کی پختگی پر دلالت کرتی ہے۔

غیر ملکی مؤرخوں اور اصحاب علم و قلم کو بجا طور پر یہ شکایت رہی ہے کہ پُرانے زمانے کے ہندوستانی علماء اچھے مؤرخ نہیں ہوتے تھے اور اسی لئے قدیم ہندوستان کی کوئی معتبر اور مستند تاریخ نہیں ملتی لیکن کشمیر کی قدیم سرزمین سے متعلق یہ شکایت نہیں کی جا سکتی۔ اس سرزمین کی تاریخ موجود ہے جسے بارھویں صدی عیسوی کے نصف اول میں مشہور کشمیری مؤرخ کلہن نے مدون کیا تھا لیکن کلہن کے اس علمی کارنامہ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے پہلے بھی کشمیر میں ایسے لوگ پیدا ہو چکے تھے جنہوں نے نہ صرف اپنے ہی زمانے کے تاریخی واقعات کو قلمبند کیا تھا بلکہ ان واقعات کو ماضی کے ساتھ بھی وابستہ اور

مربوط کرنے کی دیانت دارانہ کوشش بھی کی تھی اور مؤرخ کلہن نے اپنی قابلِ ذکر کتاب راج ترنگنی کی ترتیب کے وقت ان لوگوں کی تحریرات سے استفادہ کیا تھا۔ بہرحال راج ترنگنی کشمیری ادب اور تاریخ کے ایک ایسے شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے جس نے اس حسین وادی کے ماضی کو اس کے حال کے ساتھ مربوط کیا ہے اور چونکہ کلہن کے بعد کشمیر کی تاریخ برابر قلمبند کی جاتی رہی ہے اس لئے ہم راج ترنگنی کے وسیلہ سے اس سرزمین کی تاریخ کی راہ پر بہت دور تک پہونچ سکتے ہیں اور اگرچہ ماضی بعید کے متعلق کلہن کے تمام بیانات کو حرف بحرف صحیح تسلیم نہیں کیا جا سکتا لیکن بحیثیتِ مجموعی کشمیر کی تاریخ کی بنیاد ان ہی بیانات پر قائم ہے۔

کلہن نے اپنی کتاب کو سنہ ۱۱۸۴ ق-م میں کشمیر کے راجہ گونند کے حالات سے شروع کیا ہے لیکن اس نے ابتداء میں اس سے قبل کے زمانہ کے واقعات وحالات کا جو خلاصہ شامل کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سنہ ۲۱۸۰ ق-م تک کشمیر میں کوئی منظم حکومت قائم نہیں ہو سکی تھی لیکن سنہ ۲۱۸۰ ق-م میں راجہ دیاکرن نے اس حسین وادی میں پہلی بار ایک منظم اور باقاعدہ حکومت قائم کی تھی اور دیاکرن ہی اس سرزمین کا پہلا راجہ ہوا تھا اور اس وقت سے آئندہ چار ہزار سال تک آریہ نسل کے راجا ہی اس وادی پر حکومت کرتے رہے تھے اور اس طویل مدت میں کشمیر کے راجاؤں کے اکیس خاندان برسرِ حکومت آئے تھے۔

چار ہزار سال کی اس طویل مدت میں جن صد ہا راجاؤں نے کشمیر پر حکومت کی تھی ان میں بعض خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں۔ مثلاً راجہ ستی ورت کشمیر کا ایک متقی اور درویش صفت راجہ تھا۔ اس کے باپ کی موت کے بعد جب لوگوں نے اس سے کشمیر کی گدی پر بیٹھنے کی درخواست کی تو اس نے اس درخواست کو جن شرطوں پر قبول کیا تھا ان میں یہ شرطیں بھی شامل تھیں کہ میری حکومت کے زمانہ میں کسی شخص کو جھوٹ نہیں بولنا چاہیئے، کسی جاندار کو نہیں مارنا چاہیئے اور کسی کو دھوکا نہیں دینا چاہیئے۔ کشمیر کے اس راجہ نے تنگر اچار پربت کے دامن میں ایک جھونپڑی اور دو گودام بنوائے تھے۔ جھونپڑی میں وہ خود رہتا اور کھیتی باڑی کر کے اپنی زندگی بسر کرتا تھا۔ اور اس کے مشورہ پا

تجویز کے مطابق کامراجیہ اور مداراجیہ یعنی شمالی اور جنوبی کشمیر کے زمیندار رضاکارانہ طور پر اپنی آمدنی میں سے دسواں حصہ گوداموں میں جمع کر دیتے تھے اور راجہ خود بھی نہایت پابندی کے ساتھ اپنی آمدنی کا دسواں حصہ ریاست کے اس خزانے میں جمع کرتا تھا۔

راجہ ونے دتہ کو اپنی پرجا کی شرافت نفس اور ایمان داری پر اس قدر اعتبار تھا کہ اس نے تمام سرکاری افسروں کو ملازمت سے علیحدہ کر دیا تھا لیکن غیر ملکی حملوں سے ریاست کی حفاظت اور مدافعت کے لئے فوج کو برقرار رکھا تھا اور اپنے بھائی کو فوج کی نگہداشت کا کام سپرد کرکے ایک گودام کی تالی اس کے حوالے کر دی تھی اور دوسرے گودام کے ذخیرے کو وہ خود روزانہ صبح کے وقت غریبوں اور ضرورت مندوں کے درمیان تقسیم کیا کرتا تھا۔ کشمیر کے باشندے آج تک بھی راجہ ونے دتہ کے نیک نام کو فراموش نہیں کر سکے۔ چناں چہ اب بھی جب کبھی کوئی ایسا مبارک واقعہ رونما ہوجاتا ہے جیسے ہنر دور یا سنبہ یگ ہی کے لئے مخصوص تعین کیا جاتا ہے تو لوگ کہتے ہیں کہ ونے دتہ کا عہد لوٹ آیا ہے۔

کشمیر کے راجاؤں میں سب سے زیادہ مشہور راجہ للیتادتہ گزرا ہے۔ للیتادتہ ۷۳۳ء سے ۷۶۹ء تک کشمیر کا حکمراں رہا تھا اور مکتا پیدا کے نام سے مشہور تھا۔ اس نے پورے ہندوستان کو فتح کرنے کی مہم شروع کی تھی اور شمالی ہند کے تمام راجاؤں کو شکست دے کر اپنی سلطنت کی حدود کو وسیع تر کر لیا تھا۔ اسی قدر نہیں بلکہ اس نے افغانستان کی راہ سے ترکی تک پہونچ کر اسے اور وسطی ایشیا کے کچھ حصہ کو بھی فتح کیا تھا اور بارہ سال کے بعد تبت کے راستہ سے اپنی راجدھانی میں واپس آیا تھا۔ یہ راجہ بہادر ہونے کے علاوہ مدبر بھی تھا۔ اس نے ملک گیری اور حکومت کے ضوابط اور آداب بھی مدون کئے تھے اور مارتنڈ یعنی سوریہ دیوتا کا مندر بھی اسی نے تعمیر کرایا تھا۔

وادیٔ کشمیر کی تاریخ صرف اس کے نامور راجاؤں ہی کے کارناموں کے باعث درخشاں نہیں بلکہ اسے درخشاں کئے جانے میں کشمیر کی رانیوں کا بھی قابل ذکر حصہ ہے حتیٰ کہ کشمیر کی خاتون

حکمران دِدّا رانی ہی کے مقابلہ میں سلطان محمود غزنوی ایسے زبردست فاتح کو بھی اس خطّۂ ارض کو فتح کرنے کی مہم میں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا تھا۔

ولادتِ مسیح سے کم و بیش ڈھائی سو سال پہلے کشمیر پر اس کے قدیم راجاؤں ہی کی حکومت قائم رہی تھی لیکن ۲۵۰ ق۔م میں اشوک اعظم نے اسے فتح کر کے اپنی سلطنت میں شامل کر لیا تھا اور اس طرح اس وادی میں پہلی مرتبہ بودھ مت کو پہنچنے کا موقع ملا تھا اور ہندوستان کے اسی نامور شہنشاہ نے موجودہ شہر سری نگر سے تقریباً تین میل کے فاصلے پر پنڈری تھن میں سری نگری کے نام سے ایک شہر بھی آباد کیا تھا۔ اس دور کے متعلق راج ترنگنی میں جو تفصیلات مذکور ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ — ہندو دھرم اور بودھ مت ایک دوسرے کے دوش بدوش موجود تھے اور مذہب کے معاملے میں کامل رواداری کو مدِنظر رکھا جاتا تھا — لیکن کشمیر میں بودھ مت اور بودھ راجاؤں کا اقتدار پانچ سو سال سے زیادہ مدت تک باقی نہیں رہ سکا۔ چنانچہ مشہور چینی سیاح ہیون سانگ کے بیان کے مطابق جس نے ساتویں صدی عیسوی کے آغاز میں کشمیر کی سیاحت کی تھی وہاں کے باشندوں کی اکثریت شیوجی کی پرستار تھی اور اس زمانہ میں بودھ خانقاہوں اور مندروں کے چند آثار ہی باقی رہ گئے تھے۔

بودھ مت کے زوال کے بعد کشمیر کی عنانِ حکومت پھر کشمیریوں کے ہاتھوں میں آگئی تھی اور اگرچہ چھٹی صدی عیسوی کے آغاز میں 'سفید ہنوں' کے سردار مہرگلا نے کشمیر پر قبضہ کر کے وہاں اپنی حکومت قائم کر لی تھی لیکن اس خاندان کا دورِ حکومت جلد ہی ختم ہو گیا تھا۔ مہرگلا بے حد سنگدل واقع ہوا تھا۔ چنانچہ کشمیر کے باشندے پیر پنچال کی ایک پہاڑی 'ہستی وانج' کے متعلق یہ روایت بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ مہرگلا نے اس پہاڑی پر سے ایک سو ہاتھیوں کو نیچے پھینک دئیے جانے کا حکم دیا تھا اور ان کی بے کسانہ چیخوں کو سن کر خوش ہوتا رہا تھا۔

سفید ہنوں کے بعد کشمیر پر کشمیر ہی کے جو ہندو راجا حکومت کرتے رہے ہیں ان میں للتا دتہ اور ینتادتہ کے علاوہ پرور سین (ثانی) کا نام بھی ہمیشہ یادگار رہے گا۔ اسی راجہ نے کشمیر میں

کشینوں کا پہلا پل بنوانے کے علاوہ ٹیٹنب اسی جگہ اپنی راجدھانی بھی تعمیر کرائی تھی جہاں آج سری نگر آباد ہے۔

کشمیر پر وہاں کے راجاؤں کی چار ہزار سالہ حکومت کے سلسلے میں جو تاریخی معلومات دستیاب ہوتی ہیں ان کی روشنی میں اس عہد کے عوام کی اقتصادی اور سماجی زندگی کے متعلق کوئی قطعی رائے تو قائم نہیں کی جاسکتی لیکن کلہن اور اس کے بعد کے مورخین کی تحریرات سے یہ نتیجہ ضرور اخذ کیا جاسکتا ہے کہ ان میں مذہبی رواداری موجود تھی اور اپنی ضرورتوں کے محدود ہونے کے باعث وہ نہایت سادہ زندگی بسر کرتے تھے۔ پھر چونکہ عہد قدیم کے حکمرانوں کے ذہن میں حکومت اور ریاست کا وہ تصور بھی نہیں تھا جس نے عہد وسطیٰ کے حکمرانوں کو عوام سے علیحدہ کر دیا تھا اس لئے اس دور کے راجا اور بادشاہ خود کو عوام کے ساتھ وابستہ سمجھتے تھے اور ان کی ضرورتیں بھی عوام کی ضرورتوں سے کچھ زیادہ اور مختلف نہیں تھیں۔ وہ خود بھی عوام کے ساتھ ملتے جلتے تھے اور لوگوں کو بھی ان تک پہونچنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی تھی۔ اس زمانہ کے متعلق ہیوان سانگ نے لکھا ہے کہ —— لوگ خوش حال اور امن پسند واقع ہوئے ہیں اور کشمیر کے مغرب اور جنوب کے علاقے شاہان کشمیر کی قلم رو میں شامل ہیں —— لیکن یہ بات ظاہر ہے کہ اس زمانہ میں کشمیر کے باشندے آج کی طرح صنعتوں اور دستکاریوں سے واقف نہیں تھے اور ان کی معاشی اور اقتصادی زندگی کا تمام تر انحصار کاشتکاری اور اس کی بدولت حاصل ہونے والی پیداوار ہی پر تھا۔ اس کے باوجود ثقافتی اور علمی ترقی کے میدان میں اس عہد کے کشمیریوں نے اپنے لئے ایک بلند اور امتیازی مقام پیدا کیا تھا۔

اس زمانہ میں کشمیریوں کی ثقافتی ترقی کا اندازہ اس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ علم و فن کی کوئی معلوم شاخ ایسی نہیں تھی جس کا مطالعہ کشمیر کے اہل علم نے نہ کیا ہو اور انھوں نے فلسفہ، مذہب علم ادویہ، سنگ تراشی، علم نجوم، انجینئرنگ نیز زندگی کے دوسرے شعبوں میں جو ترقیاں کی تھیں ان میں سے بعض پر آج بھی فخر و مباہات کا اظہار کیا جاسکتا ہے۔ اس زمانہ کے کشمیری ارباب علم و قلم

نے جو کتابیں لکھی تھیں آج وہ ناپید ہو چکی ہیں۔ لیکن ان میں جو کتابیں انقلاب روزگار کی دست برد سے محفوظ رہ سکی ہیں ان کا مطالعہ کشمیر کے ثقافتی ماضی کی درخشانی کی نشان دہی کرتا ہے۔ مثلاً مذہب میں اس دور کے کشمیری علماء نے ایک ایسے نئے فلسفے کا اضافہ کیا تھا جو وحدتِ وجود کا داعی اور ویدانتی فلسفے سے مختلف تھا۔ یہ فلسفہ کشمیری شیوائیت' یا 'تریکیا' کے نام سے موسوم اور غور و فکر کی گہرائیوں اور جدتِ خیال کا مظہر ہے اور حال ہی میں ریاست کے 'ریسرچ ڈیپارٹمنٹ' کی بدولت مغربی دنیا کی توجہ بھی اس فلسفے پر مبذول ہوئی ہے اور یہ وقت کے بہت سے ممتاز مفکروں اور علماء کے لئے دلچسپی کا موجب بنا ہوا ہے۔

کشمیری شیوائیت کے مدرسۂ خیال کا سنگِ بنیاد وسوگپتا نے آٹھویں صدی عیسوی میں رکھا تھا اور 'اسپاندا کاریکا' کے نام سے اس موضوع پر ایک اہم کتاب بھی قلمبند کی تھی جس کے بعد گیارھویں صدی کے اواخر تک متعدد اہلِ فکر و قلم اپنی محققانہ تحریرات سے اس موضوع کی ثروت مندی میں اضافہ کرتے رہے۔

اس عہد کے کشمیری شعر و ادب کے زاویۂ نظر سے بھی بے حد ترقی یافتہ تھے چنانچہ فنِ شعر پر دامن بھٹ نے 'کوی النکار' لدورنتر نے 'سرنگرا تلک' رواکا نے 'النکار سرواستو' اور مم ماتا نے 'کوی پرکاش' ایسی کتابیں لکھ کر اپنی صلاحیتوں کا ثبوت دیا تھا اور جہاں تک ادبی ترقی کا تعلق ہے اس کے ثبوت میں بھیم بھٹ کی کتاب 'راون ارجنیہ' دامودر گپت کی تصنیف 'کٹنی ماتا' رتنا کر کی 'ہرچرِت' بیتر کالی داس کی کتابوں پر ویدھ دیو کے حاشیوں اور قصص و حکایات میں سوم دیو کی 'کتھا سرت ساگر' کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ اور سوم دیو کی اس کتاب کے مختلف حصّوں کا بہت سی دوسری زبانوں میں ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔ اسی قدر نہیں بلکہ اس دور کے کشمیری ارباب علم نے زبان کے اصول اور قواعد کی ترتیب و تدوین میں بھی قابل ذکر حصّہ لیا تھا۔ چنانچہ بعض محققین کی رائے یہ ہے کہ ولادتِ مسیح سے پہلے مشہور قواعد داں پتانجلی کی ولادت بھی کشمیر ہی میں ہوئی تھی اور بعد میں بھی کشمیر

میں چندرا، کشتراسوامی، وامن، اور گیاتا جیسے ممتاز قواعد داں پیدا ہوتے رہے ہیں۔

عہدِ قدیم کے کشمیر میں طب اور جراحی کے علم اور فن نے بھی بہت زیادہ ترقی کی تھی چنانچہ اس سلسلہ میں تربیری اور چرک نے متعدد کتابیں بھی لکھی تھیں اور طب اور جراحی پر چرک کی لکھی ہوئی کتاب آج بھی اس علم و فن کی کتابوں میں ایک امتیازی حیثیت رکھتی ہے۔ علم نجوم کا مطالعہ کشمیری پنڈتوں کا ایک محبوب اور مخصوص مشغلہ رہا ہے۔ چنانچہ آج بھی ہندوستان میں علم نجوم کے سلسلے میں بھاسکراچاریہ، آریہ بھٹ اور رتن کنٹھ کی کتابوں کو سند کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔

کشمیری اربابِ علم و قلم کی پروازِ فکر مذکورہ علوم و فنون ہی تک محدود نہیں رہی تھی بلکہ انھوں نے جنسیات، مجمت اور سیاسیات ایسے عنوان پر بھی قلم اُٹھائے تھے اور راجہ واسدیو کی 'کام شاستر' کوکا پنڈت کی 'کوک شاستر' نیز سیاسیات میں رام چندر بھٹ اور آنند کی تحریرات ان مسائل پر ان کی مکمل دسترس اور قدرتِ تحریر کی شاہد ہیں اور اس عہد کے فنِ تعمیر اور سنگ تراشی کی ترقی کے ثبوت میں 'مارتنڈ' اوانتی پورہ، پٹن اور ونگٹ یا نارن ناگ کے ان آثارِ قدیمہ کو پیش کیا جا سکتا ہے جو صدیوں تک انقلابِ روزگار سے گذرتے رہنے کے باوجود آج بھی اپنے بنانے والوں کی بے پناہ قوتِ عمل، عظمت اور بلندیٔ فکر و نظر پر گواہی دے رہے ہیں۔

چودھویں صدی عیسوی کے آغاز تک پچھلے چار ہزار سال کی مدت میں، کشمیر میں جو انقلابات حکومت برپا ہوتے رہے تھے ان کی بدولت کشمیر کی تاریخ میں کوئی نیا عنصر داخل نہیں ہوا تھا اور اگرچہ اشوک اعظم اور اس کے جانشینوں کے دورِ حکومت میں وہاں بودھ مت کو پہونچنے کا موقع ضرور حاصل ہوا تھا لیکن اسے وہاں تک پہونچانے اور فروغ دینے والے بھی برِّ صغیر ہند کے رہنے والے اور زندگی کی بنیادی قدروں میں کشمیر کے باشندوں کے ساتھ متحد الخیال تھے۔ لیکن چودھویں صدی کے آغاز میں کشمیر کی تاریخ کا ایک نیا باب شروع ہوا اور کشمیر کی عنانِ حکومت چار ہزار سال کے بعد مسلمانوں کے ہاتھوں میں پہونچ گئی۔

کشمیر کے نامور حکمرانوں میں آخری حکمران ودہ رانی کا نام قابلِ ذکر ہے۔ یہ رانی ۹۵۰ء سے ۱۰۰۳ء تک حکمران رہی تھی اور اس کے دورِ حکومت میں سلطان محمود غزنوی نے کشمیر پر حملہ کیا تھا لیکن اسے ناکام ہو کر واپس چلے جانا پڑا تھا۔ ودہ رانی کے بعد کشمیر میں جو خاندان برسرِ حکومت آئے اول تو وہ اپنی جگہ کمزور تھے اور دوسرے کشمیر کے متوحد علاقوں کے باشندوں میں آزادی کا جذبہ بیدار ہوتا جا رہا تھا اور بعض بعض کی بغاوتوں نے مرکزی حکومت کو کمزور بنا دیا تھا۔ اس پُر آشوب دور میں صرف قوت و طاقت کی بنا پر کشمیر میں یکے بعد دیگرے بہت سے خاندان برسرِ حکومت آئے لیکن ان میں سے کوئی خاندان اور کسی خاندان کا کوئی حکمران بھی مرکزی حکومت کی قوت و طاقت کو بحال کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا اور سب سے آخر میں برسرِ حکومت آنے والے دامر خاندان کے متعلق تو یہ بات مشہور ہے کہ "وہ قتل و خونریزی، آتش زدگی، لوٹ مار اور جنگ و جدل کا ماہر تھا۔"

اس کم و بیش دو سو سالی کے پُر آشوب زمانے کے اواخر میں کشمیر کی عنانِ حکومت راجہ سہادیو کے ہاتھ میں آگئی تھی۔ اس کا دورِ حکومت ۱۲۹۵ء سے ۱۳۲۵ء تک قائم رہا تھا۔ اس کے زمانہ میں تبت کے ایک بودھ شہزادہ رینچن شاہ، دردستان کے حکمران لنکر چک اور سوات کے ایک درویش کے پوتے شاہ میر یا شاہ مرزا نے کشمیر میں آکر پناہ لی تھی اور اسی سرزمین کو اپنا وطن بنا لیا تھا اور آئندہ چل کر یہی لوگ کشمیر کے تاریخی واقعات کے دھارے کا رُخ بدل دینے کے موجب ثابت ہوئے تھے۔

کشمیر ابھی داخلی بدامنی اور اقتدار خواہوں کی باہمی کش مکش کے دور سے گذر ہی رہا تھا کہ اس کے اس انتشار سے فائدہ اُٹھا کر تاتاریوں یا ترکوں کے سردار ذوالقادر خاں نے اس پر حملہ کر دیا اور راجہ سہادیو مقابلہ کی تاب نہ لا کر اپنے وزیر رام چند اور اہلِ خاندان کے ساتھ فرار ہو کر کشتواڑ میں پناہ گزین ہو گیا لیکن کچھ روز کے بعد جب تاتاری حملہ آور چلے گئے تو رام چند نے واپس آکر اپنے راجہ ہونے کا اعلان کر دیا۔ مگر حصولِ تخت و تاج کی اس کش مکش میں رام چند بھی کامیاب نہیں ہو سکا اور رینچن شاہ نے اسے قتل کر کے نہ صرف اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا بلکہ رام چند کی

دختر کوتارانی سے شادی بھی کر لی۔ مگر ملک میں اس کی مخالفت جاری رہی اور اسی مخالفت کے ردِ عمل کے طور پر ایک روز اس نے یہ فیصلہ کر لیا کہ وہ نہ صرف اپنا مذہب ہی تبدیل کرے گا بلکہ دوسری صبح کو سب سے پہلے جو شخص اسے نظر آئے گا وہ اسی کا مذہب اختیار کرے گا۔ چنانچہ دوسری صبح کو اس کے سامنے سے جس شخص کا گذر ہوا وہ بلبل شاہ نامی ایک مسلمان درویش تھے۔ رینچن شاہ نے ان ہی کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا اور اپنا نام بدل کر صدرالدین رکھ لیا۔ مگر کم و بیش دو سال کے بعد ۱۳۲۷ء میں اس کا انتقال ہو گیا۔

راجہ سمہادیو کے ساتھ فرار ہو کر کشتواڑ چلے جانے والے لوگوں میں اس کا بھائی ادیان دیو بھی شامل تھا۔ صدرالدین کی موت کے بعد ادیان دیو نے واپس آکر اپنی حکومت قائم کر لی اور صدرالدین کی بیوہ کوتارانی سے شادی کر کے پندرہ سال تک کشمیر پر حکومت کرتا رہا اور اس کی موت کے بعد جب کوتارانی نے عنانِ حکومت اپنے ہاتھوں میں لی تو شاہ میر نے اسے مغلوب کر کے اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ یہی شاہ میر جس نے شمس الدین کا لقب اختیار کر لیا تھا سلاطینِ کشمیر کے اس سلسلے کا بانی ہے جس کے افراد آئندہ ڈھائی سو سال تک کشمیر پر حکومت کرتے رہے تھے۔

عہدِ مغلیہ کے مشہور مؤرخ فرشتہ نے سلاطینِ کشمیر کے جو حالات قلمبند کئے ہیں ان کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلے کے دو بادشاہ خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں۔ ان میں سے پہلا بادشاہ سکندر تھا۔ سکندر تاریخ میں 'بت شکن' کے لقب سے مشہور ہے اس کی مذہبی عدم رواداری سے متاثر ہو کر کشمیری پنڈتوں کے بہت سے خاندان ترکِ وطن کر کے پنجاب اور یوپی میں آباد ہو گئے تھے جس سے کشمیر کی صنعت اور حرفت کو بھی بے حد نقصان پہونچا تھا۔

سلاطینِ کشمیر کے سلسلے میں دوسرا قابلِ ذکر حکمران سلطان زین العابدین تھا۔ زین العابدین کے متعلق اس کے عہد کے مشہور وقائع نگار اور 'راج ترنگنی' کی تیسری جلد کے مؤلف سری ور نے لکھا ہے کہ — "میں اس مختصر سی تحریر میں اس کی بے شمار خوبیوں کا احاطہ کس طرح کر سکتا ہوں جو اس سے

میں اس کتاب میں اس کے محاسن کی اسی طرح تصویر کشی کرتا ہوں جس طرح ہمالیہ یا تینوں دنیا فل یا پھر آئینہ میں پڑتے ہوئے سورج کے عکس کو کسی تصویر میں دکھایا جاتا ہے۔ جس طرح تاجر ترازو کے دونوں پلڑوں کو متوازن رکھتے ہیں اسی طرح بادشاہ بھی ملکی نظم و نسق میں عدم توازن اور عدم مساوات کو جائز نہیں رکھتا اور جس طرح شیر رشیوں کی گپھاؤں کے قریب رہنے والے پُر امن چوپاؤں پر حملہ نہیں کرتا اسی طرح تورُسک (ترک) جو پہلے برہمنوں پر ظلم و ستم کرتے رہتے تھے اب انہیں نقصان نہیں پہونچاتے۔ اس کلجگ میں بادشاہ کا بابرکت طرزِ حکومت، ستیہ یگ کے شاہ کی کسی حکومت کے مقابلے میں کسی طرح بھی کم نہیں ہے۔

زین العابدین کے دورِ حکومت میں جو بتیس سال کے بعد ۱۴۷۰ء میں ختم ہوا تھا نہ صرف بہت سے تارک وطن برہمن ہی واپس آگئے تھے بلکہ جنوب سے بہت سے ہندو فضلاء بھی کشمیر چلے گئے تھے۔ اس نے فارسی زبان کی ترویج کے ساتھ ساتھ سنسکرت کی سرپرستی بھی کی تھی۔ اس نے ہندوؤں کے لئے ملازمتوں کے دروازے کھول دئے تھے۔ شاہی خزانے سے ہندوؤں کی عبادت گاہوں کی مرمت کرائی تھی جن میں شنکر اچاریہ کا مندر بھی شامل تھا اور اس طرح اس نے ہندوؤں کو ازسرِ نو کشمیر میں آباد کرنے کے لئے ہر ممکن طریقے پر ان کی ہمت افزائی کی تھی۔

سلطان زین العابدین نے کشمیر کی حسین وادی میں بہت سی نئی صنعتوں اور دستکاریوں کو بھی متعارف اور مقبول بنایا تھا۔ اس نے ایران، ترکستان اور ہندوستان سے ممتاز صنعت کاروں کو کشمیر بلا کر انہیں وہاں بسایا تھا۔ چنانچہ کاغذ سازی اور گلے ہوئے کاغذ سے مختلف چیزیں بنانے کی صنعت اور ریشم کے کیڑوں کی پرورش و پرداخت نیز شال بافی کی دستکاریاں اسی کے مبارک دور کی یادگار ہیں۔ اسی کے زمانے میں باغبانی کے فن کو بھی بے حد ترقی حاصل ہوئی تھی اور اس نے وادی میں بہت سے پھل دار درخت لگوائے تھے۔ اسی قدر نہیں بلکہ سلطان زین العابدین کو تعمیرات سے بھی بے حد دلچسپی تھی۔ چناں چہ اس نے تاجروں اور مسافروں کی سہولت اور

اور آرام کے لئے راستوں پر بہت سی کارواں سرائیں تعمیر کرائی تھیں اور بہت سی نہریں اور پُل بنوا کر آبپاشی اور آمد و رفت کے وسائل کو ترقی دی تھی اور اسی کے زمانہ میں جھیل ڈل کے پانی کے نکاس کے اسی راستہ کو بند کر کے جو اسے جہلم میں لے جاتا تھا اس جھیل کے پانی کو نہر مار میں پہنچایا گیا تھا اور اس نہر پر برسات کے لئے پختہ پل تعمیر کرائے گئے تھے۔ سلطان نے وادی میں تانبے کی کانیں بھی دریافت کی تھیں اور وہ خود ان ہی کی آمدنی پر اپنی زندگی بسر کرتا تھا۔

سلطان زین العابدین کا دورِ حکومت دراصل کشمیر کے معیاری ادب کے فروغ اور اس کی رُوحانی، اخلاقی اور مذہبی قدروں کی نشاۃ ثانیہ کا دور تھا اور اسلام نے ہندو مذہب اور فلسفہ پر اپنے جو نقوش قائم کئے تھے زین العابدین کے دورِ حکومت میں وہ اپنی پوری تابانی کے ساتھ اُبھرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ کشمیر میں مسلمانوں کی حکومت کے قیام سے پہلے ہی مسلمان وہاں پہنچ گئے تھے۔ چنانچہ رینچن شاہ کو بھی ایک مسلمان درویش ہی نے اسلام کے دائرہ میں داخل کیا تھا۔ سلاطین کشمیر کے بانی شمس الدین کے سب سے چھوٹے پوتے سلطان قطب الدین کے عہد حکومت میں تیمور لنگ کے دستِ تعدی سے بچنے کے لئے وسط ایشیا کے ممتاز درویش سید علی ہمدانی کشمیر آئے تھے اور اگرچہ اس وادی میں ان کا قیام بہت ہی مختصر رہا تھا لیکن وہاں ان کے بہت سے معتقد پیدا ہو گئے تھے اور ان کے بعد بھی سدھ، بے، شیو یوگی، لل دید، اور نند رشی ایسے صوفی منش بزرگ کشمیر کی پُر سکون وادی میں اپنے خیالات کی اشاعت کرتے رہے تھے۔ چنانچہ زین العابدین کے زمانہ میں جو مذہبی تنگ نظری سے پاک تھا ان خیالات کو بے حد فروغ حاصل ہوا اور اسلام اور ہندو دھرم کے فلسفوں کے اختلاط سے بھگتی یعنی محبت کے نام سے خدا پرستی کی ایک نئی تحریک کا ظہور ہوا۔ ان درویشوں اور صوفیوں کے اقوال اور خدا کی عبادت، بنی نوع انسان کی خدمت اور مخلوق کے ساتھ محبت کی تعلیم کے حامل گیت آج بھی کشمیر کی وسعتوں میں مقبول اور کشمیر کے باشندوں کی زندگی پر اثر انداز ہیں۔ کشمیریوں

کی موجودہ سماجی اور سیاسی زندگی بھی ان ہی سے متاثر ہے اور کشمیر کے اس مخصوص رجحان کے سلسلے میں سلطان زین العابدین کا نام ہمیشہ یادگار رہے گا۔ اسی کے عہدِ حکومت میں ملا احمد کاشمیری نے مہابھارت کو فارسی کا جامہ پہنایا تھا اور للیتا دتہ کی طرح اس نے بھی تبت اور پنجاب کو فتح کر کے اپنی قلمرو کو وسعت دی تھی۔

زین العابدین کی وفات کے بعد سلاطینِ کشمیر کا سلسلہ اس کے بانی سلطان شمس الدین کے خاندان ہی تک محدود نہیں رہا تھا بلکہ دردستان کے چکوں نے جو مذہباً شیعہ تھے اس خاندان کے آخری کمزور حکمرانوں کو زیر کر کے کشمیر میں اپنی حکومت قائم کر لی تھی لیکن چکوں کی حکومت سے پہلے بابر کے ایک رشتہ دار اور مشہور تاریخ رشیدی کے مصنف مرزا محمد حیدر دوغلات نے پہلے تو سنہ ۱۵۳۳ء میں لداخ کی طرف سے کشمیر پر یورش کی تھی اور دوسری مرتبہ سنہ ۱۵۴۰ء میں جنوب کی سمت سے حملہ آور ہو کر کشمیر پر قبضہ کر لیا تھا اور سنہ ۱۵۵۱ء میں اپنی موت کے وقت تک وہاں ہمایوں کے نام پر حکومت کرتا رہا تھا اور سنہ ۱۵۵۴ء سے وہاں چک شیعوں کی حکومت کا جو سلسلہ شروع ہوا تھا وہ سنہ ۱۵۸۶ء میں شہنشاہ اکبر کے ہاتھوں آخری چک سلطان یعقوب خاں کی شکست پر ختم ہو گیا تھا اور اس وقت سے سنہ ۱۷۵۲ء تک کشمیر ہندوستان کے ایک صوبے کی حیثیت سے مغلیہ سلطنت میں شامل رہا تھا۔

مغلوں کا دورِ حکومت ہندوستان کے دوسرے حصوں کی طرح کشمیر کے لیے بھی ترقی آزادی اور استقلال نظم و نسق کا دور تھا۔ شہنشاہ اکبر کے وزیر مال ٹوڈرمل نے وادی کے وسائلِ آمدنی کا جائزہ لے کر محاصل کی تعیین اور ان کی وصولیابی کا ایک مستقل نظام قائم کیا تھا۔ شہنشاہ جہانگیر کو اس وادی کے ساتھ بے حد شغف تھا۔ اس نے وہاں بہت سے باغات لگوائے تھے۔ موسمِ گرما میں قیام کے لیے تفریح گاہیں تعمیر کرائی تھیں اور جھیل ڈل کے کناروں پر چھوٹے بڑے ۷۷ باغات لگوائے تھے ان میں روزانہ گلاب اور بید مشک کے ایک لاکھ پھول کھلتے تھے اور ان میں سے بعض باغات آج بھی اپنی دلکشی کی بدولت جہانگیر کی یاد کو تازہ کرتے ہیں۔ سری نگر کی مشہور پتھر مسجد

نورجہاں نے تعمیر کرائی تھی حتیٰ کہ جہانگیر کا انتقال بھی کشمیر سے لاہور واپس آتے ہوئے کشمیر کی سرحد پر ہوا تھا۔

جہانگیر کے جانشین شاہ جہان کے عہدِ حکومت میں بھی کشمیر کی ترقی اور تعمیر کی رفتار قائم رہی اور وہاں کی خوبصورت عمارات اور حسین باغات میں اضافہ ہوا۔ حتیٰ کہ کشمیر کے مغل گورنر یا صوبیدار علی مردان نے ہندوستان سے کشمیر جانے والے اس راستہ پر جو پیر پنجال کے پہاڑوں سے گذرتا ہے مسافروں کی سہولت اور آرام رسانی کے لئے بہت سی کارواں سرائیں بھی تعمیر کرائیں اور جہاں تک اورنگ زیب کے دورِ حکومت کا تعلق ہے ڈاکٹر فرانسس برنیر نے اس دور کے کشمیر کی ترقی کی تصدیق کی ہے لیکن اورنگ زیب کے بعد جب دہلی کی مرکزی حکومت میں ضعف اور انحطاط رونما ہونے لگا تو اٹھارویں صدی عیسوی کے تقریباً وسط میں ہندوستان کا یہ دورافتادہ صوبہ بھی عملاً خود مختار ہوگیا اور اس صورت حال سے فائدہ اٹھا کر ۱۷۵۳ء میں احمد شاہ درّانی کی قیادت میں افغانوں نے اس پر حملہ کرکے وہاں افغانوں کی حکومت قائم کرلی۔

کشمیر پر افغانوں کی حکومت کا زمانہ کم و بیش ستر سال ہے۔ اس زمانہ میں ہزاروں سال کے بعد پہلی مرتبہ ہندوستان سے اس سرزمین کا تعلق منقطع ہوا تھا۔ لیکن یہ غیر ملکی حکومت ہندوستان کے ساتھ کشمیر کے باشندوں کے دلی تعلق کو منقطع کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکی تھی۔ یہ دور مذہب و ملت کے امتیاز کے بغیر کشمیر کے تمام باشندوں کے لئے سخت ترین ابتلا اور آزمائش کا دور تھا۔ کشمیر کے غیر ملکی حکمرانوں کو کشمیر کی فلاح و بہبود سے کوئی واسطہ نہیں تھا اور اس دور میں یہ حسین وادی لوٹ مار اور غارت گری کا میدان بنی رہی تھی۔

یہ دور ہندوستان کی تاریخ کا وہ دور تھا جب دہلی کی مغل حکومت ضعف اور زوال کی آخری منزلیں طے کر رہی تھی۔ ملک پر انگریزوں کی گرفت مضبوط تر ہوتی جارہی تھی اور پنجاب میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کی حکومت قائم ہوچکی تھی۔ اس طرح کشمیر کے قریب تر ایسی ہندوستانی حکومت جو کشمیر کو

کو غیر ملکی حکومت سے نجات دلا سکتی تھی مہاراجہ رنجیت سنگھ ہی کی حکومت تھی۔ چنانچہ کشمیر کے باشندوں نے جن کی اکثریت مسلمانوں پر مشتمل تھی، افغانستان کی مسلم حکومت سے اپنا رشتہ توڑ کر اسے از سرِ نو ہندوستان کے ساتھ جوڑنے کی نیت سے پنڈت بیربل دھر کی معرفت مہاراجہ رنجیت سنگھ سے امداد کی درخواست کی۔ اس طرح سکھ فوج نے پہلی بار پیر پنجال کے پہاڑوں سے گذر کر ۱۸۱۴ء میں کشمیر پر یورش کی لیکن یہ مہم کامیاب نہیں ہو سکی مگر ۱۸۱۹ء میں جب مہاراجہ کے ممتاز ترین جنرل مسری دیوان چند اور جموں کے ڈوگرہ سردار گلاب سنگھ نے جو مہاراجہ کے درباریوں میں شامل تھا دوبارہ کشمیر پر حملہ کیا تو آخری افغان صوبیدار کو شکست ہو گئی اور کشمیر سکھوں کی حکومت میں آ گیا اور اس طرح کم و بیش سات دہائیوں کے بعد کشمیر پھر ہندوستان کا ایک جزو بن گیا۔ لیکن اوّل تو ابھی کشمیر پر سکھوں کی حکومت کو بجائے خود استقلال حاصل نہیں ہو سکا تھا اور دوسرے تقریباً دو دہائیوں کے بعد ہی سکھوں اور انگریزوں کی جنگ کے نتیجہ میں پنجاب سے سکھوں کا اقتدار بھی ختم ہو گیا تھا اور اسی آخری واقعہ کے نتیجہ میں کشمیر کو ایک نئی حکومت کے ماتحت چلا جانا پڑا تھا، لیکن کشمیر کی تاریخ کے اسی مرحلہ سے ان واقعات کا سلسلہ شروع ہوتا ہے جس کے ساتھ اس کے عہدِ حاضر کی تاریخ وابستہ ہے اس لئے انھیں جداگانہ اور کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

دوسرا باب

سکھ اور ڈوگرا حکومتیں

کشمیر پر سکھوں کا تسلط ۱۸۱۹ء میں قائم ہوا تھا اور ۱۸۴۶ء میں ختم ہو گیا تھا۔ اس لئے جہاں تک سکھ حکومت کی مدت کا تعلق ہے اسے کشمیر کی تاریخ میں کوئی خصوصی اہمیت نہیں دی جا سکتی لیکن یہ حکومت اس لحاظ سے ضرور قابلِ ذکر ہے کہ اول تو اس کی بدولت کشمیر کو افغانوں کی غیر ملکی حکومت سے نجات حاصل ہوئی تھی اور اسے از سرِ نو ہندوستان کے ساتھ وابستہ ہونے کا موقع ملا تھا اور دوسرے اسی حکومت کے خاتمہ پر وہاں ڈوگروں کی وہ حکومت قائم ہوئی تھی جس کے دور میں وہاں کے عوام میں وہ سیاسی اور سماجی شعور پیدا ہوا تھا جو انجام کار اس صدی میں کشمیر کی تمام تر سیاسی تحریکات اور ہندوستان کے ساتھ اس کے قطعی الحاق کی بنیاد ثابت ہوا ہے۔ اس طرح کشمیر میں سکھوں کے دورِ حکومت کو بجا طور پر عبوری دور کہا جا سکتا ہے اور یہی وہ دور ہے جو ایک طرف تو کشمیر کے ماضی کو اس کے حال سے جدا کرتا ہے اور دوسری طرف اسی دور کے توسط سے ماضی اور حال کا تعلق قائم ہوتا ہے۔

وادیٔ کشمیر جنوبی سمت میں جن برف پوش پہاڑوں سے گھری ہوئی ہے ان کے دامن سے شروع ہو کر پنجاب کے میدانی علاقہ سے مل جانے والا کوہستانی علاقہ ڈوگر کہلاتا ہے اور اسی علاقے کے باشندوں کو ڈوگرہ کہا جاتا ہے۔ ڈوگرے ہندو بھی ہوتے ہیں اور مسلمان بھی۔ یہ لوگ ڈوگری

زبان بولتے ہیں اور ڈوگری زبان سنسکرت، پنجابی اور فارسی زبانوں کے الفاظ کا مرکب ہے۔

اٹھارھویں صدی عیسوی کے آغاز میں ایک طرف تو ہندوستان کی مغلیہ حکومت کا شیرازہ منتشر ہونا شروع ہو گیا تھا جس کی وجہ سے اس صدی کی چند دہائیوں کے بعد ہندوستان کی مغل حکومت کے ساتھ کشمیر کا تعلق محض رسمی رہ گیا تھا اور مرکزی حکومت کی اسی کمزوری نیز کشمیر کے ساتھ اس کے اس رسمی تعلق یا بالفاظ دیگر خود کشمیر کی حکومت کی کمزوری سے فائدہ اُٹھا کر اسی صدی کے وسط میں احمد شاہ درانی نے اس وادی پر قبضہ کر لیا تھا اور دوسری طرف وادی کے باہر جنوبی سمت کے پہاڑی علاقہ میں ڈوگروں کی ایک نئی ریاست کی داغ بیل پڑ رہی تھی اور ایک ڈوگرا سردار راجہ رنجیت دیو اس نئی ریاست کو مستحکم بنا رہا تھا۔ لیکن ۱۷۸۱ء میں اس کے انتقال کے بعد اس ریاست کی علاقائی توسیع رُک گئی تھی اور آہستہ آہستہ یہ سکھوں کی باجگزار بن گئی تھی حتیٰ کہ ۱۸۱۲ء میں راجہ رنجیت دیو کے خاندان کے ایک فرد گلاب سنگھ نے مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دربار میں ملازمت بھی اختیار کر لی تھی۔ گلاب سنگھ حکومت اور اقتدار کے حصول کا خواہش مند ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بہادر سپاہی بھی تھا۔ چنانچہ اس نے اپنی قابل ذکر فوجی خدمات کی بدولت بہت جلد مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دربار میں اپنے لئے ایک ممتاز جگہ حاصل کر لی اور جب ۱۸۲۰ء میں اس نے راجوری کے راجہ کو جو سکھوں سے برسرِ جنگ تھا گرفتار کر لیا تو مہاراجہ نے خوش ہو کر اسے جموں کا راجہ بنا دیا اور جب ۱۸۳۹ء میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کا انتقال ہوا تو سکھ فوج میں سب سے زیادہ با اثر شخصیت راجہ گلاب سنگھ ہی کی تھی۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ سے راجہ کا خطاب پانے کے بعد ہی گلاب سنگھ نے ریاست جموں کی تنظیم اور توسیع شروع کر دی تھی اور اپنی انتظامی قابلیت کی بدولت چند ہی سال کی مدت میں اپنی ریاست کو انتظامی اور مالی اعتبار سے مستحکم بنا لیا تھا اور دس سال کے عرصہ میں وادیٔ کشمیر اور جموں نیز جموں اور پنجاب کے درمیان واقع تمام چھوٹی چھوٹی ریاستوں کو فتح کر کے انھیں ریاست جموں

میں شامل کرلیا تھا۔ حتیٰ کہ اس کے سپہ سالار زورآور سنگھ نے ۱۸۴۱ء میں وسطی تبت پر بھی فوج کشی کی تھی لیکن یہی مہم سردی کی شدت کی بدولت اس کی فوج اور خود اس کی موت کا باعث ہوئی تھی مگر اس نے لداخ، مغربی تبت اور بلتستان کو فتح کرکے ریاست جموں کے ساتھ ملحق کرلیا تھا اور اس طرح حسن اتفاق سے یا پھر راجہ گلاب سنگھ کی بیدار مغزی کی بدولت ۱۸۴۲ء تک وادیٔ کشمیر ڈوگرہ ریاست کے درمیان محصور ہوگئی تھی۔

انیسویں صدی عیسوی کے وسط میں دہلی کی مغل حکومت زوال کی آخری منزل میں پہونچ چکی تھی اور ہندوستان پر عملاً انگریزوں کا تسلط قائم ہوچکا تھا۔ ۱۸۴۵ء کے موسم سرما میں سکھوں اور انگریزوں کے درمیان جنگ چھڑ گئی۔ اس صورت حال کے پیش نظر مہاراجہ رنجیت سنگھ کے کمزور جانشینوں نے ۱۸۴۶ء میں راجہ گلاب سنگھ کو وزیر اعظم مقرر کرکے اسے انگریزوں کے مقابلے پر سکھ افواج کی قیادت کرنے کے لئے لاہور طلب کیا لیکن گلاب سنگھ حالات کی رفتار کے پیش نظر اس نتیجے پر پہونچ چکا تھا کہ آیندہ ہندوستان پر انگریز ہی حکومت کریں گے اس لئے وہ اس تصادم میں غیر جانبدار رہنا چاہتا تھا۔ چنانچہ وہ اس کشمکش میں شریک نہیں ہوا حتیٰ کہ ۱۸۴۶ء میں سبراؤں کی مشہور لڑائی میں سکھوں کو شکست ہوئی اور انگریز فوجوں نے لاہور پر قبضہ کرلیا۔

سبراؤں کی لڑائی میں سکھوں کی شکست کے بعد معاہدۂ لاہور کے نام سے انگریزوں اور سکھوں کے درمیان ۹۔ مارچ ۱۸۴۶ء کو جو معاہدہ ہوا تھا اس کی رُو سے لاہور کی سکھ حکومت نے تاوانِ جنگ کے طور پر ایک کروڑ روپے انگریزوں کو دینا قبول کیا تھا اور اس رقم کے بالعوض دریائے بیاس اور دریائے سندھ کے درمیان کوہستانی علاقہ ان کے حوالہ کیا تھا اور اس معاہدہ کی ایک دفعہ کے مطابق یہ بات بھی طے ہوئی تھی کہ برطانیہ، راجہ گلاب سنگھ کے ساتھ ایک جداگانہ معاہدہ کی رُو سے جو پہاڑی علاقہ دے گا ان میں اسے آزاد اور خود مختار حکمران کی حیثیت حاصل رہے گی۔ چنانچہ معاہدۂ لاہور کی اسی دفعہ کی بنیاد پر ۱۶ مارچ ۱۸۴۶ء کو حکومت برطانیہ اور راجہ گلاب سنگھ

کے درمیان وہ مشہور معاہدہ ہوا جو معاہدۂ امرت سر کے نام سے موسوم ہے۔ اس معاہدے کی رُو سے برطانوی حکومت نے ۷۵ لاکھ نانک شاہی روپے یعنی ۱۵ لاکھ پونڈ کی رقم لے کر وادیٔ کشمیر اور گلگت کو مہاراجہ گلاب سنگھ کے حوالے کر دیا اور اس طرح انیسویں صدی عیسوی کے وسط میں جموّں اور کشمیر کی وہ ریاست معرضِ وجود میں آئی جو جموّں، کشمیر، گلگت، لداخ اور بلتستان پر مشتمل تھی اور جس کے ساتھ گلاب سنگھ کے جانشین مہاراجہ رنبیر سنگھ نے یاسن اور وادیٔ دیل کو بھی ملحق کر دیا تھا۔ لیکن مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ڈوگرہ حکومت کی ایک سو سالہ تاریخ کے مطالعہ سے پہلے اس ریاست کے باشندوں اور ان کے حالات پر بھی ایک سرسری نظر ڈال لی جائے۔

اس باب کے آغاز میں بتایا جا چکا ہے کہ وادیٔ کشمیر کے جنوب میں جو پہاڑ واقع ہیں۔ ان کے جنوب سے شروع ہو کر پنجاب تک پھیلے ہوئے کوہستانی علاقہ کو ڈوگرا اور اس کے باشندوں کو ڈوگرہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ یہ لوگ آریہ نسل سے تعلق رکھتے ہیں، جفاکش ہوتے ہیں اور بہت سی ذاتوں اور برادریوں میں منقسم ہیں۔ ڈوگروں میں ہندو اور مسلمان دونوں ہی شامل ہیں لیکن ان سب کی مشترکہ خصوصیت محنت اور جفاکشی ہے۔ ان کی قومی غذا' چاول، گندم اور دالیں ہے ان کے لباس میں کوئی قابلِ ذکر فرق نہیں ہوتا۔ یہ لوگ تمام تہوار اور تقریبات مل جل کر مناتے ہیں اور اس سے ان کی غیر معمولی رواداری اور باہمی خیر سگالی کے گہرے جذبے کا پتہ چلتا ہے۔

جموّں کے برہمن عموماً کاشتکار ہوتے ہیں اور مذہبی رسوم کی ادائیگی کے فرائض برہمنوں کے چند مخصوص خاندان انجام دیتے ہیں۔ ان میں سے بیشتر لوگ راجپوت زمینداروں کی اراضی کو بٹہ پرے کر کاشت کیا کرتے تھے اور نظام کاشتکاری کے ابتری کے زمانے میں انھیں بہت زیادہ مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ لیکن موجودہ حکومت نے اراضی سے متعلق جو اصلاحات نافذ کی ہیں ان کی بدولت انھیں ہی سب سے زیادہ فائدہ بھی حاصل ہوا ہے۔ ڈوگرہ راجپوت بیحد سادہ مزاج نیز برادری اور خاندان کے رسم و رواج کے سختی کے ساتھ پابند ہوتے ہیں اور

ان میں چھبلی اور سدن برادریوں کے افراد مسلمان ہوتے ہیں اور اپنی بہادری کی بدولت عموماً فوجی ملازمت کرتے ہیں۔ لیکن راجپوتوں ہی کا ایک طبقہ کاشتکاری بھی کرتا ہے۔

ہندوستان کے دوسرے حصوں کی طرح جموں کی تجارت اور کاروبار بھی وہاں کے کھتریوں اور مہاجنوں کے ہاتھوں میں ہے۔ یہ لوگ بہت زیادہ جفاکش تو نہیں ہوتے لیکن ذہین ضرور ہوتے ہیں اور جموں کے دوسرے باشندوں کے مقابلے میں یہ لوگ زیادہ تعلیم یافتہ بھی ہیں۔ ہندوستان کے دوسرے حصوں کی طرح وہاں ہریجنوں کی بھی ایک معقول تعداد آباد ہے جنھیں میگھ، چمار یا ڈوم کہتے ہیں۔ ان کے متعلق بہت سی ایسی روایات مشہور ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے آباواجداد راجپوت یا برہمن تھے لیکن یا تو بعض حالات سے مجبور ہو کر انھوں نے دستکاری کو اپنا پیشہ بنا لیا تھا یا کسی عذر کی بنا پر انھیں برادری سے خارج کر دیا گیا تھا اس لئے انھوں نے میگھ کے نام سے اپنی ایک الگ ذات بنالی تھی۔ یہ لوگ صدیوں تک اپنے بہت سے سماجی اور مذہبی حقوق سے محروم رہے ہیں۔ لیکن اب تعلیم کی بدولت ان کی سماجی حیثیت بلند ہوتی جا رہی ہے۔ ان میں سے بیشتر لوگوں کا پیشہ زراعت ہے لیکن کچھ لوگ جوتے بنانے اور غلاظت اُٹھانے کے کام بھی کرتے ہیں۔ جموں کے ان تمام باشندوں کی زبان ڈوگری ہے۔

صوبہ جموں کے بیرونی اضلاع نیز وادیٔ کشمیر کے سرحدی علاقے کوہستانی ہیں اس لئے وہاں کے بسنے والے پہاڑی کہلاتے ہیں۔ یہ لوگ بہت زیادہ قوی اور محنتی ہوتے ہیں اور چٹیل پہاڑی ڈھلوانوں میں کاشت کر کے گذر اوقات کرتے ہیں اور چونکہ اس علاقہ کے طبعی حالات کی بدولت آمد و رفت اور خبر رسانی کے ذرائع بہت ہی محدود ہیں اور وہاں کے باشندوں کے لئے ایک بستی سے دوسری بستی تک پہونچنا بھی مشکل ثابت ہوتا ہے اس لئے وہ اقتصادی طور پر بے حد غریب اور سماجی طور پر بے حد پس ماندہ ہیں اور اس علاقے میں جو زبان بولی جاتی ہے وہ پہاڑی کہلاتی ہے لیکن درحقیقت وہ ہندی، پنجابی، ڈوگری اور سنسکرت کا مرکب ہے۔ اس علاقے میں کشمیری آباد کار بھی

آکر آباد ہو گئے ہیں ۔ انھوں نے بھی اسی علاقے کے باشندوں کا لباس اختیار کر لیا ہے اور وہ ایک ایسی زبان بولتے ہیں جو پہاڑی اور کشمیری زبانوں کے اختلاط سے بنی ہے ۔

گوجر اور گادی بھی پہاڑی قبائل ہی میں شامل ہیں ۔ یہ لوگ مویشی پالتے اور نیم خانہ بدوشی کی زندگی گذارتے ہیں ۔ گوجر مذہباً مسلمان، خوش معاملہ اور خوبصورت ہوتے ہیں اور گرمی کے موسم میں جموں سے کشمیر کے پہاڑوں میں جاکر رہنے لگتے ہیں ۔ خیال کیا جاتا ہے کہ ان کے آباؤ اجداد راجستھان سے آکر جموں میں آباد ہو گئے تھے ۔ ان کی زبان گوجری کہلاتی ہے اور تحقیقات سے ثابت ہو چکا ہے کہ راجستھانی زبان ہی کی ایک شکل ہے ۔ یہ لوگ اگرچہ جموں اور کشمیر کے ہر حصہ میں پائے جاتے ہیں لیکن ان کی بیشتر آبادی پونچھ، راجوری اور مظفر آباد کے اضلاع میں ہے ۔

وادیٔ کشمیر کے اصل باشندے جسمانی ساخت اور خدوخال کے لحاظ سے ممتاز حیثیت رکھتے ہیں ۔ یہ لوگ وجیہہ اور خوش رنگ ہوتے ہیں ۔ تفریح اور خوش وقتی ان کے خمیر میں داخل ہے اور جیسا کہ کشمیر کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے ان کی ذہانت اور طباعی سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا ۔ ان کی اصل نسل کے سلسلہ میں متعدد روایات مشہور ہیں جن میں سے ایک روایت یہ بھی ہے کہ بنی اسرائیل کا جو قبیلہ لاپتہ ہو گیا تھا اسی قبیلہ کے افراد کشمیریوں کے آباؤ اجداد تھے ۔ لیکن ان کی جسمانی ساخت اور زبان کے پیشِ نظر اس امر پر اتفاق رائے کیا جا چکا ہے کہ وہ اسی نسل سے تعلق رکھتے ہیں جو ہندوستان میں ہند آریائی، قسم کی زبانیں لائے تھے ۔ لیکن یہ بات ابھی تک اختلاف کا موجب بنی ہوئی ہے کہ یہ لوگ کشمیر میں کب اور کس راستہ سے پہنچے تھے ۔ بہرحال اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وہ اب تک اپنی ثقافتی خصوصیات کو قائم رکھتے چلے آئے ہیں اور انھوں نے ماضی میں جس تہذیب کو جنم دیا تھا اگر انھیں عہدِ قدیم میں اس وادی سے باہر ربط اور تعلق قائم کرنے کی سہولتیں حاصل ہوتیں تو وہ تہذیب دنیا کی تاریخ پر زیادہ گہرے اور درخشندہ نقوش ثبت کر سکتی تھی ۔

کشمیر کے باشندوں میں وہاں کے برہمنوں کو جنھیں کشمیری پنڈت کہا جاتا ہے ایک ممتاز

طبقہ کی حیثیت حاصل ہے اور انھیں وادی میں آ کر آباد ہونے والے آریوں کی نجیب الطرفین اولاد یقین کیا جاتا ہے۔ چودھویں صدی عیسوی کے آغاز میں بعض سلاطینِ کشمیر کی دست درازیوں سے تنگ آ کر کشمیری پنڈتوں کے بعض خاندان ترکِ وطن کرنے پر مجبور ہو گئے تھے لیکن جب سلطان زین العابدین کے دورِ حکومت میں ان تارکینِ وطن میں سے بہت سے لوگ واپس چلے آئے تو مقامی برہمنوں کے مقابلہ میں جو مال ماسی کہلاتے تھے یہ واپس آنے والے لوگ بھان ماسی کہلانے لگے لیکن ان کے درمیان شادی بیاہ پر کوئی پابندی نہیں۔ کشمیری پنڈت عموماً صاحبِ علم ہوتے ہیں اور سرکاری ملازمتوں پر فائز رہے ہیں۔

مسلمانوں کے عہدِ حکومت میں جن بہت سے کشمیری پنڈتوں نے سنسکرت کے مطالعہ سے دست کش ہو کر فارسی پڑھنا شروع کر دیا تھا اور سرکاری ملازمت ہی کو اپنا پیشہ بنا لیا تھا وہ کارکن کہلانے لگے تھے۔ ان میں سے بعض نے مذہبی رسوم اور فرائض کی ادائیگی کا کام اپنے بڑے نواسوں کو سپرد کر دیا تھا اور ان کے یہ نواسے 'بچی بھٹ' کہلاتے تھے لیکن آہستہ آہستہ کارکن اور بچی بھٹ دو جداگانہ اور مستقل برادریوں میں منقسم ہو گئے اور ان کے درمیان شادی بیاہ کا رشتہ بھی باقی نہیں رہا۔ کشمیری پنڈتوں میں سب سے زیادہ تعلیم یافتہ اور ترقی پسند سرسوت پنڈت ہیں اور ان کا مخصوص پیشہ سرکاری ملازمت ہے۔

سکھ ریاست جموں اور کشمیر میں ایک اقلیتی فرقہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ۱۹۴۷ء کے واقعات رونما ہونے سے پہلے ان کی بیشتر آبادی ضلع مظفر آباد میں تھی لیکن اب وہ ریاست کے تقریباً ہر حصہ میں آباد ہو گئے ہیں۔ یہ لوگ محنتی ہیں اور عموماً کاشتکاری کرتے ہیں۔ لیکن بہت سے سکھ دستکار بھی ہیں اور اب وہ فوج اور پولیس میں بھی بھرتی ہونے لگے ہیں۔

وادیٔ کشمیر میں مسلمانوں کو اکثریت حاصل ہے اور ان میں سنّی مسلمان بہت زیادہ ہیں اور چونکہ کشمیر کے موجودہ مسلمان، ہندوؤں ہی میں سے مسلمان ہوئے تھے اس لئے ان کے ناموں کے

ساتھ ڈار اور بھٹ وغیرہ ایسی ان کی قدیم نسبتیں قائم چلی آتی ہیں۔ مسلمانوں میں شیخ، سید اور پیرزادے قابلِ عزت سمجھے جاتے ہیں۔ مسلمانوں میں جو لوگ مذہبی رسوم اور فرائض کی انجام دہی پر مامور ہیں انھیں ملّا کہا جاتا ہے اور ان کی ایک مستقل برادری بن گئی ہے۔ یہ لوگ عموماً نذر و نیاز اور خیرات پر زندگی بسر کرتے ہیں لیکن اب ان میں سے بعض لوگوں نے زراعت بھی شروع کر دی ہے۔

کشمیر کے سنّی مسلمان وادی کے ہر حصّے میں پھیلے ہوئے ہیں اور شیعوں کی آبادی بعض تحصیلوں اور دیہات میں محدود ہے۔ 'پیپر ماشی' یعنی کاغذ کو گلا کر اس سے مختلف چیزیں بنانے، نیز شال بافی کی صنعتوں میں انھیں کافی دخل حاصل ہے۔ وادی میں پٹھانوں اور مغلوں کی چند بستیاں بھی موجود ہیں جو ان کے دورِ حکومت کی یاد دلاتی ہیں۔ لیکن اب یہ لوگ بھی مقامی باشندوں میں مدغم ہو کر رہ گئے ہیں۔ وادیٔ جہلم کے اس حصہ میں جو بارہ مولا کے مغرب میں واقع ہے کھاکھا اور بومبا نامی دو ایسے قبیلے آباد ہیں جو مہاراجہ گلاب سنگھ کے دورِ حکومت سے پہلے وادی میں آ کر قتل و غارت گری کرتے رہتے تھے۔ ان قبائل کے افراد اب تجارت اور زراعت کرتے ہیں لیکن آج بھی کشمیری عورتیں اپنے روتے ہوئے بچوں کو خاموش کرنے کے لئے انھیں کھاکھاؤں کے آنے کا ڈرا وا دیتی ہیں۔ وادیٔ کشمیر ہی میں رہنے والے دو اور قبیلے ڈوم اور گلوان کہلاتے ہیں کسی زمانہ میں ان قبائل کے لوگوں کو دوسروں سے کم تر سمجھا جاتا تھا لیکن اب ان کی اقتصادی حالت کے بہتر ہو جانے کے باعث ان کا سماجی درجہ بھی بلند ہو گیا ہے۔

کشمیر میں چوپانوں یا چرواہوں کو ایک مستقل طبقہ کی حیثیت حاصل ہے۔ یہ لوگ بہار کے موسم میں بھیڑوں اور دوسرے مویشیوں کو چراگاہوں میں لے جاتے ہیں اور موسم سرما میں اپنے اپنے دیہات میں رہتے ہیں۔ چوپان اپنی ہی برادری میں شادی بیاہ کرتے ہیں اور اس معاملے میں بے حد محتاط واقع ہوئے ہیں۔ انھیں بعض جڑی بوٹیوں کی شناخت بھی ہے اور جب

وہ موسم سرما کے آغاز میں پہاڑوں سے واپس آتے ہیں تو دیہاتیوں کے لئے یہ جڑی بوٹیاں بھی ساتھ لاتے ہیں۔ انھیں ان کی محنت کا معاوضہ فصل پر ملتا ہے اور ان میں سے بعض برائے نام زراعت بھی کرتے ہیں۔ کشمیر میں بھانڈ یا بھگت کہلانے والے لوگوں کی بھی ایک جماعت موجود ہے۔ ان لوگوں کا پیشہ گانا، ناچنا اور نقلیں کرنا ہے۔ یہ لوگ دیہات میں گشت کرتے رہتے ہیں اور انھیں تقریبات کے موقعوں پر بھی بُلایا جاتا ہے۔

وادیٔ کشمیر کے باشندوں کا کوئی تذکرہ وہاں کے ہانجیوں یعنی کشتی رانوں کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتا۔ ہانجی کشمیر کے قدیم باشندے ہیں اور راج ترنگنی میں ان کا تذکرہ نشاد کے نام سے کیا گیا ہے ان میں سے بعض خود کو حضرت نوحؑ کی اولاد بتاتے ہیں لیکن عام خیال یہ ہے کہ یہ لوگ دائرۂ اسلام میں داخل ہونے سے قبل راجپوتوں کے قبیلہ کشتری سے تعلق رکھتے تھے چنانچہ آج بھی جب کوئی نیا شخص کشتی رانی کا پیشہ اختیار کرتا ہے تو وہ اسے شودر کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ ہانجی بہت سے طبقوں میں تقسیم ہیں اور یہ طبقے ان کی کشتیوں کی اقسام اور استعمال کے ساتھ منسوب ہیں۔ ان میں ناؤ چلانے والوں نے حال ہی میں غلہ اور شہتیر کی تجارت کا پیشہ اختیار کر لیا ہے اور اس کے سبب سے ان کا معیارِ زندگی بلند ہو جانے کے باعث انھیں ہانجیوں میں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ رہائشی کشتی ران صاف ستھرے اور ذہین ہوتے ہیں اور ہندوستانی کے علاوہ انگریزی بھی روانی کے ساتھ بول سکتے ہیں۔ بہر حال ہانجی طاقت ور اور مشقت پسند ہوتے ہیں اور ان کی معاش کا ذریعہ کشتی رانی اور سیّاحوں کی خدمت گذاری ہی ہے۔

کشمیر کے باشندوں کی محبوب خوراک چاول ہے۔ ان کا لباس بھی تقریباً ایک ہی جیسا ہے اور شہری اور دیہاتی باشندوں کے لباس کا فرق صرف ان کے پیشوں کی ضرورتوں اور اقتصادی حالات کے اختلافات پر مبنی ہے۔ کشمیری زبان عربی رسم الخط میں لکھی جاتی ہے۔ کشمیر کے باشندے ذہین ہونے کے علاوہ بہادر بھی ہوتے ہیں۔ چنانچہ اگر ان کی بہادری کے اُن واقعات کو نظر انداز بھی کر

دیا جائے جن کا ثبوت عہدِ قدیم کی تاریخ سے ملتا ہے تو بھی ۱۹۴۷ء میں انھوں نے قبائلی حملہ آوروں کے مقابلہ میں جس طرح اپنے وطن کی مدافعت کی تھی وہ ان کی جرأت اور دلیری کو ثابت کرنے کے لئے کافی ہے۔

وادی کے شمال میں جو علاقہ واقع ہے وہ دردستان کہلاتا ہے۔ اس علاقہ کے باشندے مضبوط اور محنتی پہاڑی ہیں۔ سر جارج گریرسن نے لکھا ہے کہ ــــ لفظ درد کی تاریخ بہت طویل ہے اور درد کے نام سے موسوم لوگ ایک ایسے قدیم قبیلہ سے تعلق رکھتے ہیں جس کا تذکرہ سنسکرت کی کتابوں میں "دردا" کے نام سے کیا گیا ہے۔ اور یونانیوں نیز رومیوں نے کوہ ہندوکش اور ہندوستان کی سرحد کے مابین واقع تمام ترکوہستانی علاقہ کو دردستان میں شامل قرار دیا ہے ــــ قدیم زمانہ میں یہ لوگ وادیٔ کشمیر میں آکر قتل و غارت گری کرتے رہتے تھے چنانچہ راج ترنگنی میں اُن حفاظتی تدابیر کی تفصیل بھی ملتی ہے جو ان کی لوٹ مار کی مہموں کے خلاف وادی کے مختلف حکمران اختیار کرتے رہے تھے۔ یہ لوگ ذہین لیکن غصہ ور ہوتے ہیں اور بہت جلد مشتعل ہو جاتے ہیں۔ ڈاکٹر لٹنر کے بیان کے مطابق جس نے ۱۸۶۶ء میں دردستان کی سیاحت کی تھی۔ یہ لوگ آریہ نسل سے تعلق رکھتے ہیں اور اسلام قبول کرنے سے پہلے بودھ مت کے پیرو تھے۔ چنانچہ آج بھی ان کی بیشتر رسموں میں بودھ مت کی جھلک نظر آتی ہے اور یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ قدیم زمانہ میں یہ علاقہ بھی کشمیر کی تہذیب سے متاثر تھا۔ اس علاقہ کے باشندوں میں سنی اور شیعہ دونوں ہی شامل ہیں اور اس سے متصل علاقہ ہنزا کے باشندے بھی اپنی خصوصیات کے لحاظ سے دردستان ہی کے باشندوں کے مطابق ہیں لیکن ان کا مذہب علی الٰہی مذہب ہے۔ ناگا پربت کے مغرب میں ایک طویل علاقے میں جو چِلاسی کے نام سے موسوم ہے ایک ایسا قبیلہ آباد ہے جو اپنی دہشت اور بربریت کے لئے مشہور ہے اور ۱۸۵۰ء تک یہ بھی وادی میں آکر قتل و غارت گری کیا کرتا تھا۔

دردستان کا تقریباً پورا علاقہ بنجر واقع ہوا ہے اور پہاڑی ندیوں کے آس پاس کی اراضی کے علاوہ وہاں بہت کم زراعت کی جاسکتی ہے اور وہاں گندم، جو اور گرم کے علاوہ جو ایک سخت قسم کا اناج ہوتا ہے اور کچھ پیدا نہیں ہوتا۔ البتہ شہر گلگت میں انگوروں کی کاشت کی جاتی ہے اور اس علاقہ کی غذائی قلت کو پورا کرنے کے لئے کشمیر کی حکومت کو ہر سال وہاں کثیر مقدار میں غلہ بھیجنا پڑتا ہے اور اسے گلاب سنگھ اور اس کے جانشین رنبیر سنگھ نے فتح کر کے ریاست جموں اور کشمیر میں شامل کیا تھا۔ اس علاقہ کے باشندوں میں برادریوں کی تقسیم بھی پائی جاتی ہے اور یہ لوگ رینو یعنی حکمران، شن یعنی مذہبی یا شگن یعنی زراعت پیشہ کریمن اور ڈوم یعنی خدمتگار برادریوں میں منقسم ہیں۔ اٹھارھویں صدی تک شن برادری کے لوگ اپنے مُردوں کو بودھ دھرم کے طریقہ کے مطابق جلایا کرتے تھے لیکن اب انھیں دفن کرتے ہیں مگر تدفین کے وقت آگ روشن کر لیتے ہیں۔

وادی کے شمال و مشرق میں واقع علاقہ بلتستان کہلاتا ہے۔ وہاں تبتی نسل کے لوگ رہتے ہیں اور بالتس کے نام سے موسوم ہیں۔ لیکن چونکہ یہ علاقہ لداخ اور دردستان کے درمیان واقع ہے اس لئے اس کے باشندوں کو بجا طور پر دونوں نسلوں کا مرکب کہا جاسکتا ہے۔ بلتستانی عموماً شیعہ ہوتے ہیں۔ لیکن وہاں بودھوں کی چند بستیاں بھی موجود ہیں۔ بلتستان میں خوبانی بکثرت پیدا ہوتی ہے اور اسی لئے کشمیر کے باشندے اس علاقہ کو 'زیرہ بھوٹان' کہتے ہیں اور اس کے باشندے عموماً کشمیر اور ہندوستان میں آکر مزدوری کرتے ہیں۔

بلتستان کے مشرق میں لدّاخ واقع ہے جسے تبت صغیر کے نام سے بھی موسوم کیا جاتا ہے۔ یہاں کے باشندے بھوٹا کہلاتے اور دلائی لاما کے پیرو ہیں اور نسلی اعتبار سے تبتی واقع ہوئے ہیں۔ لدّاخ کے باشندے خوش مزاج اور ایماندار ہوتے ہیں اور عموماً محنت، مزدوری اور زراعت پر زندگی بسر کرتے ہیں۔ لدّاخ کے باشندے چار برادریوں یعنی گالپو یا راجہ، جرک یا افسر، منگرک یا زراعت پیشہ اور رنگن یا خدمت گار پر منقسم ہیں۔ لیکن ان کی اکثریت زراعت پیشہ ہے۔ لدّاخ کے ہر گاؤں میں

اس کی آبادی اور رقبہ کے لحاظ سے ایک بڑی یا چھوٹی بودھ خانقاہ ہوتی ہے جسے لداخی زبان میں گومپا کہتے ہیں۔ اس خانقاہ میں بودھ راہب اور راہبات رہتی ہیں۔ عبادت گاہ کے علاوہ یہی خانقاہ گاؤں والوں کے لئے پنچایت گھر کا کام بھی دیتی ہے۔ ان میں بعض خانقاہیں دولت مند بھی ہیں اور بعض میں بودھ دھرم سے متعلق نایاب نوشتے بھی محفوظ ہیں۔ لداخیوں کی مقبول غذا گرم ہے چند سال پہلے تک لداخ ایک دور افتادہ علاقہ تھا لیکن اب اوّل تو ہند اور لداخ کے درمیان ہوائی جہازوں کی باقاعدہ آمدورفت شروع ہوگئی ہے اور دوسرے موٹر کے راستہ کی تعمیر نے اُسے باقی ماندہ ہندوستان کے ساتھ ملا دیا ہے۔

سطور بالا میں ریاست جموں اور کشمیر کے باشندوں کے متعلق جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس کے مطالعہ سے اس بات کا اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ موجودہ دور کو نظر انداز کرتے ہوئے جبکہ کشمیر بھی باقی ماندہ ہندوستان کے قدم بہ قدم ترقی کی منزلیں طے کر رہا ہے۔ ڈوگرہ حکومت کے قیام کے وقت وہاں کے باشندوں کی اقتصادیات کا انحصار زراعت، ملازمت اور ان دستکاریوں پہ تھا جو سلطان زین العابدین کے زمانہ میں وہاں رائج ہوئی تھیں لیکن جیسا کہ آئندہ صفحات کے مطالعہ سے معلوم ہوسکے گا ڈوگروں کے ایک سو سالہ دورِ حکومت میں ریاست کے نظم و نسق کا جو طریقہ رائج رہا تھا اس کی بدولت کشمیر زمانہ کے قدم بہ قدم چلنے کے قابل نہیں ہوسکا تھا اور یہ ہی صورت حالات ریاست کی آئندہ تمام تر عوامی اور سیاسی تحریکات کی بنیاد بن گئی تھی۔

مہاراجہ گلاب سنگھ نے جموں میں جو ڈوگرہ حکومت قائم کی تھی وہ پوری ایک صدی تک قائم رہی لیکن امرتسر میں مہاراجہ گلاب سنگھ اور انگریزوں کے درمیان جو معاہدہ ہوا تھا چونکہ اس کے سلسلہ میں کشمیر کے باشندوں کی رائے دریافت نہیں کی گئی تھی اس لئے وہ معاہدہ کشمیر کے جمہوریت پسند حلقوں میں ہی نہیں بلکہ پورے ہندوستان میں سخت ترین تنقید کا نشانہ بنا رہا اور موجودہ صدی کی تیسری دہائی میں کشمیر کے باشندوں نے ریاست میں ذمہ دار حکومت کے قیام کی جو جدوجہد

شروع کی تھی اور جس کا انجام ڈوگرہ خاندان کی حکومت کے خاتمہ، جمہوری حکومت کے قیام اور ہندوستان کے ساتھ اس کے الحاق کی صورت میں برآمد ہوا ہے۔ اس میں بھی ’معاہدۂ امرتسر‘ کا یہی غیر جمہوری کردار کام کرتا رہا ہے۔

بہرحال ۱۸۵۷ء میں مہاراجہ گلاب سنگھ کے انتقال کے بعد اس کا فرزند رنبیر سنگھ اس کا جانشین ہوا۔ اور تقریباً ۲۹ سال تک حکومت کرتے رہنے کے بعد ۱۸۸۵ء میں اس جہانِ فانی سے رخصت ہوگیا اور اس کے بڑے بیٹے پرتاپ سنگھ کو اس کا جانشین بنایا گیا۔ مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے کوئی نرینہ اولاد نہیں تھی اس لئے جب ۱۹۲۵ء میں اس کا انتقال ہوا تو اس کی جگہ اس کے چھوٹے بھائی کے فرزند ہری سنگھ کو راج گدی کا وارث تسلیم کیا گیا حتّٰی کہ اس خاندان کے اس آخری حکمران کو جون ۱۹۴۹ء میں اپنے فرزند یوراج کرن سنگھ کو عارضی طور پر اپنا قائم مقام بنا کر رخصت ہو جانا پڑا۔ لیکن ریاست سے مہاراجہ ہری سنگھ کی یہ مفارقت دائمی ثابت ہوئی۔

معاہدۂ امرتسر کے وقت سے لے کر ریاست جموں وکشمیر میں جمہوری حکومت کے قیام تک اس ریاست کی عنانِ حکومت جن چار حکمرانوں کے ہاتھوں میں رہی تھی یہاں ان کی ذات پر کوئی تنقید مقصود نہیں۔ اس کے برعکس ہمیں اس بات کا اعتراف کرلینا چاہیئے کہ مہاراجہ گلاب سنگھ نے جن حالات میں جموں اور کشمیر کی ریاست قائم کی تھی ان میں ان انتظامی خرابیوں کو دُور کرنا ممکن نہیں ہوسکتا تھا جو پچھلی ایک صدی سے چلی آرہی تھیں۔ پھر جب رنبیر سنگھ کا دورِ حکومت شروع ہوا تو وہ بھی مشکلات سے خالی نہیں تھا۔ مثلاً کئی سال تک وہ اپنی ریاست کی شمالی مغربی سرحد کے باشندوں کی بغاوتوں اور یورشوں کو فرو کرنے میں مصروف رہا۔ پھر ۱۸۷۷ء میں بارش کی زیادتی کے باعث کشمیر کو ایک خوفناک قحط کا سامنا کرنا پڑا اور ۱۸۷۸ء میں جب انگریزوں اور افغانوں کے درمیان جنگ شروع ہوئی تو مہاراجہ رنبیر سنگھ کو اپنے تمام تر وسائل انگریزوں کی امداد کے لئے وقف کردینے پڑے۔ اسی طرح یہ کہا جاسکتا ہے کہ اپنی حکومت کی اس طویل مدت میں

اسے ریاست کے نظم ونسق کی اصلاح پر خاطر خواہ توجہ مبذول کرنے کا موقع نہیں مل سکا۔ پھر بھی اس نے اپنے دورِ حکومت میں کشمیر اور ہندوستان کے درمیان آمدورفت میں سہولت پیدا کرنے کے لئے جہلم روڈ تعمیر کرائی تھی۔ سنسکرت اور فارسی کے قدیم اور نایاب مسودات پر مشتمل ایک کتب خانہ قائم کیا تھا اور مذہب و مسلک کے امتیاز کے بغیر ہر ضرورت مند کی حاجت روائی کرتا تھا۔ لیکن اسی کے دورِ حکومت میں ہندوستان کے غیر ملکی حکمران اس نتیجہ پر پہونچ چکے تھے کہ انھیں جموں اور کشمیر ایسی اہم ریاست کو کسی دیسی حکمران کے ہاتھوں میں نہیں چھوڑ دینا چاہیئے اور وہاں ایک برطانوی ریذیڈنٹ ضرور متعین ہونا چاہیئے لیکن وہ رنبیر سنگھ کے دورِ حکومت میں اپنے اس مقصد کو پوری طرح حاصل نہیں کر سکے تھے اور یہ معاملہ ایک ایسے خصوصی افسر کے تقرر پر ختم ہو گیا تھا جو گرمی کے موسم میں سری نگر رہ کر یورپین سیاحوں کے مفادات کی نگرانی کرتا تھا لیکن مہاراجہ رنبیر سنگھ کی موت کے بعد جب پرتاپ سنگھ اس کا جانشین ہوا تو باقاعدہ جانشینی سے پہلے ہی اسے حکومتِ ہند کے اس ناقابلِ ترمیم فیصلہ سے مطلع کر دیا گیا تھا اور اگرچہ مہاراجہ پرتاپ سنگھ نے مجبوراً اس فیصلہ کو منظور کر لیا تھا لیکن چونکہ یہ منظوری بھی برطانوی حکومت کے حقیقی مقصد کو پورا نہیں کر سکی تھی اور وہ ریاست کے نظم ونسق کو پورے طور پر اپنے ہاتھوں میں لے لینا چاہتی تھی اس لئے اس کے کارندوں نے مہاراجہ کے خلاف ایک خوفناک سازش کر کے ۱۸۸۹ء میں اسے اختیاراتِ حکومت سے تقریباً محروم کر دیا تھا اور یہ اختیارات ایک ایسی "مجلسِ وزراء" کو سپرد کر دئے گئے تھے جس کے اراکین کو مہاراجہ کے خاندان میں سے حکومتِ ہند نامزد کرتی تھی۔ کونسل کا صدر مہاراجہ کے حقیقی بھائی کو بنایا گیا تھا لیکن حقیقی اختیارات برطانوی ریذیڈنٹ کو حاصل تھے اور اس طرح کشمیر میں دوعملی حکومت قائم ہو گئی تھی۔ پھر جب مہاراجہ ہری سنگھ کا دورِ حکومت شروع ہوا تو ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد نہ صرف شروع ہی ہو چکی تھی بلکہ کئی منزلیں طے بھی کر چکی تھی اور کشمیر میں اس جدوجہد کا ردِ عمل محسوس کیا جا رہا تھا۔

مذکورہ بالا حالات کے پیشِ نظر یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ڈوگرہ حکومت کے ایک سو سالہ دَور میں بعض داخلی اور خارجی اسباب کی بنا پر ریاست کے نظم و نسق میں ایسی تبدیلیاں ممکن نہیں ہو سکی تھیں جو عوام کے اقتصادی، معاشی اور سماجی حالات کو قابلِ توجہ حد تک بہتر بنا سکتیں۔ پھر اس دور میں زمینداروں کے طبقے کو بھی تقویت حاصل ہوئی تھی۔ اس کے باوجود اس امر سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ دور اصلاحات سے بالکل خالی نہیں رہا تھا۔ اس دَور میں بہ حیثیت مجموعی کچھ بہتر حالات بھی رونما ہوئے تھے اور اس دَور کی سب سے اہم خصوصیت یہ تھی کہ اس میں عوام کا وہ سیاسی اور سماجی شعور بیدار ہُوا تھا جس کی بدولت آج ریاست جمّوں و کشمیر کا شمار ہندیونین کی ترقی پسند اور ترقی پذیر ریاستوں میں کیا جاتا ہے۔

اس دور کے آغاز میں حکومت کی ذاتی کاشت کا طریقہ بھی رائج تھا۔ اس کام کو انجام دینے کے لیے جو سرکاری ملازمین متعین تھے انھیں مصارف کے لئے ضروری رقم دے دی جاتی تھی لیکن وہ اس رقم کو اپنے لئے رکھ لیتے تھے اور نہ صرف بیگاریوں سے زمین کی کشاورزی ہی کراتے تھے بلکہ اس کے لئے بیج بھی دیہاتیوں ہی سے وصول کرتے تھے۔ سری نگر میں چاول لانے کی صورت میں اس پر بھاری محصول ادا کرنا پڑتا تھا۔ حکومت خود غلہ کی تجارت کرتی اور اس کی قیمت مقرر کرتی تھی لیکن حکومت کا چاول پوری قیمت پر فروخت ہوتا تھا اور زمینداروں کے چاول کی قیمت میں سے محصول کی رقم کاٹ لی جاتی تھی اور گھوڑوں کی فروخت پر 'زرنخاس' کے نام سے ان کی قیمت کا ۵۰ فی صد بطور محصول وصول کر لیا جاتا تھا۔

حکومت کا کوئی شعبہ بھی رشوت ستانی سے پاک نہیں تھا اور اس کی تمام تر ضرب غریب کسانوں پر پڑتی تھی۔ حکومت کی طرف سے اصلاحِ حالات کی کوشش کئے جانے کے بجائے اس بے راہ روی کی ہمت افزائی کی جاتی تھی۔ اس زمانہ میں کشمیر کے ہر گاؤں میں حکومت کی طرف سے ایک ذیلدار یا ہرکارہ متعین ہوتا تھا۔ یہ لوگ افسروں کو اپنے اپنے گاؤں کے حالات سے باخبر

رکھتے تھے اور انھیں ان کی خدمات کے صلہ میں ان کے گاؤں کی مجموعی پیداوار کا ۱/۲ فی صد دیا جاتا تھا
چناں چہ ایک مرتبہ مہاراجہ کے ایک وزیر نے محسوس کیا کہ ان ذیلداروں یا ہرکاروں کو معقول آمدنی
ہوتی ہے اس لئے اس نے ہر کارہ یاشنی یعنی ممدو ذیلدار کو سالانہ ایک بڑی رقم خزانہ میں داخل کرنے
کا حکم دے دیا۔ یہ رقم ایک زمانے میں ۷،۳ ہزار روپے تک پہونچ گئی تھی اور اس ایک واقعہ سے
اندازہ ہوتا ہے کہ اس زمانے میں رشوت ستانی اور لوٹ کھسوٹ کی کس طرح ہمت افزائی کی
جاتی تھی۔

پھر اس زمانہ میں بے گار کا ہولناک رواج بھی موجود تھا۔ اس رواج کے ماتحت ہر سال
گرمی کے موسم میں ہزاروں کشمیریوں کو گلگت میں مقیم فوجوں کے لئے رسد پہونچانی پڑتی تھی۔ انھیں
غلہ کی بوریاں اپنی پشت پر لاد کر نیچے ہوئے طویل پہاڑی راستوں اور برف پوش پہاڑوں
سے گذرنا پڑتا تھا اور ان میں سینکڑوں بھوک، پیاس نیز گرمی اور سردی کی شدت کی تاب
نہ لاسکنے کی بدولت راستہ ہی میں دم توڑ دیتے تھے۔ یہ مہم موسم گرما میں ٹھیک اسی زمانہ
میں شروع ہوتی تھی جب کشمیر کے باشندے کھیتی باڑی کی تیاریاں کرتے ہیں اس لئے اس
کا اثر زراعت پر بھی پڑتا تھا۔ اس رواج کی بدولت رشوت ستانی کی ہمت افزائی بھی ہوتی
تھی اور جو لوگ سرکاری افسروں کو رشوت دے سکتے تھے اُنھیں بیگار میں پکڑ کر گلگت نہیں
بھیجا جاتا تھا اور چونکہ اس رواج کی بدولت زراعت میں کمی واقع ہوتی رہتی تھی اسی لئے یا
تو سرکاری محاصل وصول ہی نہیں ہوتے تھے یا پھر انھیں وصول کر لینے کے بعد دیہات کے
باشندے صرف بھکاری ہی رہ جاتے تھے۔ لیکن ریاست جموّں اور کشمیر کے قیام اور استحکام
پر جس قدر مدت گذرتی گئی اسی قدر ان برائیوں کا انسداد بھی ہوتا گیا لیکن چونکہ ایک جانب تو
ہندوستان کی قومی آزادی کی تحریک روز بروز تقویت حاصل کرتی جارہی تھی اور دوسری
طرف ڈوگرہ حکومت کے زمانہ میں عوام کا جو سیاسی شعور پیدا ہوا تھا اس کی بدولت

وہ اپنے مستقبل کو اپنے درخشندہ ماضی کی بنیاد تعمیر کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ اس صدی کے آغاز اور خصوصاً اس کی تیسری دہائی سے انھوں نے وہ جدوجہد شروع کی تھی جو ریاست جموں اور کشمیر سے وہاں کی مطلق العنان حکومت کے خاتمہ اور جمہوری حکومت کے قیام پر ختم ہوئی ہے۔

تیسرا باب

سیاسی بیداری اور عوامی تحریکات

کشمیر کی تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کے اس حصہ کے باشندے کسی دور میں بھی سیاسی شعور سے محروم نہیں رہے۔ للیتادتہ کی فوجی مہمات اور فتوحات، کشمیر کو فتح کرنے میں محمود غزنوی کی ناکامیابی، زین العابدین کے ترقی پسندانہ اقدامات، شہنشاہ اکبر کی فوجوں کے مقابلے میں اپنے عزیز وطن کی مدافعت اور اسے پٹھانوں کی حکومت سے نجات دلانے کی کوشش ایسے واقعات، باشندگانِ کشمیر کی مسلسل سیاسی بیداری کا ثبوت مہیا کرتے ہیں۔ پھر ان کی یہ سیاسی بیداری ملکی فتوحات یا مدافعتِ وطن ہی تک محدود نہیں تھی بلکہ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ملک کے داخلی نظم ونسق اور حکومتوں کے انقلابات میں بھی کارفرما رہتی تھی۔ اور اس مخصوص مقابلے میں بھی کشمیر کے باشندے، باقی ماندہ ہندوستان کے باشندوں کے دوش بدوش ہی نہیں بلکہ ان کے نظریات اور ان کی روایات سے متاثر بھی تھے۔

ہندوستان ہمیشہ سے مذہب پسندوں کا وطن رہا ہے اور قدیم ہندوستان کے باشندے اس معاملے میں امتیازی حیثیت رکھتے تھے۔ مذہب ہمیشہ سے عدل وانصاف کا علمبردار رہا ہے اور اس کی یہی دعوت قدیم ہندوستان کے باشندوں کی آزاد خیالی اور ان

کی حکومتوں کی انصاف پسندی کی بنیاد بنی ہوئی تھی۔ کشمیر میں جو لوگ آکر آباد ہوئے تھے وہ بھی باقی ماندہ ہندوستان کے باشندوں کی طرح آریہ نسل سے تعلق رکھتے تھے اور ان دونوں کے بہت سے بنیادی خیالات خصوصاً مذہبی عقائد میں مماثلت موجود تھی۔ ولادت مسیح سے قبل اشوک اعظم نے کشمیر کو فتح کر کے اسے براہِ راست ہندوستان میں شامل کر لیا تھا اور یہ تعلق کم و بیش پانچ سو سال تک قائم رہا تھا جس کی وجہ سے ہندوستان کے ثقافتی، سیاسی اور سماجی خیالات اور نظریات کشمیر تک پہونچے تھے۔ پھر مختلف زمانوں میں فاتح یا مفتوح کی حیثیت سے کشمیر اور باقی ماندہ ہندوستان کا تعلق قائم رہا تھا اس لئے کشمیر پر باقی ماندہ ہندوستان کے سیاسی اور سماجی نظریات کا جو نقش قائم ہوا تھا وہ زیادہ گہرا ہوتا چلا گیا تھا۔ چنانچہ کشمیر کی تاریخ میں ایسے واقعات بھی ملتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ کشمیر کے باشندے قدیم زمانہ میں اپنے راجاؤں کی اصلاح کرنے اور حکومت کے نظم و نسق کو درست کرانے کے لئے خاموش اور پُرامن جدوجہد ہی نہیں بلکہ مسلح اقدامات بھی کیا کرتے تھے حتیٰ کہ ایسے موقعوں پر برہمن بھی جن کے تعلقات راجاؤں اور برسرِاقتدار گروہوں کے ساتھ بہت مضبوط اور گہرے ہوتے تھے عوام ہی کے ساتھ رہتے تھے۔ چنانچہ کشمیر کے قدیم راجاؤں کے خلاف ڈاروں، تنتریوں اور ٹھاکروں کی مسلح بغاوتیں مشہور ہیں۔ اس قسم کے اقدامات کشمیریوں کی سیاسی بیداری کی نشان دہی کرتے ہیں اور ان کی بدولت اس دور کی حکومتیں بہت سی غلط کاریوں سے محفوظ رہتی تھیں۔ بہرحال جس طرح قدیم کشمیر کے باشندوں کی سیاسی بیداری اس دور کے باقی ماندہ ہندوستان کے سیاسی شعور اور نظریات کی آئینہ دار تھی اسی طرح موجودہ دور کے کشمیر کی سیاسی بیداری بھی باقی ماندہ ہندوستان کی سیاسی بیداری کے ساتھ وابستہ ہے اور اس بیداری کو پیدا کرنے میں ہندوستان کی سیاسی تحریکات اور ہندوستان کے رہنماؤں نے بے حد اہم کردار ادا کیا ہے۔

زمانہ کے ساتھ ساتھ سیاسی بیداری کے موقف بھی بدلتے رہتے ہیں۔ چنانچہ قدیم زمانہ

میں جب انسانی سماج طبقوں میں تقسیم نہیں تھا سیاسی بیداری کے مظاہرے ملکی فتوحات یا سرداروں اور راجاؤں کے کسی ناروا فعل کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے ہی تک محدود رہتے تھے لیکن آہستہ آہستہ جب انسانی سماج میں طبقوں کا ظہور ہوا تو سیاسی بیداری نے طبقاتی کش مکش کی صورت اختیار کرلی اور اس طرح عوام اپنی اجتماعی زندگی کے ہر پہلو کو اقتصادی اور معاشی زاویۂ نظر سے دیکھنے لگے۔

گذشتہ باب میں بتایا جا چکا ہے کہ کشمیر کے باشندوں نے جن کی اکثریت مسلمانوں پر مشتمل ہے انیسویں صدی کے آغاز میں افغانستان کی مسلم حکومت سے قطع تعلق کرنے کے لئے مہاراجہ رنجیت سنگھ سے امداد حاصل کی تھی جس کی وجہ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں تھی کہ سماج میں جو طبقہ وارانہ کش مکش شروع ہوگئی تھی اس کے ماتحت پٹھان حکمران کشمیر کے تمام باشندوں کے ساتھ جن میں ہندو، مسلمان، بودھ اور سکھ سب ہی شامل تھے ایک ہی جیسا سلوک روا رکھتے تھے۔ پھر جب سکھوں کا دورِ حکومت آیا تو اس میں بھی یہی صورت حال قائم رہی۔ اور اگرچہ سکھوں کے دورِ حکومت میں کشمیر کے دو آخری صوبیدار، شیخ غلام محی الدین اور شیخ امام الدین مسلمان تھے لیکن چونکہ بنیادی طور پر حکومت کا نظم و نسق درست نہیں تھا اس لئے مسلمان صوبیداروں کی موجودگی بھی کشمیر کے باشندوں کو مطمئن نہیں کرسکی اور ان ہی حالات میں ڈوگرہ حکومت کا قیام عمل میں آیا تھا۔

پچھلے باب میں کشمیر کے اس دور کے اقتصادی حالات نیز اس کے نظم و نسق پر روشنی ڈالی جا چکی ہے۔ ڈوگرہ خاندان کے پہلے دو حکمرانوں کے زمانہ میں کشمیر کے نظم و نسق کی یہ ابتری بدستور قائم رہی تھی اور اسی ابتری کو بہانہ بنا کر ہندوستان کی انگریز حکومت اپنی فوجی ضرورتوں کو پورا کرنے کی غرض سے ریاست جموں اور کشمیر کے معاملات میں زیادہ سے زیادہ دخل حاصل کرنا چاہتی تھی۔ چنانچہ مہاراجہ رنبیر سنگھ کے انتقال پر ریاست میں ریذیڈنٹ

کا تقرر بھی کر دیا تھا۔ اس طرح جب ۱۸۸۵ء میں مہاراجہ پرتاپ سنگھ کا دورِ حکومت شروع ہوا تو عوام کی خستہ حالی کے پیشِ نظر انھوں نے انتظامِ حکومت میں بعض اصلاحات کا اعلان کیا جس کی رُو سے حکومت کی براہِ راست کاشتکاری ختم کر دی گئی، چاول کی فروخت کا محصول منسوخ کر دیا گیا۔ ہرکاروں کی تنظیم کو توڑ دیا گیا اور سپاہیوں کو ان کے حقِ خدمت کے طور پر غلّہ دینے کا رواج ختم کر کے ان کی تنخواہیں مقرر کر دی گئیں۔ پھر ۱۸۸۷ء میں حکومتِ ہند کے ایک افسر مسٹر وِنگیٹ کو ریاست کی اراضی کے بندوبست پر مامور کیا گیا اور دو سال بعد مسٹر وِنگیٹ کی جگہ یہ کام مسٹر والٹر لارنس کے سپرد کر دیا گیا اور انھوں نے ریاست کے پہلے بندوبست کی تکمیل کی۔

پٹھانوں نے اپنے عہدِ حکومت میں کشمیر کے کسانوں اور کاشتکاروں پر جو ناقابلِ برداشت زرعی محاصل عاید کئے تھے وہ ڈوگرہ حکومت کے ابتدائی دور میں بھی قائم رہے تھے اس لئے کاشتکاروں نے زراعت کا پیشہ چھوڑ دیا تھا حتّٰی کہ اس بندوبست کے سلسلے میں جب ان کے درمیان زمین تقسیم کی جانے لگی تو وہ اس پیش کش کو قبول کرنے کے لئے بھی تیار نہیں تھے۔ بہرحال اس بندوبست کے ماتحت زمین کو تقسیم کر دینے کے باوجود وادیٔ کشمیر اور سرحدی علاقوں میں مہاراجہ یا زمینداروں ہی کی ملکیت برقرار رہی۔ کاشتکار مال گذاری ادا کرتے رہنے کے باوجود، مہاراجہ اور ان زمینداروں کی رضامندی سے اراضی پر قابض تو رہ سکتے تھے لیکن انھیں اس اراضی کو فروخت کرنے یا رہن رکھنے کے حقوق حاصل نہیں تھے۔ اس کے برعکس اس بندوبست کے وقت صوبہ جموں کی تین تحصیلات، رام نگر، بسوہلی اور میرپور کے علاوہ، جن کے زمیندار مال گذار کہلاتے تھے اور جنھیں اراضی کو فروخت کرنے اور رہن رکھنے کے حقوق حاصل تھے، زرعی اراضی جن کاشتکاروں کے قبضہ میں تھی ان کو ہی اس کا مالک قرار دے دیا گیا۔ اس طرح کشمیر کی تاریخ میں پہلی مرتبہ اس کے باشندے اپنی ہی اراضی کی ملکیت سے محروم ہو گئے۔ پھر اس واقعہ سے

اس امتیاز کا اندازہ بھی ہوتا ہے جو حکومت صوبہ جموں اور کشمیر کے باشندوں کے درمیان روا رکھتی تھی۔ پھر مال گذاری کی جو شرح مقرر تھی اور اسے وصول کرنے کے جو طریقے رائج تھے ان کی بدولت کاشتکاروں کو پیداوار کے تیسرے حصہ سے زیادہ نہیں ملتا تھا جس کی بدولت کسانوں اور کاشتکاروں کے درمیان بے چینی اور بدحالی بڑھتی جا رہی تھی۔ اور چونکہ یہ حالات ریاست کی صنعتوں پر بھی اثر انداز ہوئے تھے اس لئے ان کی ترقی بھی مسدود ہو گئی تھی

مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے دورِ حکومت میں ریاست کے نظم و نسق کو بہتر بنانے کا جو کام شروع ہوا تھا اسے انجام دینے کے لئے تعلیم یافتہ لوگ درکار تھے لیکن ریاست میں تعلیم کے فقدان کی بدولت وہاں تعلیم یافتہ لوگ بھی نہیں مل سکتے تھے۔ اس لئے ریاست کے نئے محکموں اور دفتروں کو سنبھالنے کے لئے ہزاروں تعلیم یافتہ افراد کو باہر سے ریاست میں لایا گیا۔ لیکن انھیں ریاست کے مسائل اور اس کے باشندوں سے کوئی واقفیت اور ہمدردی نہیں تھی۔ مگر یہی نو وارد، دیسی باشندوں پر حکومت کرتے تھے اور ان کی موجودگی میں ریاست کے باشندے احساسِ کمتری محسوس کرنے لگے تھے۔ کشمیر کے باشندے جو صدیوں سے اپنے وطن پہ بیرونی اقتدار کے قیام کی مخالفت کرتے رہے تھے اب ایک نئی شکل میں اس کے زیرِ اقتدار آ گئے تھے۔ یہ صورت حال عوام ہی کے لئے ناقابلِ قبول نہیں تھی بلکہ اعلیٰ طبقوں کے لئے بھی ناقابلِ برداشت ثابت ہو رہی تھی اور اُن ہی طبقات کی تحریک پر انیسویں صدی کے اواخر میں حکومت ہند نے ریاست کی حکومت کو ہدایت کی تھی کہ اسے ملازمتوں میں ریاست کے باشندوں کا زیادہ سے زیادہ خیال رکھنا چاہیئے۔ اس طرح ریاست میں ریاستی اور غیر ریاستی کے عنوان سے ایک نئی کشمکش بھی شروع ہو گئی تھی۔

بیسویں صدی کے آغاز میں، مسز اینی بیسنٹ، صاحب نامی خاندان کے ایک فرد پنڈت بالاکول اور بعض دوسرے روشن خیال حضرات کی کوششوں سے سری نگر میں ایک

کالج کا قیام عمل میں آیا۔ اسی زمانہ میں جموں میں بھی ایک سرکاری کالج کھولا گیا اور ریاست میں تعلیم یافتہ لوگوں کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا۔ اور اس کے ساتھ ہی ان تعلیم یافتہ نوجوانوں میں غیر ریاستی عناصر کے دفتری اقتدار کو ختم کرنے کا جذبہ بھی بیدار ہونے لگا۔

ریاست جموں اور کشمیر کے ان عمومی حالات کے دوش بدوش بے چینی کا ایک دوسرا طاقتور عنصر بھی پرورش پا رہا تھا اور وہ تھا مسلمانوں کے درمیان اپنی پس ماندگی کا احساس۔ ریاست جموں اور کشمیر کی مجموعی آبادی میں مسلمانوں کا تناسب تقریباً ۷۷ فی صد اور وادی میں ان کی آبادی کم و بیش ۹۲ فی صد ہے۔ اس طرح ریاست کی انتظامی خرابیوں کا اثر بھی مسلمانوں ہی پر زیادہ پڑ رہا تھا۔ وادی میں حکومت نے زرعی اراضی کے سلسلے میں جو حکمت عملی اختیار کی تھی اس سے بھی مسلمان ہی زیادہ متاثر ہوئے تھے اور چونکہ وہ انگریزی تعلیم حاصل کرنے سے گریزاں رہے تھے اس لئے انھیں ملازمتوں میں بھی اپنے لئے کوئی گنجائش نظر نہیں آتی تھی اور ان اسباب نے مسلمانوں میں ان کی پستی اور پس ماندگی کا احساس پیدا کر دیا تھا اور اگرچہ ریاست کے نظم و نسق کو ریاست سے باہر کے لوگوں سے پاک کرنے کا نعرہ ریاست کے تعلیم یافتہ ہندوؤں نے بلند کیا تھا مگر مسلمانوں نے اس کی مخالفت نہیں کی تھی۔ لیکن وہ چاہتے تھے کہ جس قدر جلد ممکن ہو سکے وہ بھی اپنی تعلیمی پس ماندگی کو دور کر کے ریاست کے انتظام میں حصہ دار بن جائیں۔

اس سلسلے میں کشمیر کے مسلمان ریاست سے مناسب سہولتیں حاصل کرنے کے خواہش مند تھے لیکن انھیں اپنے مقصد میں کامیابی حاصل نہ ہو سکی تھی حتیٰ کہ ۱۹۱۶ء میں جب مہاراجہ کی درخواست پر حکومت ہند کے کمشنر تعلیم مسٹر شارپ نے کشمیر کا دورہ کر کے مسلمانوں کی تعلیمی ضروریات کا جائزہ لے کر اپنی رپورٹ پیش کی تو ان ہی غیر ریاستی عناصر نے جو اس وقت ریاست کے نظم و نسق پر چھائے ہوئے تھے اس رپورٹ کو بھی گلدستۂ طاقِ نسیاں بنا دیا۔ اس صورت حال نیز اس بات کو دیکھ کر کہ کشمیری پنڈت تعلیم میں ترقی کرتے اور سرکاری ملازمتوں پر فائز ہوتے جا رہے ہیں

مسلمانوں میں حکّام ریاست کے خلاف تلخی میں اضافہ ہوتا چلا گیا حتیٰ کہ جب ۱۹۲۴ء میں ہندوستان کے گورنر جنرل اور وائسرائے لارڈ ریڈنگ نے کشمیر کا دورہ کیا تو مسلمانوں نے انھیں اپنی شکایات اور اپنے مطالبات پر مشتمل ایک عرضداشت بھی دی لیکن ایک سرکاری کمیٹی نے جو ایک ایک مسلمان، ہندو اور یورپین پر مشتمل تھی اس عرضداشت کو بے معنی قرار دے کر مسترد کر دیا اور جن لوگوں نے اس پر دستخط ثبت کیے تھے ان میں سے بعض کو جلاوطن کر کے ان کی جائداد کو ضبط کر لیا گیا۔ یہ تھے ریاست جموّں اور کشمیر کے وہ حالات جن میں ۱۹۲۵ء میں مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے انتقال کے بعد مہاراجہ ہری سنگھ برسرِ حکومت آئے۔

۱۹۱۲ء میں جب ریاست میں ریاستی اور غیر ریاستی کا سوال اُٹھا ہوا تھا پہلی بار ریاست کے شہری کی ایک تعریف مدون کی گئی تھی لیکن وہ تعریف اپنی جگہ اس درجہ مجہول تھی کہ اس سے ریاست کے باشندوں کو کوئی قابلِ ذکر فائدہ نہیں پہونچ سکا تھا اس لئے ۱۹۲۵ء میں ریاستی شہریت کی ایک جامع اور واضح تعریف مدون کی گئی جس کی وجہ سے ریاست میں غیر ریاستی باشندوں کے برسرِ اقتدار آنے کا سلسلہ تو مسدود ہو گیا لیکن ریاست کی انتظامی اور فوجی اسامیاں راجپوتوں اور ڈوگروں کے لئے مخصوص ہو کر رہ گئیں۔ اس طرح ایک جانب تو حکومت پر صوبائی عصبیت کی حکمت عملی اختیار کرنے کا شبہ کیا جانے لگا اور دوسری طرف صوبہ جموّں کے غیر ڈوگرہ باشندے بھی ڈوگروں کے اس عروج کو اپنی حق تلفی سے منسوب کرنے لگے۔ اسی زمانے میں 'ڈوگرا سبھا' کے نام سے جموّں میں ڈوگروں کی ایک سیاسی تنظیم بھی قائم کی گئی جو عوام کے نام پر ڈوگروں کے اعلیٰ طبقہ کے مفادات کا تحفّظ کرتی تھی۔

صوبائی عصبیت اور ڈوگروں کے اعلیٰ طبقوں کو نوازنے کا سلسلہ اس درجہ طویل ہو گیا تھا کہ اس کی وجہ سے ایک طرف تو کشمیر کے غیر مسلموں میں بھی حکومت کی اس حکمتِ عملی سے بیزاری کا اظہار کیا جانے لگا تھا اور دوسری طرف جموّں کے غیر ڈوگرہ باشندوں حتیٰ کہ خود ڈوگرہ عوام میں بھی

بے چینی پیدا ہونے لگی تھی۔ اس طرح موجودہ صدی کی تیسری دہائی کے اختتام پر وہ تمام اسباب اور عناصر جمع ہوگئے تھے جو قوموں کی سیاسی بیداری کے محرک ہوتے ہیں۔ اور ان ہی اسباب و علل کی بنا پر ابتدا ہی سے ایک زبردست قومی تحریک چلائی جاسکتی تھی۔ لیکن جب یہ تحریک شروع ہوئی تو ابتدا میں بعض ناگزیر وجوہ کی بدولت یہ فرقہ وارانہ شکل میں نمودار ہوئی مگر چونکہ اس کے بنیادی عوامل و محرکات عمومی اور عوامی تھے اس لئے اس نے بہت جلد قومی تحریک کی صورت اختیار کر لی۔

گذشتہ سطور میں بتایا جاچکا ہے کہ بیسویں صدی کے آغاز میں مسلمانوں نے مغربی تعلیم حاصل کرنی شروع کر دی تھی اور وہ ہندوستان کے تعلیمی مرکزوں میں تعلیم پا کر کشمیر واپس جا رہے تھے لیکن حکومت کی صوبائی عصبیت کی بدولت ان کے لئے ملازمتوں کے دروازے بند تھے اور وہ اس سوال پر غور کرنے لگے تھے کہ انہیں اپنے جائز حقوق حاصل کرنے کے لئے کیا قدم اٹھانا چاہئیے اس زمانے میں انگریزی حکومت کے خلاف ہندوستان کی قومی جدوجہد بہت آگے بڑھ چکی تھی حتیٰ کہ ۱۹۲۹ء میں انڈین نیشنل کانگریس نے اپنے اجلاس لاہور میں جو پنڈت جواہر لال نہرو کی زیر صدارت منعقد ہوا تھا، ہندوستان کے لئے کامل آزادی حاصل کرنے کی قرارداد منظور کر لی تھی اور اس ملک کی انگریز حکومت کے پاس اس قرارداد کو بے اثر بنانے کے لئے فرقہ وارانہ جذبات کو مشتعل کرنے کے علاوہ اور کوئی ذریعہ موجود نہیں تھا اور چونکہ ہندوستان کی انگریز حکومت کشمیر کی بعض خصوصیات کے پیش نظر اس پر اپنا زیادہ سے زیادہ دخل قائم کرنے کے لئے مہاراجہ گلاب سنگھ ہی کے زمانہ سے وہاں کی اکثریت سے فائدہ اٹھانا چاہتی تھی اور اب کشمیر کے حالات نے اس کے لئے ایک زریں موقع فراہم کر دیا تھا اس لئے اس نے ان غیر ریاستی عناصر کی معرفت جن میں سے بعض تو ریاستی اور غیر ریاستی کے سوال پر اپنے مفادات سے محروم ہو جانے کے باعث ریاست کے نظام اور عوام سے بیزار تھے اور بعض فرقوں اور برادریوں کے حقوق کے تحفظ کا نعرہ بلند کر کے

ایک طرف تو انگریزوں کو خوش کرنا چاہتے تھے اور دوسری طرف خود اقتدار حاصل کرنے کے خواہش مند تھے، ریاست کے باشندوں کی اقتصادی بے چینی اور سیاسی بیداری کو فرقہ واریت کی راہ پر لگا دیا اور چونکہ ریاست میں پروپیگنڈا کے وسائل مفقود تھے اس لئے بیرونِ ریاست کے فرقہ پرست اخبارات کو ریاست میں پہونچا کر ان سے فرقہ واریت کا زہر پھیلانے کا کام لیا جانے لگا۔ اس طرح کشمیر میں اس فرقہ وارانہ تحریک کا آغاز ہوا جو چند سال کے بعد ہی عوامی تحریک میں تبدیل ہو گئی۔ لیکن اس دور میں بھی کشمیر ایسے لوگوں کے وجود سے خالی نہیں تھا جو وقت کے سوالات کو فرقہ پرستی کے زاویۂ نظر سے نہیں دیکھتے تھے چنانچہ جب ۱۹۲۹ء میں انڈین نیشنل کانگریس کے اجلاس کے ساتھ ساتھ لاہور میں ریاستی باشندوں میں سیاسی کام کرنے والوں کا ایک کنونشن منعقد ہوا تو اس میں کشمیر کے نمائندے بھی شامل تھے اور اس کنونشن میں کشمیر کی حکومت اور عوام سے متعلق بعض مخصوص قراردادیں بھی منظور کی گئی تھیں۔

بہرحال مسلمانوں کے تعلیم یافتہ اور نوجوان طبقہ میں اپنی بے روزگاری اور خستہ حالی کا جو احساس پیدا ہو گیا تھا اس نے انھیں عمل پر آمادہ کر دیا تھا۔ انھوں نے سری نگر میں 'فتح کدل ریڈنگ روم' قائم کرکے باہم تبادلۂ خیالات کے لئے ایک مستقر پیدا کر لیا تھا اور جموں میں بھی 'ینگ منز مسلم ایسوسی ایشن' کے نام سے مسلمان نوجوانوں کی ایک ایسی ہی تنظیم قائم ہو گئی تھی اور کچھ مدت کے بعد ان دونوں کو باہم ملحق کر دیا گیا تھا۔

یہاں اس بات کو بھی ذہن نشین کر لینا چاہیئے کہ ۱۹۳۰ء میں لندن میں جو 'راؤنڈ ٹیبل کانفرنس' منعقد ہوئی تھی اس میں مہاراجہ ہری سنگھ بھی شریک ہوئے تھے اور انھوں نے اپنی تقریروں میں، ہندوستان کے قومی مطالبات کی تائید کی تھی۔ اس لئے ہندوستان کے فرقہ پرست عناصر کی طرح برطانوی حکومت بھی ان کی مخالف ہو گئی تھی اور اس نے مسلمانوں کی اقتصادی بے چینی کو اپنی اغراض کے لئے استعمال کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

ایک جانب تو ریاست کے اندر عوامی بیداری کے اسباب و علل پرورش اور تقویت پا رہے تھے اور دوسری طرف ریاست سے باہر بھی چند ایسے عناصر موجود تھے جو آہستہ آہستہ ریاست کے اس ماحول پر اثر انداز ہو رہے تھے۔ مثلاً اس صدی کی تیسری دہائی کے وسط سے لاہور میں "آل انڈیا کشمیر مسلم کانفرنس" کے نام سے جو جماعت قائم تھی اگرچہ ابتداء میں وہ کشمیر کے ضرورت مند مسلمان نوجوانوں کو ان کی تعلیم میں مدد دیتی تھی لیکن اب اس نے سیاسیات میں دخل دینا شروع کر دیا تھا۔ حتیٰ کہ ۱۹۲۶ء میں اس نے مہاراجہ کی خدمت میں ایک عرضداشت پیش کرنے کی اجازت بھی طلب کی تھی لیکن اس کی یہ درخواست مسترد کر دی گئی تھی۔

ریاست سے باہر لیکن اس کے ساتھ دلچسپی رکھنے والا دوسرا عنصر ان فرقہ پرست مسلمانوں پر مشتمل تھا جو کشمیر کی مسلم اکثریت کو مختلف طریقوں سے اپنے فرقہ وارانہ مقاصد کے لئے استعمال کرنا چاہتا تھا اور اس کے لئے کشمیر سے مہاراجہ کی حکومت کے خاتمہ کو ضروری سمجھتا تھا۔ لیکن یہ عنصر دو گروہوں میں منقسم تھا اور ان کا ہوشمند گروہ محسوس کرتا تھا کہ برطانوی حکومت کی بالادستی کی موجودگی میں مہاراجہ کی حکومت کو ختم کرنا تو ممکن نہیں ہو سکتا لیکن اگر ریاست میں ذمہ دار آئینی حکومت قائم کرائی جا سکے تو اس سے ان کے مقاصد کی تکمیل میں بہت زیادہ مدد ملے گی۔ معاملہ کو اس زاویۂ نظر سے دیکھنے والوں میں آل انڈیا مجلس احرار کے رہنما اور احمدی خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں لیکن اگر مجلسِ احرار کشمیر کے مسلمانوں کی جدوجہد میں شریک ہو کر اپنے وقار اور اثر کو بڑھانا چاہتی تھی تو احمدی کشمیر کو اپنے عقائد کی تبلیغ کا میدان بنانے کے متمنی تھے۔ ان کے علاوہ آل انڈیا مسلم لیگ اور آل انڈیا مسلم کانفرنس ایسی جماعتیں بھی ریاست کے داخلی معاملات کے ساتھ دلچسپی کا اظہار کرنے لگی تھیں اور چونکہ ۱۹۲۹ء میں کانگریس کے اجلاس منعقدہ لاہور کے بعد ہندوستان میں قانون شکنی کی تحریک شروع ہو گئی تھی اور اس تحریک میں مسلمانوں نے پوری قوت کے ساتھ حصہ نہیں لیا تھا نیز ۱۹۳۰ء کی راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں مہاراجہ ہری سنگھ نے اپنے قوم پرورانہ رجحانات کا اظہار

کیا تھا اس لئے اب برطانوی حکومت نے ان ہندوستانی مسلمانوں کو جو قانون شکنی کی تحریک سے علیحدہ رہے تھے انعام اور مہاراجہ کو ان کے قوم پرورانہ خیالات کی سزا دینے کے لئے ان عناصر کو جو ریاست میں فرقہ وارانہ تحریک شروع کرنے اور کرانے کے خواہش مند تھے ہر قسم کی امداد دینے کا فیصلہ کر لیا اور یہ وہ حالات تھے جن میں ۱۹۳۱ء کی جدوجہد شروع ہوئی تھی۔

۱۹۳۱ء شروع ہوا تو ریاست کے مسلمان جدوجہد کے لئے تیار ہو چکے تھے لیکن ابھی وہ یہ بات طے نہیں کر سکے تھے کہ انھیں اپنی جدوجہد کس طرح شروع کرنی چاہیئے۔ اس زمانہ میں ریاست کے اندر تقریر و تحریر کی آزادی مفقود تھی اس لئے مسلمان نوجوانوں نے پنجاب کے مسلم اخبارات میں ایسے مضامین شائع کرانے شروع کئے جن میں حکام پر سخت تنقید کے علاوہ ہندو راجہ اور ہندو فرقہ کی مذمت بھی ہوتی تھی اور جب ریاست میں ان اخبارات کا داخلہ بند کر دیا گیا تو انھوں نے مختلف عنوانات سے کتابچے طبع کرا کے خفیہ طور پر انھیں ریاست میں لانا اور تقسیم کرنا شروع کر دیا۔ کشمیر کے مسلمانوں میں سری نگر کی جامع مسجد کے امام اور خانقاہِ معلی کے سجادہ نشین کو جنھیں میر واعظ کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے ہمیشہ احترام اور عقیدت کی نظر سے دیکھا جاتا رہا ہے لیکن یہ دونوں مذہبی رہنما ہمیشہ ایک دوسرے کے حریف رہے ہیں مگر "ریڈنگ روم" کے ساتھ تعلق رکھنے والے نوجوانوں کی کوششوں سے اس زمانہ میں ان دونوں نے بھی مسلمانوں کی جدوجہد میں ان کی ہمنوائی پر اتفاق کر لیا تھا۔ اسی زمانہ میں جموں میں چند اور بھی ایسے واقعات پیش آئے جنھیں مذہب میں مداخلت کا نام دیا گیا اور جنھوں نے جلتی ہوئی آگ پر تیل کا کام کیا اور ان واقعات کی مذمت کرنے کے لئے سری نگر کی جامع مسجد میں ایک جلسہ منعقد ہوا جس کے خاتمہ پر حاضرین نے جلوس کی شکل میں شہر کا گشت کیا جس کے پیشِ نظر ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے جو جامع مسجد کی مجلسِ تعمیر کا صدر بھی تھا صدر کی حیثیت سے جامع مسجد میں اجازت حاصل کئے بغیر سیاسی تقریریں کرنے کی ممانعت کر دی لیکن "ریڈنگ روم" سے تعلق رکھنے والے نوجوانوں

نے اس حکم کی خلاف ورزی کرنے کا فیصلہ کر کے دوسرے دن درگاہ حضرت بل شریف میں ایک بہت بڑا جلسہ منعقد کیا جس میں پچاس ہزار مسلمان شریک ہوئے تھے اور چونکہ اس روز جمعہ بھی تھا اس لئے یہ سب 'ریڈنگ روم' گروہ کی رہنمائی میں جامع مسجد گئے اور وہاں جلسہ منعقد کر کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے حکم کی خلاف ورزی کے مرتکب ہوئے۔

جموں میں پیش آنے والے جن واقعات کو مذہب میں مداخلت کے نام سے موسوم کیا گیا تھا ان کی تحقیقات کے لئے ریاستی کابینہ کے رکن مسٹر ویکفیلڈ جموں گئے تھے اور وہاں انھوں نے مسلمانوں کی شکایات سن کر یہ مشورہ دیا تھا کہ جموں اور کشمیر کے مسلمانوں کے ایک مشترکہ وفد کو سری نگر آ کر حکومت سے گفت وشنید کرنی چاہیئے۔ اس مشورہ کے مطابق مجوزہ وفد کے کشمیری اراکین کے انتخاب کے لئے ۲۱۔ جون ۱۹۳۱ء کو خانقاہ معلی میں ایک عام جلسہ منعقد کیا گیا جس میں ہر خیال کے مسلمان شریک ہوئے لیکن اراکین وفد کے انتخاب کے بعد جب رہنما جلسہ سے جا چکے تھے سرحد کے ایک باشندہ عبدالقادر نے جو ایک یورپین کے خانساماں کی حیثیت سے سری نگر آیا ہوا تھا ایک اشتعال انگیز تقریر کی اور اس تقریر کی بنا پر ۲۵۔ جون کو اسے گرفتار کر لیا گیا اور جب جولائی کے پہلے ہفتہ میں عبدالقادر کا مقدمہ شروع ہوا تو اس کے ساتھ مسلمانوں کی عام ہمدردی اور راستہ پر ان کے اجتماعات کے پیش نظر اس بات کا اندیشہ پیدا ہو گیا کہ وہ عبدالقادر کو پولیس کے قبضہ سے نکالنے سے بھی گریز نہ کریں گے۔ اس اندیشہ کی بنا پر خفیہ طریقہ سے یہ ہدایت جاری کی گئی کہ عبدالقادر کے مقدمہ کی سماعت جیل میں کی جائے۔ لیکن یہ ہدایت خفیہ نہیں رہ سکی۔ مسلمانوں کی ایک بہت بڑی تعداد جیل کے سامنے جمع ہو گئی اور ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے حکم سے اس مجمع کے بعض رہنماؤں کو گرفتار کر لیا گیا اور اس طرح حکومت اور مسلمانوں کے درمیان وہ خونیں تصادم برپا ہوا جس میں پولیس کی گولیوں سے ۲۱۔ آدمی ہلاک ہوئے۔ یہ تصادم ۱۳۔ جولائی کو واقع ہوا تھا۔ اسی لئے جولائی کی یہ تاریخ کشمیر کی سیاسی تاریخ میں بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہے اور

کشمیر نیشنل کانفرنس کی طرف سے اسے "قومی تہوار" کی حیثیت دی گئی ہے۔ بہر حال اس حادثہ کے بعد مسلمانوں کے تقریباً تمام رہنماؤں کو گرفتار کر لیا گیا لیکن ان باتوں کے باوجود عوام خوفزدہ نہیں ہوئے اور وہ ہڑتالوں، جلوسوں اور جلسوں کی شکل میں اپنی بے اطمینانی کا مظاہرہ کرتے رہے اور حکام کے خلاف اظہارِ ناراضگی کا یہ سلسلہ کشمیر کے ہر گوشہ میں پھیل گیا۔

دوسرے ہی دن مہاراجہ نے اپنے ایک فرمان کے ذریعہ ۱۳ جولائی کے حادثہ کی تحقیقات کے لئے ایک کمیٹی مقرر کی اور اس میں غیر سرکاری رکن کی حیثیت سے ایک مسلمان کو بھی شامل کرنا چاہا لیکن کوئی مسلمان اس کمیٹی میں شرکت پر رضامند نہیں ہوا۔ یہ کمیٹی ریاست کے چیف جسٹس سر برجور دلال کی قیادت میں قائم کی گئی تھی اور اسی لئے دلال کمیٹی کے نام سے مشہور ہے۔ اس کمیٹی نے اپنی رپورٹ میں اس بات کا اعتراف کیا تھا کہ ریاست کے باشندوں کا سیاسی شعور بیدار ہوتا جا رہا ہے اور اس کی تحقیقات سے معلوم ہوا تھا کہ کابینہ کے دو رکن مسٹر ویکفیلڈ اور مسٹر ٹل اپنے طرزِ عمل سے فرقہ پرست عناصر کی ہمت افزائی کرتے رہے ہیں چنانچہ جولائی کے اواخر میں ان دونوں کو اپنے عہدوں سے مستعفی ہو جانا پڑا۔ جولائی کے آخری ہفتہ میں حالات کی نزاکت کے پیشِ نظر مہاراجہ نے راجہ ہری کشن کول کو اپنا وزیرِ حضور مقرر کیا تھا جو بعد میں ریاست کے وزیرِ اعظم بنا دیئے گئے تھے اور انھوں نے حالات کو سازگار بنانے کے لئے اس امر کا وعدہ لینے کے بعد کہ وہ فرقہ وارانہ جذبات کو مشتعل کرنے والی تقریریں نہیں کریں گے جولائی کے اواخر میں مسلم رہنماؤں کو چھوڑ دیا تھا۔ لیکن اپنے رہنماؤں کی رہائی کے بعد مسلمان اجتماعی جدوجہد کی قوت کو بھی محسوس کرنے لگے تھے۔

جولائی ۱۹۳۱ء میں پیش آنے والے واقعات کے بعد ریاستی عوام کی سیاسی بیداری نے ایک مستقل حیثیت حاصل کر لی تھی اور اگرچہ اس بیداری کا مظاہرہ فرقہ وارانہ ہی کی صورت میں ہو رہا تھا لیکن اس کی یہی شکل دوسرے فرقوں کی بیداری کا موجب بھی بنتی جا رہی تھی۔ یہاں ۱۳ جولائی کے بعد کے واقعات کی تفصیل بیان کرنا ممکن نہیں مگر اس قدر ضرور سمجھ لینا چاہیئے کہ

اگست میں مسلمانوں کے ایک وفد نے مہاراجہ سے مل کر ان کی خدمت میں ایک یادداشت پیش کی جس میں ۱۳۔ جولائی کے ہنگامے کے اسباب و علل بیان کرنے کے علاوہ یہ شکایت بھی کی گئی تھی کہ دلال کمیٹی کی رپورٹ واقعات کی صحیح تحقیقات پر مبنی نہیں اور اس بات کا مطالبہ کیا گیا تھا کہ راجہ ہری کشن کول کو ان کے عہدے سے برطرف کر دیا جائے لیکن مہاراجہ نے اس مطالبہ کو منظور کرنے سے انکار کر دیا۔ دوسری طرف ۱۳ جولائی کے ہنگامہ کے بعد پنجاب میں 'کشمیر کمیٹی' کے نام سے ایک جماعت قائم کر لی گئی تھی۔ یہ کمیٹی حالات کے مطالعہ کے لئے اپنا ایک وفد کشمیر بھیجنا چاہتی تھی لیکن اس کی یہ درخواست مسترد کر دی گئی تھی اور اس نے ۱۴۔ اگست کو 'آل انڈیا کشمیر ڈے' منانے کا اعلان کیا تھا۔ اور اس دن کو کشمیر میں بھی منایا گیا تھا۔ اس طرح مسلمانوں میں بے چینی بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ ان ہی ایام میں مولانا ابوالکلام آزاد اور سر تیج بہادر سپرو کشمیر گئے تھے۔ مولانا آزاد نے کشمیر کے مسلم رہنماؤں کو فرقہ وارانہ زاویۂ نظر ترک کر دینے کا مشورہ دیا اور مسٹر سپرو نے حکومت کو اس امر پر توجہ دلائی کہ اسے کشادہ دلی ہونا اور عوام کی شکایات پر ہمدردانہ زاویۂ نظر سے غور کرنا چاہیئے اور اس مشورہ کے نتیجہ میں فریقین کے درمیان ۲۶۔ اگست کو ایک سمجھوتہ ہو گیا۔ یہ سمجھوتہ 'عارضی صلح' کے نام سے مشہور ہے اور اس کے ماتحت ایک طرف تو مسلمان رہنماؤں نے یہ وعدہ کیا تھا کہ وہ تحریک کو بالکل بند کر دیں گے، حکومت اور دوسرے فرقوں کے خلاف اشتعال انگیزی نہیں کریں گے اور اپنے داخلی معاملات کو بیرونی اثرات سے پاک رکھیں گے۔ اور دوسری طرف حکومت نے اس امر کا یقین دلایا تھا کہ اس نے اس تحریک کو دبانے کے لئے جو سخت قانونی اقدامات کئے ہیں وہ انھیں واپس لے لے گی، ملزمین کو ضمانت پر رہا کر دیا جائے گا۔ اور جن افسروں کو اس تحریک سے تعلق رکھنے کے الزام میں برخاست یا معطل کیا گیا ہے ان کے معاملات پر۔

منظرنانی کی جائے گی۔ مگر یہ عارضی صلح کشمیری عوام کو مطمئن نہیں کرسکی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ عوام افلاس اور بے روزگاری سے تنگ آکر حکومت کے مقابلے کے لئے میدان میں آئے تھے اور اس حکومت کو ختم کر دینا چاہتے تھے اور جہاں تک اس سمجھوتے کا تعلق تھا اس میں ان کے حصولِ مقصد کی کوئی گنجائش موجود نہیں تھی۔

عارضی صلح کے اس کھوکھلے پن کے باوجود اگر حکومت اس پر عمل درآمد کرسکتی تو کچھ مدت کے لئے عوامی جدوجہد کا ملتوی ہوجانا ممکن ہوسکتا تھا لیکن وہ اس میں بھی تساہل سے کام لیتی رہی حتیٰ کہ مسلمانوں کی طرف سے حکومت کے اس رویہ کے خلاف پھر جلسے ہونے لگے اور ان ہی حالات میں ۲۱۔ستمبر کو بعض مسلم رہنماؤں کو ازسرِنو گرفتار کرلیا گیا۔ دوسرے روز جب مسلمان جامع مسجد سے ایک احتجاجی جلوس نکالنا چاہتے تھے ان پر گولی چلائی گئی جس سے تین افراد ہلاک اور متعدد زخمی ہوگئے اور شہر کے ایک دوسرے حصے میں بھی یہی واقعہ پیش آیا۔ ۲۳۔ستمبر کو کم و بیش پچاس ہزار مسلمان، جامع مسجد میں ان لوگوں کی تدفین کے لئے جمع ہوئے جو پولیس کی گولیوں سے ہلاک ہوئے تھے لیکن حکام نے انہیں جامع مسجد سے نکلنے کی اجازت نہیں دی اور جب دوپہر کو وزیر اعظم کی ہدایت کے مطابق ان مسلمانوں کو جلوس نکالنے کی اجازت دی گئی تو وہ مرحومین کی تدفین کے بعد پُرامن طریقے پر منتشر ہوگئے۔ اسی شب کو بخشی غلام محمد اور چند دیگر رہنماؤں کو بھی گرفتار کرلیا گیا۔

کشمیر کی تاریخ میں ۲۴۔ستمبر ۱۹۳۱ء کو ایک خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ اس تاریخ کو پہلی بار کشمیر کی جدوجہد اپنی حقیقی شکل میں ظاہر ہوئی تھی اور اسی تاریخ کو کشمیر کے عوام اور انقلابی طبقوں نیز قوم پرست اور فرقہ پرست عناصر کے درمیان ایک امتیازی خط قائم ہوا تھا۔ ۲۴۔ستمبر کو کشمیر کے ہزاروں باشندوں نے لاٹھیوں اور تلواروں وغیرہ سے مسلح ہوکر سری نگر میں ایک تاریخی مظاہرہ کیا تھا اور پولیس کو اپنی قیام گاہ سے نکلنے کی جرأت تک نہ ہوسکی

تھی۔ لیکن اس روز پورے سری نگر میں فرقہ وارانہ نوعیت کا کوئی ایک واقعہ بھی پیش نہ آیا تھا۔ اس کے برعکس ایسی شہادتیں موجود ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ مسلمانوں نے ہندو خواتین کی حفاظت کی تھی اور اس طرح یہ بات ثابت کردی تھی کہ ان کی جدوجہد نظامِ حکومت کے خلاف ہے کسی فرقہ کے خلاف نہیں۔ اس وقت تک اعلیٰ طبقے کے مسلمان مسلمانوں کی سیاسی بیداری کو اپنے مفادات حاصل کرنے کی غرض سے حکومت پر دباؤ ڈالنے کے لئے استعمال کرتے تھے لیکن ۲۴ ستمبر کو جب انھیں اندازہ ہوا کہ اب عوام خود اپنے مفادات کو سمجھنے لگے ہیں تو اسی روز اس طبقہ کے نمائندوں نے مہاراجہ کو اس امر کا یقین دلانا ضروری سمجھا کہ وہ عوام کی اس تحریک سے بے تعلق اور حکومت کے وفادار ہیں۔ دوسرے ہی دن حکومت نے ایک آرڈی نینس نافذ کرکے سری نگر کو فوج کے زیر انتظام دے دیا۔ سری نگر میں فوجی حکومت کے زمانہ میں وہاں کے باشندوں کو جن مصائب اور دقتوں کا سامنا کرنا پڑا انھیں بیان کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی لیکن مختصراً اس قدر سمجھ لینا چاہیئے کہ یہ دور سری نگر کے باشندوں کے لئے سخت ترین آزمائش کا دور تھا لیکن انھوں نے اس دور میں غیر معمولی صبر، استقامت اور قوتِ برداشت کا ثبوت دیا تھا۔ ان ہی دنوں میں شوپیاں میں بھی فوجی حکومت قائم کردی گئی تھی لیکن وادی کے باشندوں کے جذبات کو دبایا نہیں جاسکا تھا۔

پانچ اکتوبر کو مہاراجہ نے اپنے یوم پیدائش کی تقریب پر سری نگر میں دربار منعقد کرکے آرڈی نینس کو فوراً واپس لینے، دوسرے سخت قوانین کو جلد از جلد منسوخ کردینے، سری نگر سے فوجی حکومت ختم کردئے جانے، سیاسی نظربندوں کو رہا کردینے اور زیر سماعت مقدمات واپس لینے کا اعلان کیا۔ ۱۹ اکتوبر کو گذشتہ ہنگاموں کے اسباب وعلل کی تحقیقات کے لئے ایک کمیٹی مقرر کی گئی لیکن ۱۰ نومبر کو اس کمیٹی کا کام حکومتِ ہند کے ایک افسر مسٹر مڈلٹن کے سپرد کردیا گیا۔ مسٹر مڈلٹن کی رپورٹ کشمیر کے اس دور کے سیاسی حالات کے بعض دلچسپ اور اہم گوشوں پر روشنی ڈالتی

ہے اور اس حقیقت کا اظہار ہوتا ہے کہ اس جدوجہد کے بعض رہنما ۱۹۳۱ء ہی سے اس کے فرقہ وارانہ کردار کے مخالف تھے اور وہ اس میں غیر مسلموں کو شرکت کی دعوت دیتے رہتے تھے لیکن ایک طرف تو اس وقت خود اُن کی آواز کمزور تھی اور اس تحریک پر اعلیٰ طبقہ کے مسلمانوں کا اثر تھا اور دوسری طرف دوسرے فرقوں کے اعلیٰ طبقوں کے رہنما بھی اپنے عوام کو اس تحریک میں شامل ہوتا ہوا دیکھنا نہیں چاہتے تھے اس لئے اس وقت یہ تحریک عوامی تحریک نہیں بن سکی تھی۔

وادی میں جو واقعات پیش آرہے تھے۔ صوبہ جموں اور پنجاب میں بھی اس کا ردّعمل محسوس کیا جارہا تھا۔ جموں میں سرکاری مال گذاری ادا نہ کرنے کی تحریک شروع کر دی گئی تھی لیکن قانون شکنی کے طریقوں سے ناواقف اور جاہل کسانوں کے طرزِ عمل کی بدولت اس نے بھی فرقہ واریت کی صورت اختیار کر لی تھی۔ دوسری طرف مجلس احرار نے ستمبر سے اپنے رضاکار ریاست میں بھیجنے شروع کردئے تھے اور ۲۔ نومبر تک کم و بیش پانچ ہزار احراری رضاکار گرفتار کئے جاچکے تھے۔ ان حالات میں حکومت نے ۲۔ نومبر کو جموں کا انتظام بھی فوج کے حوالہ کر دیا۔ دوسرے دن فوج نے گولی چلائی اور ۵۰ مسلمان اور ہندو زخمی اور ۲ ہلاک ہوئے۔ ان حالات میں ریاست کی حکومت نے حکومتِ ہند سے امداد کی درخواست کی۔ چنانچہ ۵۔ نومبر کو برطانوی فوج نے شہر کا انتظام اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور چند روز کے بعد وائسرائے نے ایک آرڈی نینس نافذ کر کے ریاست میں احراری رضاکاروں کے داخلہ کو ممنوع قرار دے دیا۔ لیکن ان واقعات سے جموں کا پورا صوبہ متاثر ہو چکا تھا۔

۱۹۳۲ء کے آغاز میں وادی میں دوبارہ ہنگامے برپا ہوئے اور حکومت نے دوبارہ آرڈی نینس نافذ کر کے اس کے ماتحت بعض رہنماؤں کو گرفتار کر لیا اور جب حکومت کے اس اقدام کے خلاف ہڑتالوں جلسوں اور جلوسوں کی شکل میں مظاہرے کئے گئے تو صدہا افراد

کو گرفتار کر لیا گیا اور بعض مقامات پر گولیاں بھی چلائی گئیں لیکن موسم سرما کی شدت کے باعث احتجاج اور تشدد کا یہ سلسلہ زیادہ دنوں تک جاری نہ رہ سکا۔

۱۹۳۱ء میں مہاراجہ نے سیاسی اسیروں کے لئے عفو عام کا اعلان کرتے ہوئے اس بات کی یقین دہانی بھی کی تھی کہ وہ رعایا کے ہر طبقہ کی شکایات کو سننے اور ان پر ہمدردانہ غور کرنے کے لئے تیار ہیں۔ اس یقین دہانی کی بنیاد پر ریاستی باشندوں کے مختلف فرقوں نے اپنی شکایات اور اپنے مطالبات پر مشتمل عرضداشتیں مرتب کر کے مہاراجہ کی خدمت میں پیش کی تھیں۔ سکھوں نے مطالبہ کیا تھا کہ انھیں انتظامی اور فوجی ملازمتوں میں ۳۰ فی صدی حصہ دیا جائے اور ایک سکھ وزیر کو کابینہ میں شامل کیا جائے، اور کشمیر کے سکھ شہری اپنی تعداد کے لحاظ سے ملازمتوں کے مطلوبہ تناسب کو پورا نہ کر سکیں تو اُسے ریاست کے باہر کے سکھوں سے پورا کیا جائے۔ کشمیری پنڈتوں نے ریاست کی سیاست کو فرقہ واریت کے اثر سے پاک رکھنے کی شرط پر دستوری حکومت کے قیام کا مطالبہ کیا تھا اور ملازمتوں کے سلسلہ میں کسی قسم کی رعایت کے بغیر اہلیت کی بنا پر انتخاب کا مشورہ دیا تھا۔ راجپوتوں نے تمام حالات کی ذمہ داری حکومت کی کمزوری پر عاید کی تھی اور اس توقع کا اظہار کیا تھا کہ وہ آئندہ ایسے واقعات کو روکنے کے لئے سخت اقدامات کرے گی۔ اور مسلمانوں نے اپنی عرضداشت میں دستوری حکومت کے قیام اور مذہبی معاملات نیز اخبارات، اجتماعات، تقریر، تحریر اور ریاست کے تمام باشندوں کو مساوی شہری حقوق دئے جانے کا مطالبہ کیا تھا اور ملازمتوں میں مسلمانوں کے لئے ۸۰ فیصد اسامیاں مخصوص کر دئے جانے پر زور دیا تھا۔ اور اس تناسب کو قائم رکھنے کے لئے انھوں نے بھی حسب ضرورت غیر ریاستی مسلمانوں کو ملازمتوں میں لئے جانے کی تجویز پیش کی تھی — ہندوؤں کے ایک طبقہ نے بھی اسی قسم کا مطالبہ کیا تھا۔ اسی عرضداشت میں پہلی بار یہ مطالبہ کیا گیا تھا کہ مہاراجہ بہادر کو اپنے ذاتی مصارف کے لئے ریاست کی مجموعی آمدنی میں سے چند فیصد حصہ

مخصوص کر لینا چاہیئے۔ ان عرضداشتوں پر غور کرنے کے لئے مہاراجہ نے سر بی۔ جی گلنسی کی سرکردگی میں ایک کمیشن مقرر کیا تھا جو 'گلنسی کمیشن' کہلاتا ہے۔ اس کمیشن کی رپورٹ کی بنا پر ریاست کے بہت سے ضوابط میں ترمیم کر دی گئی۔

کشمیر کے باشندوں کی سیاسی بیداری کا آغاز ۱۹۳۱ء کے وسط میں ہوا تھا اور اگرچہ اس وقت اس نے پورے طور پر فرقہ وارانہ رنگ اختیار نہیں کیا تھا لیکن ۱۳۔ جولائی کو حکومت کے ساتھ جو تصادم ہوا تھا اس میں مسلمان ایک فریق کی حیثیت رکھتے تھے اس لئے ایک جانب تو حکومت اس بیداری کو فرقہ پرستی کی راہ پر ڈال کر اسے آسانی کے ساتھ کچل سکتی تھی اور دوسری طرف مسلمانوں کے اعلیٰ طبقے اسے اپنے فائدے کے لئے استعمال کر سکتے تھے اور انہیں دونوں عناصر نے اس بیداری کو فرقہ واریت کی شکل دے دی تھی لیکن مڈل ٹن رپورٹ میں اس امر کا اعتراف کیا گیا ہے کہ ــــ مسلمانوں کا یہ دعویٰ کہ ان کی تحریک فرقہ وارانہ نہیں تھی تحریک کی ابتدائی منزلوں کے متعلق بالکل درست ہے ــــ لیکن ۱۹۳۱ء کے ختم ہونے سے پہلے ہی مسلم رہنماؤں کا ایک گروہ، حکومت اور اعلیٰ طبقہ کے مسلمانوں کے اس نظریے کو اچھی طرح سمجھ گیا۔ یہ گروہ اس وقت کے تنگ حالات میں بھی مسلمانوں کی اس بیداری کو اقتصادی اور معاشی مسائل حل کرانے کے لئے استعمال کرنا چاہتا تھا اور اسی لئے مسلم لیڈرشپ دو گروہوں میں منقسم ہو گئی تھی۔

۱۹۳۲ء میں گلنسی کمیشن کی رپورٹ کی اشاعت کے بعد ریاست کے اعلیٰ طبقوں کے مسلمانوں نے محسوس کیا کہ انھیں ریاستی مسلمانوں کی ایک تنظیم قائم کر کے بدلتے ہوئے حالات میں اپنی لیڈرشپ کو قائم رکھنا اور نئے حالات سے پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہیئے۔ اسی نظریے کے تحت ۱۹۳۲ء میں 'آل جموں اینڈ کشمیر مسلم کانفرنس' کا قیام عمل میں آیا۔ لیکن اس تنظیم کی پوری تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ۱۹۳۸ء تک اعلیٰ اور اوسط طبقوں کے مسلمانوں ہی کے مفادات کے حصول کا ذریعہ بنی رہی تھی اور مسلمان عوام بھی کسی نہ کسی حد تک اس حقیقت

کو سمجھنے لگے تھے۔ اس کے باوجود ابھی وہ اعلیٰ طبقہ کے مسلمانوں کی گرفت سے نکلنے میں کامیاب نہیں ہوئے تھے۔ اس زمانہ میں 'جموں اینڈ کشمیر مسلم کانفرنس' کو اس بات کی شکایت تھی کہ گلنسی کمیشن نے سرکاری ملازمتوں میں مختلف فرقوں کی نمائندگی کی جو سفارشات کی ہیں ان پر صحیح طریقے سے عمل نہیں کیا جاتا۔ اس معاملہ پر ۱۹۳۳ء کے اواخر میں سری نگر میں مسلمانوں کی طرف سے کسی قدر بے چینی کا اظہار ہوا لیکن وہ وزیر اعظم اور وزیر داخلہ کی مداخلت کی بدولت بہت جلد ختم ہوگیا۔ جنوری میں سری نگر میں 'ینگ مینز ایسوسی ایشن' کا قیام عمل میں آیا اور اس کی طرف سے سری نگر کے حکام کو تبدیل کر دینے کا مطالبہ کیا گیا مگر حکومت نے نہ صرف اس مطالبے ہی کو مسترد کر دیا بلکہ بعض رہنماؤں کو گرفتار کر کے جلا وطن بھی کر دیا گیا جس کی وجہ سے وادی میں ازسرنو بہت سے ناخوش گوار واقعات پیش آئے۔ ان حالات کے پیش نظر مسلم کانفرنس کی ورکنگ کمیٹی نے سیالکوٹ میں اپنا اجلاس منعقد کر کے کانفرنس کا آئین معطل کر دیا اور مسلمانوں کے مطالبات منظور کرانے کے سلسلے میں ضروری اقدامات کرنے کا اختیار اپنے صدر چودھری غلام عباس کو دے دیا۔

یہاں اس بات کو بھی سمجھ لینا چاہیئے کہ اگر ایک جانب مسلمانوں میں 'آل جموں اینڈ کشمیر مسلم کانفرنس' موجود تھی تو دوسری طرف ہندوؤں میں یووک سبھا اور ڈوگرہ راجپوتوں میں ڈوگرہ سبھا ایسی جماعتیں بھی موجود تھیں اور یہ سب جماعتیں اپنے اپنے فرقوں کے اعلیٰ اور متوسط طبقوں کے مفادات کے لئے جدوجہد کر رہی تھیں۔ پھر جہاں تک مسلم کانفرنس کا تعلق تھا اس میں مسلم رہنماؤں کا وہ گروہ بھی شامل تھا جو ابتدا ہی سے معاملات کو غیر فرقہ وارانہ زاویۂ نظر سے دیکھتا تھا۔ چناں چہ ان رہنماؤں کی تقریروں میں اس بات کی یقین دہانی کی جاتی رہی تھی کہ کشمیر کی تحریک فرقہ وارانہ نہیں بلکہ کشمیر کے تمام باشندوں کی شکایات کو دور کرانے کے مقصد پر مبنی ہے اور ہم دوسرے فرقوں کے حقوق کے تحفظ میں ان کی امداد بھی کرنا چاہتے ہیں —

اور اس قسم کے خیالات دونوں فرقوں کے عوام کو حقیقت حال سمجھنے میں مدد دے رہے تھے۔ پھر ۱۹۳۲ء میں پنڈت جواہر لال نہرو کی قیادت میں، ریاستی عوام کی تنظیم، اسٹیٹس پیپلز کانفرنس، کا قیام بھی عمل میں آیا تھا۔ اس انجمن کے کارکنوں کی اکثریت ہندوؤں پر مشتمل تھی اس کے باوجود یہ انجمن جموں اور کشمیر کے عوام کے مطالبات کی جن کی اکثریت مسلمان تھی، تائید کرتی تھی اور انڈین نیشنل کانگریس بھی ہر موقع پر ان مطالبات کی حمایت میں آواز بلند کرتی رہتی تھی اس سے غیر فرقہ پرست مسلمان رہنماؤں کے علاوہ جو ابتدا ہی سے پنڈت جواہر لال نہرو کے خلوص اور اعلیٰ خیالات سے متاثر تھے عام مسلمان بھی ان تمام باتوں سے متاثر ہو کر فرقہ پرستانہ نظریہ کو ترک کرنے لگے تھے اور اسی لئے جب ۱۹۳۴ء میں چودھری غلام عباس نے قانون شکنی کی تحریک شروع کی اور انہیں اور ان کے چند رفقاء کو گرفتار کر لیا گیا تو مسلمانوں کی طرف سے کسی قابل ذکر جوش کا اظہار نہیں کیا گیا اور انہیں حالات میں ۱۹۳۴ء میں کانفرنس کی ورکنگ کمیٹی نے ریاست کے ہندوؤں اور مسلمانوں کو متحد کرنے کے وسائل دریافت کرنے کی غرض سے ایک سب کمیٹی بھی مقرر کی تھی۔

مسلمانوں کے نظریہ کو تبدیل کرنے میں اس بات نے بھی بہت زیادہ کام کیا تھا کہ ابتدا ہی سے انہیں بتایا جاتا رہا تھا کہ ان کی تمام تر مصیبتوں کا سبب حکومت میں غیر مسلم حکام اور اہلکاروں کی موجودگی ہے۔ لیکن جب گلینسی کمیشن کی سفارشات کی بنا پر مسلمان ملازمتوں میں لئے جانے لگے اور ان میں سے بہت سے اعلیٰ عہدوں پر بھی مامور ہو گئے، اور عام مسلمانوں کی مشکلات میں کوئی کمی رونما نہیں ہوئی تو وہ محسوس کرنے لگے کہ اصلاح حالات کا صحیح طریقہ فرقہ وارانہ مطالبات کو تسلیم کرانا نہیں بلکہ نظام حکومت کی بنیادی خرابیوں کو دور کرنا ہے۔ پھر جب ۱۹۳۴ء میں ریاست کی پہلی مجلس قانون ساز قائم ہوئی اور چند روز کے بعد یہ بات واضح ہو گئی کہ یہ مجلس بھی مہاراجہ کی مرضی کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھا سکتی اور جب تک ریاست میں ایسا نظام حکومت

قائم نہیں ہوگا جو عوام کے روبرو جواب دہ ہو۔ اس وقت تک عوام کی حالت درست نہیں ہوسکتی تو کانفرنس کی لیڈرشپ کے غیر فرقہ پرست گروہ کو تقویت حاصل ہونے لگی اور وہ کشمیر کے مسلمانوں کی اس تحریک کو متحدہ عوامی تحریک بنا دینے کی کوششوں میں معروف ہوگیا۔

دوسری طرف ریاست کے ان عام حالات سے ہندو عوام بھی کچھ کم متاثر نہیں تھے اور ان کے سامنے بھی کم وبیش وہی عام مشکلات موجود تھیں جن سے مسلمانوں کو گزرنا پڑ رہا تھا۔ پھر ان میں شروع ہی سے ایک ایسا قابلِ ذکر گروہ موجود رہا تھا جو مسلمانوں کی بہت سی شکایات کو جائز سمجھتا اور ان کے ساتھ ہمدردی رکھتا تھا۔ مگر چونکہ مسلمانوں کی تحریک پر فرقہ پرست عناصر چھائے ہوئے تھے حتیٰ کہ اس پوری مدت میں ترقی پسند اور غیر فرقہ پرست مسلمان رہنما بھی حالات پر قابو پانے میں بھی کامیاب نہیں ہوسکے تھے اس لئے ہندو عوام اور خصوصاً ہندوؤں کا یہ وسیع النظر اور صاف ذہن طبقہ بھی خاموشی اختیار کرنے پر مجبور رہا تھا لیکن اب جبکہ حالات کا رُخ بدلتا جارہا تھا ہندو بھی پیچھے نہیں رہ سکتے تھے۔ پھر ریاستی اسمبلی کے بعض غیر مسلم اراکین عوام کے حقوق کے تحفظ کے معاملے میں بسا اوقات کانفرنس کے نمائندوں سے بھی پیش پیش رہتے تھے۔ حتیٰ کہ ایک مرتبہ چراگاہوں کے ٹیکس کے سوال پر جب اسمبلی کے ایک غیر مسلم رکن نے استعفیٰ دے دیا تو کانفرنس کے تمام نمائندوں کو بھی مستعفی ہوجانا پڑا تھا اور ۱۹۳۶ء میں ایک ممبر کے علاوہ اسمبلی کے تمام ہندو، مسلمان اور سکھ اراکین مختلف سوالات پر برابر واک آؤٹ کرتے رہے یہاں تک کہ انھوں نے بجٹ پر بحث میں حصہ لینے سے بھی انکار کردیا۔ اس طرح عوام میں مشترکہ اقدام کا جذبہ ترقی کرنے لگا اور جب ۸ مئی ۱۹۳۶ء کو مسلم کانفرنس کی طرف سے 'ذمہ دار حکومت کے مطالبہ کا دن' منایا گیا تو ریاست کے ہر گوشہ میں نہ صرف جلسے ہی منعقد ہوئے بلکہ انھیں کامیاب بنانے میں ہندوؤں اور سکھوں نے بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

اب ریاست جموں اور کشمیر کے باشندوں کی رواداری، دور اندیشی اور قومی یکجہتی کی روح بیدار ہو چکی تھی اور عوام اپنے اور اعلیٰ طبقوں کے مفادات میں امتیاز کرنے لگے تھے اس لئے ۱۹۳۶ء میں ایک ایسی قومی تنظیم کے قیام کا سوال پیدا ہوا جو کشمیری قوم کے مفادات کا تحفظ اور اس کی قومی خواہشات کی نمائندگی کر سکے اور ایسی تنظیم کا آئین ہندوستان کی قومی تنظیم 'انڈین نیشنل کانگریس' کے آئین ہی کے خطوط پر مرتب کیا جا سکتا تھا۔

یہاں اس حقیقت کو بھی ذہن نشین کر لینا چاہیئے کہ فرقہ پرستی اور اغراض پروری کے گذشتہ دور میں بھی کشمیری قوم پرور طاقتیں برابر موجود رہی تھیں۔ لیکن حالات ان کی ترقی کی راہ میں حائل تھے۔ مگر اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان صحت مند طاقتوں نے بھی کشمیر کے روایتی قومی اتحاد کو واپس لانے میں نمایاں کردار ادا کیا تھا۔ مثلاً بعض نوجوانوں نے ۱۹۳۳ء میں کشمیر نیشنل کانفرنس کے قیام کی غرض سے ایک عارضی مجلس قائم کی تھی لیکن حالات کی ناسازگاری نے اس تحریک کو آگے بڑھنے کا موقع نہیں دیا تھا۔ پھر ۱۹۳۶ء میں 'کشمیری یوتھ لیگ' کے نام سے ایک اور جماعت قائم ہوئی جس کے مقاصد میں وطن کی خدمت کے لئے ہر مذہب اور ملت کے نوجوانوں کو منظم کرنا، ریاست میں ذمہ دار حکومت کے قیام کی جد و جہد اور عوام کے اقتصادی، سماجی اور ثقافتی معیار کو بلند کرنا شامل تھا اس کے بعد ۱۹۳۶ء ہی میں کشمیر میں کانگریس کمیٹیاں بھی قائم کی گئی تھیں۔ اسی سال 'کشمیر یوتھ اسٹوڈنٹ کانفرنس' بھی منعقد ہوئی تھی اور ۱۹۳۷ء میں 'مزدور اور کسان سبھا' بھی عالم وجود میں آئی تھی۔

بہر حال ۱۹۳۸ء کے آغاز میں 'مسلم کانفرنس' کا جو اجلاس جموں میں منعقد ہوا، اس میں کانفرنس کے نام اور آئین کو تبدیل کر دینے کی قرارداد پیش کی گئی لیکن بعض اصطلاحی اعتراضات کی بنا پر اس وقت اس کام کو ملتوی کر دیا گیا۔ مگر جون کے اواخر میں کانفرنس

کی ورکنگ کمیٹی نے مسلم کانفرنس کو ایک ایسی تنظیم بنا دینے کا فیصلہ کر لیا جسے صحیح معنی
میں قومی تنظیم کہا جا سکتا تھا۔ اس اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے شیخ محمد عبداللہ نے کہا
تھا کہ ـــــ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ ہم سیاست میں ہندو اور مسلمان کے فرق کو
دخل نہ دیں اور دوسری بات یہ ہے کہ حق رائے دہندگی اور انتخابات دونوں مخلوط ہوں اور
ان دونوں باتوں کے بغیر جمہوریت بے معنی تصور ہے ـــ اس طرح ۱۹۳۹ء میں مسلم کانفرنس
"کشمیر نیشنل کانفرنس" میں تبدیل کر دی گئی۔ اس کے دروازے ہر فرقہ کے عوام کے لئے کھول
دئیے گئے اور یہ تنظیم آج بھی بدستور اپنے لائحہ عمل اور نصب العین پر قائم ہے۔

۱۹۴۰ء میں پنڈت جواہر لال نہرو نے سرحدی گاندھی خان عبدالغفار کے ساتھ کشمیر کا
کا دورہ کیا۔ پنڈت نہرو کا ہر جگہ پُر شاندار استقبال کیا گیا۔ ایسا کہ جو کشمیر کی تاریخ میں
کسی کو دیکھنا نصیب نہیں ہوا۔ پنڈت جی کی تقریروں سے ایک نئی جان پڑ گئی اور یہاں کے
عوام نے یہ محسوس کیا کہ ان کی مشکلات کو سارے ہندوستان کی اور ہندوستان کی سب سے
بڑی جماعت کانگریس کی حمایت حاصل ہے۔ اس کے بعد ہندوستان کی سیاست میں انفرادی
ستیہ گرہ اور سن بیالیس کے اندولن کی وجہ سے تمام لیڈر جیل چلے گئے۔ اگرچہ سن بیالیس
کا اندولن ریاستوں میں نہیں چلایا گیا تھا پھر بھی جگہ جگہ جلسے اور جلوس نکالے گئے۔ باقی
ہندوستان کے بہت سے کارکن یہاں آ کر رہے اور یہاں سے خفیہ طور پر تحریک چلاتے
رہے۔ ریاستی تحریک دھیرے دھیرے چلتی رہی۔ بالآخر ۱۹۴۴ء میں وزیر اعظم کاک کے
زمانے میں پرجا سبھا (قانون ساز اسمبلی) کے دو ممبران وزیر بنائے گئے۔

۱۹۴۴ء میں مسٹر محمد علی جناح بھی کشمیر آئے۔ نیشنل کانفرنس کی قیادت نے ایک معزز
ہندوستانی مہمان کی حیثیت سے ان کا استقبال کیا اور ان سے گفتگو میں ان کے فرقہ پرور
رجحانات کے خلاف مضبوط دلائل پیش کئے اور ان کو یہ صلاح دی کہ وہ کشمیر میں اپنی

فرقہ پرستانہ کارروائیوں کا آغاز نہ کریں لیکن مسٹر جناح نے مسلم کانفرنس کے کھلے اجلاس
میں نیشنل کانفرنس کو 'ٹھگوں کی جماعت' اور شیخ عبداللہ کو 'گنڈا' کہا۔ اس پر شیخ عبداللہ
کو غصہ آیا اور انھوں نے مسٹر جناح کو یہ چیلنج دیا کہ وہ کشمیر کے مسلمانوں سے اعتماد کا ووٹ
لیں۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ اگر نیشنل کانفرنس کے خلاف بیانات کا یہ اشتعال انگیز سلسلہ بند
نہیں ہوا تو وہ لیگی لیڈر کی حفاظت کے ذمہ دار نہیں ہیں۔ چناں چہ مسٹر جناح بارہ مولا میں
اسی طرح کی تقریر کرنے کھڑے ہوئے تو وہاں کے مسلمانوں نے ان پر پتھر برسائے۔ مسٹر جناح
کو زندگی بھر کشمیر کا یہ دورہ کبھی نہیں بھولا اور ان پہ یہ اچھی طرح واضح ہوگیا کہ کشمیر میں مسلم لیگ
کی دال نہیں گل سکتی اور ان پر یہ بھی روشن ہوگیا کہ کشمیر کی اصل جماعت نیشنل کانفرنس ہے اور
رجعت پسند میر واعظ یوسف شاہ کی مسلم کانفرنس ایک فریب سے زیادہ حیثیت نہیں
رکھتی۔ اسی لئے مسٹر جناح نے اسے 'سڑے انڈے' کا خطاب دیا تھا۔

۱۹۴۵ء میں پنڈت جواہر لال نہرو دوبارہ کشمیر کے دورے پر آئے۔ مولانا ابوالکلام آزاد
اور خان عبدالغفار خاں بھی ساتھ تھے ان کی موجودگی میں سوپور میں نیشنل کانفرنس کا عظیم الشان
اجلاس ہوا۔ اسی اجلاس میں 'نیا کشمیر' کا رزولیوشن پاس ہوا جس میں ریاستی عوام کی آئینی
اور اقتصادی منزل متعین کی گئی تھی۔ اسی اجلاس میں شیخ عبداللہ نے کہا تھا کہ "ہماری
قسمتیں اور ہماری آزادی ہندوستان کی آزادی سے بندھی ہوئی ہے۔" ۱۹۴۶ء میں کانفرنس
نے 'کشمیر چھوڑ دو' کا نعرہ لگایا۔ اس میں مکمل اختیارات کی مانگ کی گئی اور مہاراجہ سے کشمیر
چھوڑنے کو کہا گیا۔ ظاہر ہے کہ مہاراجہ بھی کشمیری تھے۔ ذمہ دار حکومت کے قیام کی مانگ تو
بامعنی تھی لیکن مہاراجہ کے کشمیر سے جانے کی مانگ کا کوئی مفہوم نہیں تھا۔ اس غلطی کا احساس
شیخ کو بعد میں ہوا اور انھوں نے دورانِ مقدمہ میں اپنی صفائی میں یہ صاف اعلان کیا کہ وہ
مہاراجہ کے خلاف نہیں ہیں بلکہ انھیں کے زیر سایہ حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں۔ وہ

کشمیر کو کشمیریوں کے حوالے کر دیں۔ اس تحریک کا فیصلہ یکایک کیا گیا۔ لیکن تحریک چل پڑی پھر بھی تحریک کا آغاز جس انداز سے ہوا اس سے کچھ غلط فہمیاں بھی پیدا ہوگئیں اور ۱۸۔ مئی ۱۹۴۶ء کو امیرا کدل میں تھوڑا سا فساد بھی ہوگیا۔ اس کے بعد آگے کا پروگرام ملتوی کیا گیا۔ شیخ عبداللہ پنڈت جواہرلال نہرو سے مشورے کی غرض سے دلی کے لیے روانہ ہوئے لیکن وہ راستے ہی میں گرفتار کر لیے گئے۔ اس کے بعد دوسرے دن کانفرنس کے تقریباً ۳۰۰ لیڈر گرفتار کیے گئے۔ اس کے بعد مظاہرے ہوئے اور پولیس اور فوج نے لاٹھی چارج کیا۔ دو ایک جگہ فائرنگ بھی ہوئی جس میں کئی افراد ہلاک اور متعدد اشخاص زخمی ہوئے۔ پریم ناتھ بزاز کی کسان مزدور کانفرنس اور غلام عباس کی مسلم کانفرنس نے اس تحریک آزادی سے علیحدگی کا اعلان کیا۔ چودھری غلام عباس نے تو اختلاف اس بنا پر کیا کہ یہ تحریک کانگریس کے چشم و ابرو کے اشاروں پر چلائی گئی ہے۔

یہ تھی میر واعظ یوسف شاہ اور چودھری غلام عباس کی مسلم کانفرنس جو ریاست میں عوامی حکومت کے قیام کی مخالف تھی اور مہاراجہ کے اشاروں پر ناچ رہی تھی۔ اگرچہ آزادی کا فائدہ سب سے زیادہ مسلم عوام کو پہنچنے والا تھا مسلم لیگ حسب دستور خاموش ہی نہیں بلکہ بالکل الگ تھلگ تھی اور منظر عالم کی ریاستی عوام کی مسلم کانفرنس کا کہیں پتہ نہ تھا۔ بس انڈین نیشنل کانگریس اور اسٹیٹس پیپلز کانفرنس (جس میں بخشی غلام محمد اور شیخ عبداللہ نے نمایاں جگہیں حاصل کر لی تھیں) ہر موقع پر کام آئی۔ اسی زمانے میں اسٹیٹس پیپلز کانفرنس نے ایک تجویز میں ریاستوں میں آئینی اور عوامی حکومتوں کے قیام کی تجویز کی۔ اس سے بھی تحریک کشمیر کو بڑا سہارا ملا۔ یہی نہیں بلکہ شیخ عبداللہ کے مقدمے کی پیروی کانگریس نے اپنے ذمے لے لی اور دلی سے مشہور قومی رہنما اور بیرسٹر آصف علی کو مقدمہ کی پیروی کے لیے یہاں بھیجا گیا۔ پیروی میں مشہور مقامی ایڈوکیٹ پنڈت جیالال کلم نے بھی نمایاں حصہ لیا۔

اس تحریک کی تیاریاں پہلے ہی سے ہو رہی تھیں اور تحریک کی ابتدا ہی میں نیشنل کانفرنس

کی تنظیم کے روحِ رواں اور خاموش کارکن بخشی غلام محمد کو ریاست کے باہر اس غرض سے بھیج دیا
گیا تھا کہ اگر یہاں کے کارکن گرفتار ہو جائیں تو وہ اس تحریک کو باہر سے چلاتے رہیں بخشی صاحب شروع
سے نیشنل کانفرنس کی تنظیم کو سنبھالتے تھے۔ وہ ٹھوس کام کرتے تھے اور نمائش کو پسند نہیں کرتے
تھے۔ وہ تنظیم کے ایک ایک فرد کو جانتے تھے اور صرف وہی باہر رہ کر ہی تحریک چلا سکتے تھے۔
بخشی غلام محمدؐ نے تمام ہندوستان کا دورہ کیا اور پہلی بار ہندوستان کے عوام و خواص کو کشمیر
کی تحریک کی حقیقت و اصلیت سے آگاہ کیا۔ اخباروں کے ذریعے تحریک کے موافق فضا پیدا
کرائی اور باہر رہ کر تحریک کو کامیابی سے چلاتے رہے۔ بخشی صاحب نے پنڈت جواہر لال نہرو کو صورتِ حال
سے آگاہ کیا اور انھوں نے ۲۷-مئی ۱۹۴۶ء کو ایک زلزلہ انگیز بیان جاری کیا جس میں ریاست
کے مظالم کا پردہ فاش کیا۔ پھر ۱۸-جون کو انھوں نے خود وادی میں آنے کا فیصلہ کیا۔ راولپنڈی
اور مری سے تقریباً تین سو کانگریسی رضاکار ان کے ہمراہ ہوئے۔ لیکن کوہالہ کے مقام پر
پنڈت نہرو کو روکا گیا۔ نہرو اس کی پرواہ نہ کرتے ہوئے آگے بڑھے۔ اس طرح پنڈت نہرو
ڈومیل پہنچے اور وہاں ڈاک بنگلے میں مقیم ہوئے۔ یہاں اُن پر وارنٹ گرفتاری کی تعمیل کی گئی۔ اس
گرفتاری سے ملک کے طول و عرض میں آگ لگ گئی اور [illegible] میں تو مجمع پر فائرنگ
ہوئی جس میں سرکاری اعداد و شمار کے مطابق ایک ہلاک اور سات مجروح ہوئے۔ پنڈت نہرو
اوڑی کے ڈاک بنگلے میں مقید رہے۔ اسی زمانہ میں کانگریس اور حکومت برطانیہ کے
مابین آزادی سے متعلق نہایت ضروری گفتگو چل رہی تھی۔ اور مولانا آزاد صدر کانگریس نے ایک
ضروری مشورہ کے لئے پنڈت نہرو کو دلی طلب کیا۔ پنڈت نہرو واپس دلی روانہ ہو گئے۔ لیکن یہ کہے
کر کے گئے تھے کہ وہ پھر واپس آئیں گے۔ چناں چہ ۲۴-جولائی کو پھر وادی میں فاتحانہ داخل
ہوئے اور اب کے حکومت کو روکنے کی ہمت نہ ہوئی۔

ادھر کانگریس اور کانگریسی قائدین کشمیر کی عوامی تحریک کی اس طرح دامے، درمے، سخنے

قدر سے مدد کر رہے تھے اور ادھر مسٹر جناح اور مسلم لیگ نہ صرف یہ کہ خاموش تھے بلکہ مسٹر جناح
نے یہ اخباری بیان دیا کہ "کشمیری مسلمان 'کشمیر چھوڑ دو' تحریک کے مخالف ہیں۔" لیکن یہاں
چودھری غلام عباس نے دیکھا کہ مسلم کانفرنس اپنے اس عوام دشمن رویے سے بالکل ہی مطعون
ہو چکی ہے اس لئے انھوں نے اپنے خیال میں اپنی قیادت کی گرتی ہوئی عمارت میں تھونیاں
لگانے کے لئے خود کو ایک نفری تحریک کے لئے پیش کیا۔ لیکن حکومت کشمیر نے ان کی گذشتہ
خدمات کا بھی کوئی خیال نہیں کیا اور انھیں بھی جیل میں بند کر دیا۔ لیکن جہاں نیشنل کانفرنس کو
اپنی تحریک سے جو عوام کی امداد سے چل رہی تھی، مزید تقویت ملتی چلی گئی۔ مسلم کانفرنس کے
لیڈر کے قید ہوتے ہی یہ سیاسی جدوجہد میر واعظ یوسف شاہ اور دوسرے افراد کی باہمی
رقابتوں کی نذر ہو کر بالکل ہی ختم ہو گئی۔ اس کے بعد وزیر اعظم کاک نے جی حضوریوں کا ایک
سیاسی ادارہ قائم کیا اور ایم این اے کے پیرووں نے دو رخی سیاسی پالیسی اختیار کر کے
قوم پرستوں کی صفوں میں اختلال پیدا کرنا چاہا۔ لیکن قوم پرور طاقتیں سیاسی مطلع پر چھا چکی تھیں
انھیں عوام کی پوری ہمدردی حاصل تھی اور ان کے ارادوں کو متزلزل کرنا ناممکن تھا۔

اس ساری فضا میں مہاراجہ اور وزیر اعظم کاک کی ناعاقبت اندیشی سب سے
بڑا روڑا تھی۔ ادھر باقی ہندوستان میں دور رس تبدیلیاں ہو رہی تھیں۔ 'کیبنٹ مشن' جس
زمانے میں ہندوستان کی آئینی صورت کا نقشہ تیار کرنے میں مصروف تھا۔ اس وقت شیخ عبداللہ
نے بھی ایک میمورنڈم بھیجا تھا جس میں ریاست کشمیر میں باقی ہندوستان کی طرح ملکی سیاسی
آزادی کی مانگ کی تھی۔ 'کیبنٹ مشن' کی سفارشات کے مطابق ملک کے بٹوارے اور آزادی
کا اعلان کر دیا گیا۔ ظاہر ہے کہ برطانوی ہند کی آزادی کا اثر ریاستوں پر پڑنا لازمی تھا لیکن
یہاں کشمیری حکومت خواب خرگوش میں پڑی ہوئی جبر و تشدد کا بازار گرم کئے ہوئے تھی۔ اس لئے
۱۷ مئی ۱۹۴۷ء کو آچاریہ کرپلانی کشمیر آئے کہ معاملات کو سلجھائیں اور قوم پسندوں پر جو مظالم

توڑے جا رہے ہیں ان کا خاتمہ کرائیں۔ انھوں نے یہاں ایک ہفتہ تک قیام کیا اور مہاراجہ سے بھی ملے۔ ادھر شیخ عبداللہ نے بھدروا جیل سے جموں میں اپنے ایک دوست کو لکھا کہ "مہاراجہ کو فوراً ہندوستان سے الحاق کر لینا چاہیئے اور مسٹر جناح کے اشاروں پر رقص کرنے والی مسلم کانفرنس کے اُن اعلانات کے چکر میں نہیں پھنسنا چاہیئے جن میں مہاراجہ کو آزاد رہنے کا مشورہ دیا جا رہا ہے۔" اس کے بعد اگست میں مہاتما گاندھی سری نگر گئے اگرچہ ان کا مشن سیاسی نہیں تھا پھر بھی مہاراجہ سے گفتگو کے دوران میں کچھ سیاسی بات چیت چلی تو مہاراجہ نے مہاتما گاندھی کو یقین دلایا کہ وہ عوام کی خواہشات کا پورا احترام کریں گے — اور اس میں شک نہیں کہ وزیر اعظم کاک کا استعفیٰ اس کے فوراً ہی بعد ہوا، جو یقیناً نیشنل کانفرنس کی ایک بہت بڑی کامیابی تھی۔

یوم آزادی یعنی ۱۵- اگست ۱۹۴۷ء سے پہلے کشمیر انھیں سیاسی حالات سے دوچار تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ کشمیر میں سلطانئ جمہور کا زمانہ آگیا ہے اور اسے کوئی طاقت روک نہیں سکتی ہے۔

چوتھا باب

پاکستان کا جارحانہ حملہ اور ہندستان کے ساتھ الحاق

پاکستان اور ہندوستان کی آزادی کا اعلان علی الترتیب ۱۴- اور ۱۵- اگست ۱۹۴۷ء کو ہوا تھا اور جیسا کہ گذشتہ باب کے مطالعہ سے واضح ہو چکا ہے اس وقت کشمیری عوام کی جدوجہد اس مرحلہ پر پہونچ چکی تھی جہاں اس کی کامیابی میں کوئی شک اور شبہ باقی نہیں رہا تھا لیکن ابھی 'سلطانیٔ جمہور' کے قیام میں ایک رکاوٹ بھی موجود تھی۔

برِّصغیر ہند کی تقسیم سے قبل 'برطانوی ہند' کے علاوہ یہاں ۵۶۴ ہندوستانی ریاستیں موجود تھیں۔ ان ریاستوں کا مجموعی رقبہ، ہندوستان کے مجموعی رقبے کا ۴۵ فی صد تھا اور ان کے باشندوں کی مجموعی تعداد کم و بیش ۹ کروڑ تھی۔ یہ تمام ریاستیں داخلی معاملات میں تقریباً خود مختار تھیں اور ان کے درمیان برطانیہ کو اقتدارِ اعلیٰ کی حیثیت حاصل تھی۔ لیکن برِّصغیر ہند کی آزادی کے فیصلہ کے بعد چونکہ برطانیہ کی مذکورہ بالا حیثیت قائم نہیں رہ سکتی تھی، اس لئے اس نے 'کیبنٹ مشن میمورنڈم' مئی ۱۹۴۶ء ہی میں اعلان کر دیا تھا کہ — برِّصغیر ہند کی آزادی کے بعد، ملکِ معظم کی حکومت، اقتدارِ اعلیٰ کی حیثیت سے اپنے اختیارات کو استعمال کرنے سے دست کش ہو جائے گی —— چناں چہ جب ۳- جون ۱۹۴۷ء کو سرکاری طور پر

تقسیم ہند کی تجویز کا اعلان کیا گیا تو اس میں بھی یہ الفاظ موجود تھے کہ — ملک معظم کی حکومت اس بات کو واضح کر دینا چاہتی ہے کہ اس نے ہندوستانی ریاستوں سے متعلق "کیبنٹ مشن میمورنڈم" میں اپنی جس حکمت عملی کا اعلان کیا تھا اس میں کوئی ترمیم نہیں کی جائے گی — اس طرح یہ بات واضح ہو گئی تھی کہ تقسیم ہند کی بدولت برصغیر ہند میں ہند اور پاکستان کے نام جو دو مملکتیں عالم وجود میں آئیں گی برطانوی حکومت کی طرف سے جہاں انھیں اختیاراتِ حکومت منتقل کئے جائیں گے وہاں وہ ان حقوق و اختیارات نیز فرائض سے بھی دست کش اور بری ہو جائے گی جو ہندوستانی ریاستوں کے سلسلہ میں اسے حاصل تھے یا اس پر عائد ہوتے تھے جس کے بعد یہ ریاستیں بھی آزاد اور خود مختار ہو جائیں گی لیکن چونکہ برصغیر ہند کی تقسیم جن حالات کے ماتحت عمل میں آنے والی تھی ان کے پیش نظر برصغیر ہند میں ان آزاد ریاستوں کی موجودگی سے حالات میں مزید الجھنیں پیدا ہو سکتی تھیں۔ اسی لئے یہ بات بھی طے کی گئی تھی کہ ۱۵۔ اگست ۱۹۴۷ء سے قبل ہر ہندوستانی ریاست کو یا تو ہند اور پاکستان میں سے کسی ایک مملکت کے ساتھ وابستہ ہو جانا چاہیئے یا اسے آزاد رہنے کا فیصلہ کر لینا چاہیئے۔ پھر یہ بات بھی طے کی گئی تھی کہ اگر کوئی ریاست ۱۵۔ اگست تک اپنے مستقبل کے متعلق کسی فیصلہ پر نہ پہنچ سکے تو وہ دونوں مملکتوں کے ساتھ حالات کو جوں کا توں باقی رکھنے کا معاہدہ بھی کر سکتی ہے لیکن مستقبل کے متعلق کوئی فیصلہ کرنے کا حق ہر ریاست کے عوام کو نہیں بلکہ حکمران کو دیا گیا تھا۔ اور ان تمام عظیم تبدیلیوں کے باوجود جہاں تک ریاستی باشندوں کا تعلق تھا ان میں کسی خوشگوار تغیر کا کوئی امکان نظر نہیں آتا تھا۔ انھیں ان کے مستقبل کا فیصلہ کرنے کے حق سے محروم کر دیا گیا تھا۔ ریاستوں کے آزاد رہنے کی صورت میں وہ پرانے جاگیردارانہ نظام کے ماتحت زندگی بسر کرنے پر مجبور تھے اور کسی مملکت کے ساتھ وابستگی کی صورت میں بھی اس بات کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی کہ یہ وابستگی جلد ہی ان کے حالات پر اثر انداز ہو سکے گی۔

متحدہ ہندوستان کے نقشہ پر ایک نظر ڈالنے ہی سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ تقریباً تمام ہندوستانی ریاستیں آج کے ہندیونین ہی میں واقع ہیں اور مسلم لیگ کے برعکس، انڈین نیشنل کانگریس جسے ۱۵۔ اگست ۱۹۴۷ء کو تمام تر اختیارات حکومت منتقل کئے جانے والے تھے، ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد کے آغاز ہی سے ہندوستانی ریاستوں میں ذمہ دار حکومتوں کے قیام کا مطالبہ کرتی رہی تھی۔ حتیٰ کہ ۱۹۳۹ء میں اسٹیٹس پیپلز کانفرنس نے 'انڈین نیشنل کانگریس' کے نظریات کی روشنی میں ریاستی حکمرانوں کے مخصوص حقوق میں تخفیف اور برطانیہ اور ان کے درمیان طے شدہ معاہدات کو وقت کے تقاضوں کے منافی قرار دیتے ہوئے ان کی تنسیخ کا مطالبہ بھی کیا تھا اور پنڈت جواہر لال نہرو نے ریاستی عوام کی کانفرنس کے اس اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے کہا تھا کہ — یہ معاہدے جن کی رو سے ریاستی حکمرانوں کو مخصوص حقوق حاصل ہیں آزاد ہندوستان میں تسلیم نہیں کئے جائیں گے — اور یہ بات ظاہر ہے کہ آزاد ہندوستان میں برسر حکومت آنے کے بعد انڈین نیشنل کانگریس اپنے نظریات کو فراموش اور ریاستی عوام کو نظر انداز نہیں کر سکتی تھی۔ ان حالات میں جولائی ۱۹۴۷ء میں ہندوستان کی عبوری حکومت نے سردار ولبھ بھائی پٹیل کی سرکردگی میں 'ریاستی وزارت' قائم کر کے اس پیچیدہ سوال کو حل کرنے کی کوشش کی تھی جس کے نتیجہ میں ۱۵۔ اگست ۱۹۴۷ء سے پہلے ہی تین ہندوستانی ریاستوں کے علاوہ جن میں ریاست جموں و کشمیر بھی شامل تھی باقی ماندہ تمام ریاستیں ہندیا پاکستان کے ساتھ وابستہ ہو گئیں اور جہاں تک ہندوستان کے ساتھ وابستہ ہونے والی ریاستوں کا تعلق ہے یہ امر محتاج بیان نہیں کہ اس وابستگی کی بدولت ان ریاستوں کے باشندے ہر اعتبار سے ہندوستان کے باشندوں کی سطح پر آ گئے تھے۔

سطور بالا میں یہ بات بتائی جا چکی ہے کہ ریاست کے مستقبل کے فیصلہ کا حق اس کے حکمران کو دیا گیا تھا اور تین ہندوستانی ریاستوں کے علاوہ جن میں ریاست جموں و کشمیر بھی شامل

تھی باقی ماندہ تمام ہندوستانی ریاستیں ۱۵۔ اگست سے قبل ہی ہندیا پاکستان کے ساتھ وابستہ ہو چکی تھیں۔ اس وقت کشمیر کے تمام عوامی رہنما قید خانوں میں بند تھے۔ مہاراجہ ہری سنگھ نے ۱۱۔ اگست ۱۹۴۷ء تک ریاست کے مستقبل کے متعلق کوئی فیصلہ نہیں کیا تھا اور ریاست کے باشندے تقسیم ہند کے فیصلہ کی بدولت رونما ہونے والے اندوہناک نتائج کے ساتھ اس بات کو بھی دیکھ رہے تھے کہ ہندوستان کے ساتھ وابستہ ہونے والی ریاستوں کے باشندے کس طرح 'سلطانی جمہور' میں حصہ دار بن چکے ہیں۔ اور انھیں اس بات کی توقع تھی کہ ہندوستان کے ساتھ ریاست جموں اور کشمیر کی وابستگی کے نتیجہ میں انھیں بھی' دوسری ہندوستانی ریاستوں کے باشندوں کے مساوی حقوق حاصل ہو سکیں گے۔ لیکن جب ۱۲۔ اگست کو مہاراجہ ہری سنگھ نے ہند اور پاکستان کے متوقع سربراہوں کو بذریعہ تار اپنے اس فیصلہ کی اطلاع دی کہ وہ فی الحال حالات کو 'جوں کا توں' رکھنے کا معاہدہ کرنا چاہتے ہیں تو ریاست کے باشندوں نے محسوس کیا کہ ابھی انھیں اپنی منزلِ مقصود پر پہنچنے کے لئے کچھ اور جدوجہد کرنی پڑے گی۔ اس طرح جب برِّصغیر ہند میں آزادی کی پہلی صبح نمودار ہوئی تو ریاست جموں اور کشمیر کے باشندے بدستور اس کی برکتوں سے محروم تھے لیکن خود ریاست برطانوی اقتدارِ اعلیٰ کی گرفت سے آزاد ہو چکی تھی اور مہاراجہ نے 'اسٹینڈ اسٹل اگریمنٹ' کے ذریعہ سے اپنی اور ریاست کی اس وقت کی حیثیت اور حالت کو بظاہر محفوظ کر لیا تھا۔

ہندوستان کی تقسیم سے پہلے کشمیر سے متعلق حکومت ہند کی ذمہ داریوں میں' ریاست کے ڈاک خانوں کا انصرام بھی شامل تھا اور چونکہ سری نگر کو راولپنڈی سے ملانے والا وادئ جہلم کا راستہ پورے سال آمدورفت کے لئے کھلا رہتا تھا اس لئے تقسیمِ ہند کے بعد باشندگانِ کشمیر کی ضروریاتِ زندگی کی بہم رسانی کی ذمہ داری بھی پاکستان پر عاید ہو گئی تھی اس لئے مہاراجہ نے پاکستان کے ساتھ جو اسٹینڈ اسٹل اگریمنٹ کیا تھا وہ ریاست

کی اس وقت کی حیثیت کو برقرار رکھنے کے علاوہ، رسل و رسائل، ضروری اشیاء کی فراہمی اور ڈاک خانوں نیز تار گھروں کے انتظام اور انصرام سے بھی متعلق تھا۔

کشمیر اور پاکستان کے درمیان مذکورہ بالا معاہدہ ہو جانے کے بعد پاکستان بعض اسباب کی بنا پر اب محسوس کرنے لگا تھا کہ اس کے ساتھ کشمیر کی وابستگی یقینی اور لازمی بات ہے لیکن وہ اس معاملہ میں تاخیر کو اپنے لئے نقصان رساں سمجھتا تھا اور اسی لئے اس نے معاہدہ کی تکمیل کی تاریخ سے ریاست جموں اور کشمیر پر قبائلی کے حملہ کے وقت تک ایسے کسی اقدام سے گریز نہیں کیا جس کے ذریعہ سے مہاراجہ کو پاکستان کے ساتھ اپنی ریاست کی وابستگی کے اعلان پر مجبور کیا جا سکتا تھا۔ چنانچہ اس نے اشیائے خوردنی کی بہم رسانی بند کر دی، سیالکوٹ سے جموں تک جانے والی ریلوے لائن پر گاڑیوں کی آمد و رفت کو معطل کر دیا اور اس طرح ریاست کی اقتصادی ناکہ بندی کرنے کے علاوہ ریاست کے مغربی حصوں میں اپنے مسلح شہریوں کو بھیج کر مقامی باشندوں کو خوفزدہ کرنے اور ریاست میں فتنہ اور فساد برپا کرانے کی کوشش بھی کرتا رہا اور معاہدہ کی براہ راست خلاف ورزی نیز دوسرے معاندانہ اقدامات پر مہاراجہ کی طرف سے متواتر احتجاج کئے جاتے رہنے کے باوجود پاکستان نے اصلاح حالات پر کوئی توجہ مبذول نہیں کی۔ چنانچہ پاکستان کے وزیر خارجہ نے کشمیر کے وزیر اعظم کے نام ۲۰۔ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو جو تار روانہ کیا تھا اس میں ذیل کے الفاظ میں اس بات کو تسلیم کیا تھا کہ پاکستان معاہدہ کی پابندی سے قاصر رہا ہے۔ اس تار میں لکھا تھا کہ :-

"ہم جو کچھ کر سکتے ہیں اسے کرنے کے لئے تیار رہیں۔ ہم کشمیر کو اس کی ضرورت کی ہر شئے فراہم کرنے کے لئے ضروری تدابیر اختیار کر رہے ہیں۔ لیکن اس بات کو مدنظر رکھنا چاہیئے کہ ہماری راہ میں کچھ مشکلات بھی حائل ہیں۔ مثلاً لاریوں کے ڈرائیور راولپنڈی سے سامان کو کوہالہ پہونچانے میں

پہنچ چکے ہیں [1]"

اور قبائل کے حملہ سے دو روز قبل جو تار روانہ کیا گیا تھا اس کا مضمون یہ تھا کہ:۔

"نقل و حمل میں جو مشکلات پیدا ہو رہی ہیں ان پر قابو پانا مغربی پنجاب کی حکومت کے بس سے باہر ہے لیکن انھیں حکومت کے معاندانہ رجحانات سے تعبیر کرنا یا یہ سمجھنا کہ یہ سب کچھ آپ کی حکومت کو الحاق کے فیصلہ پر مجبور کرنے کے لئے کیا جا رہا ہے بالکل غلط ہے[2]۔"

لیکن ان ہی دونوں تاروں سے کم از کم یہ بات ضرور ثابت ہو جاتی ہے کہ مہاراجہ نے پاکستان کے ساتھ جو معاہدہ کیا تھا مؤخر الذکر اس پر قائم نہیں رہا تھا اور اگرچہ وہ اس معاہدہ شکنی کو اپنی بعض مجبوریوں پر محمول کرتا تھا لیکن جیسا کہ بعد میں پیش آنے والے واقعات نے ثابت کر دیا ہے اس کا مقصد مہاراجہ کو ریاست کے الحاق کا فیصلہ کرنے پر مجبور کر دینا تھا اور چونکہ ہندوستان کی تقسیم کے بعد ریاست جموں اور کشمیر کے محل وقوع کے پیش نظر ہند اور کشمیر کے درمیان رسل و رسائل اور نقل و حمل کی تمام راہیں بند ہو چکی تھیں اور ہندوستان سے وادیٔ کشمیر کو ملانے والا وہ راستہ جو درہ بانہال سے ہو کر گذرتا ہے اس وقت موسم سرما میں بند ہو جاتا تھا اور ریاست جموں اور کشمیر اس وقت رسل و رسائل اور نقل و حمل کے وسائل میں پاکستان ہی کے دست نگر تھی اس لئے پاکستان کے ارباب حل و عقد کو اس بات کا یقین کامل تھا کہ الحاق کا فیصلہ پاکستان ہی کے حق میں ہوگا۔

پھر جہاں تک ریاست جموں اور کشمیر میں پاکستانیوں کے مسلح گروہوں کے داخلہ کا تعلق ہے اس کا ثبوت پونچھ کی اس بغاوت سے ملتا ہے جو وہاں ریاست کے خلاف اگست ۱۹۴۷ء کے دوسرے ہی ہفتہ میں رونما ہو گئی تھی اور اسی بغاوت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ

1-2. The Struggle for Kashmir by MICHAEL BREACHER. Ph.D., P. 25

پاکستان کے قیام کے روزِ اول ہی سے وہاں کے حکمران ریاست جموں اور کشمیر پر قبضہ کر لینے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ اس کے علاوہ ستمبر اور اکتوبر میں ریاست کی سرحدوں کے اندر ریاستی باشندوں اور پاکستانیوں کے درمیان متواتر جو مسلح جھڑپیں ہوتی رہی تھیں ان سے بھی اس بات کی تصدیق ہو جاتی ہے کہ پاکستان اقتصادی ناکہ بندی ہی کے ذریعہ سے نہیں بلکہ ریاست میں اپنے مسلح شہریوں کو بھیج کر اور فتنہ و فساد برپا کرا کے بھی مہاراجہ کو الحاق کا فیصلہ کرنے پر مجبور کر دینا چاہتا تھا۔

پاکستان کے مذکورہ بالا طرزِ عمل کے مقابلہ میں ریاست جموں اور کشمیر کے الحاق کے متعلق ہندوستان کا جو طرزِ عمل تھا اسے لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے ان الفاظ میں واضح کیا ہے کہ:۔

"اگر وہ (مہاراجہ ہری سنگھ) ۱۴۔ اگست سے پہلے پاکستان کے ساتھ ریاست کا الحاق کر لیتے تو ہندوستان میں قائم ہونے والی حکومت نے مجھے اختیار دے دیا تھا کہ میں اس کی طرف سے مہاراجہ کو اس بات کا یقین دلا دوں کہ اسے ان کے اس فیصلہ پر کسی قسم کا اعتراض نہیں ہوگا۔"[1]

لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے مذکورہ بالا الفاظ میں ہندوستان کے جس طرزِ عمل پر روشنی ڈالی ہے اس کی توثیق اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ جب مہاراجہ ہری سنگھ نے ۱۲۔ اگست کو پاکستان کے ساتھ ہندوستان سے بھی "اسٹینڈ اسٹل اگریمنٹ" کر لینے کی دعوت دی تھی تو ہندوستان نے محض اسی بنا پر کہ وہ ریاست جموں اور کشمیر کے مستقبل سے کوئی سروکار نہیں رکھنا چاہتا تھا اور وہ کسی طرح بھی مہاراجہ کی قوتِ فیصلہ پر اثر انداز نہیں ہونا چاہتا تھا اس

---

1. Address to the East India Association June 29, 1948 in the ASIATIC Review London. Vol. XLIV, Oct. 1948, P. 352

درخواست یا پیش کش کا کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ پھر اسی قدر نہیں بلکہ مائیکل بریچر تے
لکھا ہے کہ ہندوستان اور ریاست جموں اور کشمیر کے درمیان اسٹینڈ اسٹل اگریمنٹ نہ ہونے
کے دوسرے اسباب میں سے ایک سبب یہ بھی تھا کہ :۔

"ہندوستان کوئی ایسا قدم اُٹھانے کے لئے تیار نہیں تھا جو پاکستان اور اس
کے درمیان شاید شدید اختلاف اور نزاع کا ایک اور سبب بن جاتا۔"[1]

ان الفاظ سے جن میں اس وقت کی صحیح صورت حال کو بیان کیا گیا ہے یہ نتیجہ اخذ کر لینا
کوئی دشوار کام نہیں کہ ایک جانب تو ہندوستان اپنی جگہ کشمیر کے معاملہ میں قطعاً بے تعلق رہنا
اور اس ریاست کے مستقبل کے سوال کو اس کے حکمران کے آزاد فیصلہ پر چھوڑ دینا چاہتا تھا
اور دوسری طرف وہ پاکستان کے ساتھ خوش گوار تعلقات قائم کرنے کا بھی خواہش مند تھا
اور کوئی ایسا جائز قدم بھی اُٹھانے کے لئے تیار نہیں تھا جس سے دونوں ملکوں کے درمیان کوئی
غلط فہمی پیدا ہو جائے ان اسباب کے علاوہ اس معاملہ میں ہندوستان کی خاموشی کا ایک
اہم سبب یہ بھی تھا کہ ۱۵۔ اگست ۱۹۴۷ء کو ہندوستان میں قائم ہونے والی حکومت کی سربراہی
وہی لوگ کرنے والے تھے جو ہمیشہ ریاستی باشندوں کی آزادی کے مطالبہ کی حمایت اور ریاستی
حکمرانوں کے مخصوص حقوق اور اختیارات کی مخالفت کرتے رہتے تھے اور ریاست جموں کشمیر
کے معاملہ میں بھی وہ صرف مہاراجہ کی درخواست کو 'اسٹینڈ اسٹل اگریمنٹ' یا الحاق کی بنیاد
نہیں بنانا چاہتے تھے۔ چنانچہ مسٹر پی۔ این۔ دھر نے لکھا ہے کہ :۔

"ہندوستان سے بھی اسی قسم کی درخواست کی گئی تھی لیکن ہندوستان کا
موقف یہ تھا کہ کسی مملکت کے ساتھ الحاق کا فیصلہ محض ریاست کے باشندے

1 THE STRUGGLE FOR KASHMIR, p.23.

ہی کر سکے نہیں۔[1]"

بہر حال برصغیر ہند کی آزادی کے بعد ریاست جموں اور کشمیر کی صورت حال یہ تھی کہ ایک طرف تو ریاست کے حکمراں نے الحاق کے متعلق کوئی فیصلہ نہیں کیا تھا دوسری طرف ہندوستان اپنے جمہوری نظریات کی بنا پر مہاراجہ کے ساتھ ریاست کے متعلق کوئی سمجھوتہ کرنے کے لئے تیار نہیں تھا اور تیسری جانب پاکستان نہ صرف پٹرول، کپڑے، نمک اور غلہ کی بہم رسانی ہی کو روک کر مہاراجہ کو پاکستان کے ساتھ ریاست کے الحاق پر مجبور کرنے کی کوشش کر رہا تھا بلکہ مسلح پاکستانیوں کے گروہ بھی ریاست میں داخل ہو کر فسادات برپا کرنے میں مصروف تھے اور تقسیم کی بدولت پناہ گزینوں کی آمد و رفت نے بھی ریاست کے ارباب حل و عقد کے لئے ایک زبردست اُلجھن پیدا کر دی تھی۔ ان تمام باتوں کے باوجود الحاق کے معاملہ میں مہاراجہ نے کامل عزم اور استقلال کا ثبوت دیا تھا اور وہ پاکستان کے ساتھ ریاست کے الحاق پر آمادہ نہیں ہوئے تھے اس کے برعکس انھوں نے ۱۹ ستمبر ۱۹۴۷ء کو شیخ محمد عبداللہ اور ان کے دوسرے رفقاء کار کو رہا کر دیا تھا اور نیشنل کانفرنس پر عائد کی ہوئی پابندی کو منسوخ کر دیا تھا اور اسی طرح مستقبل کے فیصلہ میں بالواسطہ طریقہ پر نیشنل کانفرنس اور اس کے رہنماؤں کو بھی شریک کر لیا تھا۔

کشمیر نیشنل کانفرنس کے رہنماؤں کی رہائی کے بعد حالات نے جو نیا رُخ اختیار کیا وہ یہ تھا کہ ان رہنماؤں نے الحاق کے سوال پر غور کرنے سے پہلے عوام کو جس بات پر توجہ دلائی وہ یہ تھی کہ سب سے پہلے انھیں جاگیردارانہ نظام حکومت کی گرفت سے نجات حاصل کرنی چاہیئے۔ نیشنل کانفرنس کے رہنماؤں کی رہائی کے بعد سے کشمیر پر حملہ کے وقت تک جو حالات پیش

1- The Kashmir Problem, Politi-eal and Economic Background by P. N. Dhar, INDIAN QUARTERLY April-June, 1951

آگے رہے تھے انہیں شیخ محمد عبداللہ نے فروری ۱۹۴۸ء میں مجلس تحفظ کے اجلاس منعقدہ لیک سکس کے روبرو بیان کرتے ہوئے کہا تھا کہ :

"قید خانہ سے رہائی کے فوراً ہی بعد ہمارے سامنے جو اہم سوال آیا وہ یہ تھا کہ ہمیں ہندوستان کے ساتھ ملحق ہونا چاہیئے یا پاکستان کے ساتھ یا پھر آزاد رہنا چاہیئے ۔ ... یہ سوال بہت زیادہ دشوار تھا لیکن میں نے اپنے اہلِ وطن کو مشورہ دیا کہ اگرچہ ہمارے لئے یہ سوال بہت زیادہ اہمیت رکھتا ہے لیکن اس کی حیثیت ثانوی ہے اور ہمارے لئے مقدم ترین سوال مہاراجہ کی مطلق العنان حکومت سے آزادی حاصل کرنے کا ہے .... اس وقت تک ہمارا مقصد حاصل نہیں ہوا تھا اس لئے میں نے اپنے اہلِ وطن سے کہا کہ پہلے اپنا یہ نصب العین حاصل کرنا چاہیئے اور اس کے بعد آزاد انسانوں کی طرح اس بات کو طے کرنا چاہیئے کہ ہمارا مفاد کس امر پر منحصر ہے ۔ قدرتی طور پر ہم اپنی آزادی سے پہلے اس اہم سوال کا فیصلہ نہیں کر سکتے تھے اس لئے ہم نے الحاق سے پہلے 'آزادی' کا نعرہ بلند کیا ۔ بعض پاکستانی دوست سری نگر میں مجھ سے ملے ۔ ہمارے درمیان صاف صاف باتیں ہوئیں اور میں نے ان پر اپنا نقطۂ نظر واضح کیا اور غیر مبہم الفاظ میں ان سے کہا کہ ماضی میں ہماری آزادی کی تحریک کے متعلق پاکستان کا رویہ خواہ کچھ ہی کیوں نہ رہا ہو لیکن اب وہ ہمارے فیصلہ پر اثر انداز نہ ہو سکے گا اور اگر ہم یہ محسوس کریں گے کہ ۴۰ لاکھ کشمیریوں کا فائدہ پاکستان کے ساتھ الحاق ہی میں ہے تو پنڈت جواہر لال نہرو اور کانگریس کی دوستی اور ہماری آزادی کی تحریک میں ان کی اعانت اور حمایت بھی ہمارے فیصلہ کو متاثر نہیں کر سکے گی ۔

میں نے ان سے درخواست کی تھی کہ انہیں ہم سے کوئی فیصلہ کرانے میں جلد بازی سے کام نہیں لینا چاہیئے بلکہ ہماری تحریک کی حمایت کرتے ہوئے ہمیں مہلت دینی چاہیئے۔ میں نے ان سے یہ بھی کہا تھا کہ ہمارے آزاد ہو جانے کے بعد بھی ہمیں الحاق کے سوال پر غور کرنے کی مہلت ملنی چاہیئے اور میں نے یہ بات بھی بتا دی تھی کہ ہندوستان نے ہمارے اس زاویۂ نظر کو تسلیم کر لیا ہے اور اس کی طرف سے ہمیں الحاق کے سوال کا فیصلہ کرنے پر مجبور نہیں کیا جا رہا ہے۔

پاکستانی دوستوں کے ساتھ ان ہی مذاکرات کے دوران میں میں نے اپنے ایک رفیق کار کو لاہور بھیجا تھا جہاں اس نے پاکستان کے وزیر اعظم مسٹر لیاقت علی خان اور مغربی پنجاب کی حکومت کے دوسرے اعلیٰ کارکنوں سے مل کر ان کے سامنے یہی نقطۂ نظر پیش کیا تھا اور ان سے درخواست کی تھی کہ انہیں ہمیں الحاق کے اعلان پر مجبور کرنے کی بجائے آزادی حاصل کرنے میں ہماری امداد کر کے ہمیں اس اہم سوال پر غور کرنے کی مہلت دینی چاہیئے۔ لیکن ابھی یہ مذاکرات جاری ہی تھے کہ ایک روز یہ اطلاع موصول ہوئی کہ صوبہ کشمیر کے ایک سرحدی قصبہ مظفر آباد پر پوری قوت سے حملہ کر دیا گیا ہے[1]۔"

بہر حال جیسا کہ سطور بالا کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے ابھی نیشنل کانفرنس کے رہنماؤں اور پاکستان کے ارباب حکومت کے درمیان گفت و شنید جاری ہی تھی کہ ۲۲۔ اکتوبر ۱۹۴۷ء

1. Presidential Address, All J. & K. National Conference, Annual Session, 1949

کو جدید ترین اسلحہ سے مسلح قبائلی علاقہ کے باشندوں نے شمال مغربی صوبہ اور مغربی پنجاب کی سرحدوں کو عبور کر کے کشمیر پر یورش شروع کر دی اور اگرچہ ان حملہ آوروں کی قیادت بھی پاکستانی فوجی افسر ہی کر رہے تھے اور ایک امریکن فوجی سپاہی رسل، کے، ہانٹ (جونیر) کے بیان کے مطابق جو دو ماہ تک، کشمیر پر حملہ آور فوج کے ساتھ رہ چکا تھا :-

"پاکستان نے قبائلی حملہ آوروں کو پٹرول مہیا کیا تھا ان کے لئے کیمپ قائم کئے تھے اور انھیں گولہ بارود بہم پہونچایا تھا۔[1]"

لیکن جب قبائل کا یہ حملہ بھی کشمیر کو فتح اور کشمیریوں کو مرعوب اور خوفزدہ کرنے میں کامیاب ثابت نہیں ہو سکا تو پاکستانی افواج کے کمانڈر ان چیف لارڈ آکن لک کے بیان کے مطابق ۲۷۔ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو :-

"مسٹر جناح نے پاکستانی افواج کو کشمیر میں داخل ہو جانے کا حکم دے دیا تھا۔[2]"

اور اگرچہ لارڈ آکن لک کی کوشش سے دوسرے ہی روز یہ حکم منسوخ بھی ہو گیا تھا لیکن اس کی یہ تنسیخ رسمی تھی اور جیسا کہ بعد کے واقعات سے ثابت ہو جائے گا اس جارحانہ حملہ میں پاکستان کی باقاعدہ افواج باقاعدگی اور تواتر کے ساتھ حصہ لیتی رہی تھیں۔ حتیٰ کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے پریس اتاشی مسٹر کیمپبل جانسن نے ۲۷۔ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو اپنی ڈائری میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن اور اخبار "اسٹیٹسمین" کلکتہ کے اڈیٹر کی گفتگو کا اندراج کرتے ہوئے یہ بھی لکھا تھا کہ :

"لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے اپنی گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے کہا کہ مسٹر جناح

۱۔ New York Times 29-1-48

۲۔ The Struggle for Kashmir Pp. 30, 32, 33

ایبٹ آباد میں مقیم تھے اور اس امر کے متوقع تھے کہ وہ فاتح کی حیثیت سے کشمیر میں داخل ہوں گے لیکن انھیں مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔[1]"

ریاست جموں اور کشمیر پر پاکستان کی امداد اور پاکستان کے فوجی افسروں کی قیادت میں ۲۲-اکتوبر ۱۹۴۷ء کو جو جارحانہ حملہ شروع کیا گیا تھا وہ ایک باقاعدہ منصوبہ پر مبنی تھا اس میں ہزارہا مسلح قبائلی شریک تھے اور حکومت ہند کی طرف سے جموں اور کشمیر کے حالات پر جو قرطاس ابیض (وہائٹ پیپر) شائع کیا گیا تھا اس میں بتایا گیا تھا کہ اگرچہ لڑائی میں صرف ۲۰۰۰ قبائلی حصہ لے رہے تھے لیکن مغربی پنجاب میں جمع ہونے والے قبائلیوں کی تعداد ۳۰۰۰۰ تھی اور چونکہ ریاست کی مختصر سی فوج کے لئے اس منظم اور باقاعدہ حملہ کی مدافعت ممکن نہیں ہو سکتی تھی اس لئے وہ علامتی مقابلہ کرنے کے بعد پسپا ہو گئی اور حملہ آور مظفرآباد اور اوڑی پر قبضہ کرنے کے بعد وادیٔ جہلم کے راستہ پر پیش قدمی کرتے ہوئے ۲۶-اکتوبر کی صبح کو بارہ مولا پہونچ گئے۔ جو سری نگر سے ۳۴ میل مغرب کی سمت میں واقع ہے حتیٰ کہ انھوں نے اسی روز آگے بڑھ کر سری نگر سے صرف ۱۴ میل دور مہورہ کے اس بجلی گھر اور اس کے گرد و نواح کے علاقہ پر بھی قبضہ کر لیا جہاں سے سری نگر کو بجلی مہیا کی جاتی ہے اور سری نگر کے باشندوں کو، حملہ آوروں کے اس قدر قریب پہنچ جانے کا اندازہ اس وقت ہو سکا جب انھیں رات کو بجلی کی روشنی میسر نہیں ہو سکی۔ ریاستی فوج پہلے ہی دن مقابلہ سے قاصر ہو چکی تھی اور حملہ آوروں کی اس کامیابی سے دل برداشتہ ہو کر اب شہری حکام بھی راہِ فرار اختیار کرنے لگے تھے۔ اس طرح نظم و نسق بالکل معطل ہو گیا تھا اور اب حملہ آوروں کے لئے سری نگر تک پہونچنے میں بظاہر کوئی رکاوٹ باقی

1. The Struggle for Kashmir Pp. 30, 32, 33

نہیں رہی تھی اوران کی پیش قدمی برابر جاری تھی اور وہ ۲۷۔اکتوبر کو سری نگر سے صرف چار میل کے فاصلہ پر رہ گئے تھے۔

اس حملہ سے پاکستان کا مقصد ریاست جموں اور کشمیر کو فتح کرکے اس کے باشندوں کو غلام بنانے کے علاوہ کچھ نہیں تھا اور اگرچہ پاکستان کے پہلے وزیر اعظم مسٹر لیاقت علی خاں نے ہندوستان کے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو کے متعدد احتجاجی مراسلوں کے جواب میں ۳۰۔دسمبر ۱۹۴۷ء کو جو طویل مکتوب روانہ کیا تھا اس میں حملہ آوروں کے ساتھ پاکستان کے تعلق سے انکار کرتے ہوئے یہ بھی لکھا تھا کہ ریاست سے گذرنے والے مسلمان پناہ گزینوں اور ریاست کے مسلمان باشندوں پر ریاست کی فوج جو مظالم برپا کررہی تھی ان سے متاثر ہوکر قبائلیوں نے اچانک یہ حملہ کردیا ہے۔لیکن واقعات سے یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے کہ اس حملے کا مقصد ریاستی فوج کے حقیقی یا مفروضہ مظالم سے مسلمانوں کو نجات دلانا نہیں بلکہ قبائلیوں کو لوٹ مار اور قتل و غارت گری کی عام اجازت دے کر انہیں خوش کرنا اور ان کے ذریعہ سے کشمیر کو دائمی غلامی کی زنجیروں میں جکڑ لینا تھا۔

اس طوفانی حملہ کے دوران میں مذہبی امتیاز کے بغیر ہر شخص پر انتہائی وحشیانہ مظالم برپا کیے گئے تھے حتیٰ کہ لارڈ برڈووڈ نے بھی جسے کشمیر کے واقعات کو قلمبند کرنے میں کسی طرح غیر جانبدار نہیں کہا جاسکتا دبے ہوئے الفاظ میں اس امر کا اعتراف کیا ہے کہ:

"قبائلیوں کی پہلی فوج، جو تقریباً دو ہزار افراد پر مشتمل، لڑکوں میں سوار ہوکر ایبٹ آباد سے گذرتی ہوئی ۲۲۔اکتوبر کو کشمیر کے علاقہ میں داخل ہوئی اور اس نے راستہ میں ڈومیل اور مظفر آباد کو لوٹ کر انہیں آگ لگادی"[1]

---

1 The Nations and Kashmir _ P _ 56

یکن لارڈ برڈوڈ نے مذکورہ بالا مبہم الفاظ میں جس حقیقت کو چھپانے کی کوشش کی ہے غیر جانبدارانہ مبصروں اور وقائع نگاروں نے اپنے بیانات اور تحریروں میں اسے قطعاً بے نقاب کر دیا ہے۔ چنانچہ بریچر نے لکھا ہے کہ :۔

"قبائلیوں کے حملہ کی متعدد خصوصیات میں سے ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ ان کی لوٹ کھسوٹ اور قتل و غارت گری سے ہندو اور مسلمان دونوں ہی محفوظ نہیں رہ سکے تھے۔ حملہ آوروں کے ظلم و تعدّی کی تصدیق کے لئے بہت سے ثبوت موجود ہیں اور بارہ مولا کے سینٹ جوزف کانونٹ میں تو یہ مظالم حدِ انتہا کو پہونچ گئے تھے۔[1]"

اور بارہ مولا میں ان حملہ آوروں نے جو وحشیانہ مظالم برپا کئے تھے نیویارک ٹائمز کے نامہ نگار رابرٹ ٹرمبل نے انھیں ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ :

"شہر کو بالکل لوٹ لیا گیا تھا اور جمعہ کی شب کو ہندوستانی فوج کی آمد سے پہلے شہر کی نوجوان عورتیں حملہ آوروں سے بچنے کے لئے شہر چھوڑ کر بھاگ گئی تھیں اور ان حملہ آوروں نے باقی ماندہ شہریوں کو جن کی تعداد ۳۰۰۰ تھی نیز ۴ یوروپین باشندوں اور ایک سابق برطانوی فوجی افسر کرنل ڈائکس اور اس کی حاملہ بیوی کو تہ تیغ کر دیا تھا ......

اور آج بارہ مولا میں ہندوستانی فوج کی آمد سے ۴۸ گھنٹے کے بعد اس شہر کے چودہ ہزار باشندوں میں سے صرف ایک ہزار باقی رہ گئے ہیں[2]"

۔۔۔ پریم ناتھ بزاز نے سینٹ جوزف کانونٹ کے حالات کو اپنے ایک مقالہ ٹرتھ اباؤٹ کشمیر،

---

1. The Struggle for Kashmir. P. 27
2. New York Times 10.11.47

میں بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"ایک بیس سالہ ہندوستانی نرس نے ایک ایسی مسلم خاتون کو بچانے کی کوشش کی تھی جس نے کچھ ہی دیر پہلے ایک بچہ کو جنم دیا تھا لیکن پہلے اس نرس کو گولی ماردی گئی اور اس کے بعد اس مسلمان خاتون کو ہلاک کر دیا گیا۔"[1]

یہاں میر مقبول شیروانی کا واقعہ بیان کر دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔ میر مقبول شیروانی کشمیر نیشنل کانفرنس کا ایک مخلص کارکن اور قوم پرور کشمیری نوجوان تھا۔ کشمیر پر حملہ شروع ہوا تو وہ دشمن کے عقب میں رہ کر اپنے اہلِ وطن کو بلا امتیاز مذہب و ملت متحد ہو کر دشمن کا مقابلہ کرتے رہنے کی ترغیب دیتا رہا لیکن چند روز کے بعد ان حملہ آوروں نے اسے گرفتار کر لیا اور چوک میں لاکر اسے یہ اعلان کرنے کا حکم دیا کہ "مسلمانوں کے لئے پاکستان کے ساتھ شریک ہوجانا ہی مفید ہے" لیکن جب اس نے یہ اعلان کرنے سے انکار کر دیا تو اسے سرِ راہ ایک برآمدہ کے ستون کے ساتھ اس طرح باندھ دیا گیا کہ اس کے بازو صلیب کے بازوؤں کی طرح پھیل گئے۔ اس کے بعد انھوں نے "پاکستان زندہ باد" کا نعرہ بلند کرنے کا حکم دیا۔ اس کی دونوں ہتھیلیوں میں میخیں گاڑ دیں اور ٹین کے ایک ٹکڑہ پر یہ جملہ لکھ کر کہ "غدار کی سزا موت ہے" اس ٹکڑہ کو شیروانی کی پیشانی پر آویزاں کر دیا اور ان سب باتوں کے بعد چودہ قبائلیوں کی رائفلوں سے بیک وقت چلنے والی گولیوں نے کشمیر کے اس بہادر فرزند کے جسم کو چھلنی چھلنی کر دیا۔ لیکن 'پاکستان زندہ باد' کے بجائے زندگی کے ان آخری لمحات میں بھی شیروانی کی زبان سے جو نعرہ بلند ہوا تھا وہ یہ تھا کہ:

ہندو مسلم اتحاد پائندہ باد[2]

---

1. Daily Express, London, 11.11.47
2. Halfway to Freedom Pp. 210-11

ریاست جموں اور کشمیر میں اچانک جو واقعات پیش آئے تھے اُن سے کشمیر کے عوام، عوامی رہنماؤں اور مہاراجہ کا غیر متاثر رہنا ممکن نہیں ہو سکتا تھا۔ چناں چہ ان نازک ترین لمحات میں جبکہ دشمن سری نگر کے دروازہ پر کھڑا ہوا تھا، مہاراجہ اور تمام اعلیٰ حکام سری نگر سے جا چکے تھے اور ریاست کا انتظامی شیرازہ اس طرح منتشر ہو چکا تھا کہ حکومت کا کوئی وجود باقی نہیں رہا تھا، نیشنل کانفرنس کے رہنماؤں نے ایک جرأت مندانہ قدم اٹھا کر نظم و نسق کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں سنبھال لی۔ ان رہنماؤں کی آواز پر ہزارہا ہندو، مسلمان اور سکھ دیکھتے دیکھتے عوامی فوج میں بھرتی ہو گئے۔ ان قومی رضاکاروں میں مرد اور عورتیں ہی نہیں بلکہ بچے بھی شامل تھے اور اس حال میں کہ شیخ محمد عبداللہ کے بیان کے مطابق:

"سابقہ حکومت نے مالی دیوالیہ پن اور اقتصادی بدحالی کے علاوہ کچھ نہ چھوڑا تھا۔[1]"

اس عوامی حکومت اور عوامی فوج نے نہ صرف مالی اور اقتصادی مشکلات پر قابو پانے کا فیصلہ کر لیا بلکہ اس حکومت نے عوامی فوج کے ذریعہ اس فوجی خلا کو بھی پر کر دیا جو ریاستی فوج کی عدم موجودگی کے باعث پیدا ہو گیا تھا۔ چناں چہ یہی وہ عوامی فوج تھی جس نے سری نگر میں مکمل شہری انتظام اور فرقہ وارانہ یک جہتی کو برقرار رکھا تھا اور یہی وہ عوامی فوج تھی جو ہندوستانی افواج کے کشمیر پہونچنے تک حملہ آوروں سے سری نگر کی مدافعت کرتی رہی تھی۔ یہ تھا وہ ردِ عمل جو اچانک پیش آنے والے ان واقعات کا کشمیر کے عوام پر ہوا تھا لیکن مہاراجہ بھی ان سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے تھے اور وہ محسوس کرنے

1. Presidential Address, All J. & K. National Conference Annual Session, 1949

لگے تھے کہ اگر انھوں نے اس وقت الحاق کے متعلق کوئی فیصلہ نہ کیا تو حالات بالکل ہی ان کے قابو سے باہر ہو جائیں گے۔ اس کے باوجود وہ الحاق کے فیصلہ کو ملتوی کر دینا چاہتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے اس سلسلہ میں ایک محتاط قدم اُٹھایا اور ۲۴ - اکتوبر ۱۹۴۷ء کو حکومت ہند سے صرف یہ درخواست کی کہ وہ ہندوستانی افواج کو کشمیر بھیج کر ریاست کو قبائلی حملہ آوروں سے پاک کرنے میں ان کی امداد کرے۔

کشمیر پر قبائلیوں نے ۲۲ - اکتوبر کو حملہ کیا تھا اور یہ بات ظاہر ہے کہ حکومت ہند اس حملہ اور حملہ آوروں کی پیش رفت سے بے خبر نہیں رہ سکتی تھی۔ اس کے باوجود اس نے اس ریاست کے معاملات سے بے تعلق رہنے کا جو فیصلہ کر رکھا تھا اس کے پیش نظر اس نے اس اہم واقعہ پر بھی کوئی توجہ مبذول نہیں کی۔ چنانچہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے پریس اٹاشی مسٹر کیمپ بیل جانسن نے اپنی ڈائری میں لکھا ہے کہ عوام کے روبرو:

> قبائلیوں کے حملے کا تذکرہ پنڈت نہرو نے پہلی بار ۲۴ - اکتوبر ۱۹۴۷ء کو کیا تھا۔ دوسرے دن اس مسئلہ پر انڈین ڈیفنس کمیٹی میں غور کیا گیا اور کمیٹی نے اس امر کی حمایت کی کہ ۲۴ - اکتوبر کو مہاراجہ نے جو درخواست کی تھی اسی کے مطابق فوراً ہی ہندوستانی فوج کو کشمیر بھیج دیا جائے لیکن لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے اس رائے سے اختلاف کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ کوئی فوجی قدم اُٹھانے سے پہلے الحاق کا فیصلہ ہو جانا چاہیئے اور یہ الحاق عارضی اور استصواب رائے عامہ کے ساتھ مشروط ہونا چاہیئے۔ ان دو باتوں کا کوئی فیصلہ نہیں ہو سکا، لیکن جو ٹھوس فیصلہ ہُوا وہ یہ تھا کہ مینن[1] کو حالات

---

[1] مسٹر وی پی مینن سکرٹری انڈین اسٹیٹس منسٹری

کی وضاحت کے لئے سری نگر بھیجا جائے[1]:

اس فیصلہ کے مطابق مسٹر مینن نے سری نگر پہنچ کر مہاراجہ کو صورت حالات سے آگاہ کیا اور مہاراجہ کی دستاویز الحاق ہمراہ لے کر دوسرے ہی روز دہلی واپس آ گئے اور اس طرح ریاست جموں اور کشمیر ۲۶ - اکتوبر ۱۹۴۷ء سے ہندوستان کا ایک جزو بن گئی۔

ہندوستان کے ساتھ ریاست جموں اور کشمیر کے الحاق کے متعلق مہاراجہ نے ہندوستان کے گورنر جنرل لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو جو مکتوب روانہ کیا تھا اس میں یہ بھی مذکور تھا کہ:

"فی الحال میری ریاست میں جو حالات رونما ہو رہے ہیں اور جو ہنگامی صورت حال پیدا ہو گئی ہے اس کے پیش نظر میرے لئے ہندوستان سے مدد مانگنے کے علاوہ کوئی اور چارہ کار باقی نہیں۔ قدرتی طور پر ہندوستان کی حکومت اس وقت تک میری درخواست کے مطابق مجھے مدد نہیں دے سکتی جب تک میری ریاست ہندوستان کے ساتھ ملحق نہیں ہو جاتی۔ اس لئے میں نے الحاق کا فیصلہ کر لیا ہے اور میں آپ کی حکومت کی منظوری کے لئے اس مکتوب کے ساتھ دستاویز الحاق بھی منسلک کر رہا ہوں[2]۔"

لیکن الحاق کا یہ فیصلہ مہاراجہ ہی کا فیصلہ نہیں تھا بلکہ اس فیصلہ کو کشمیر نیشنل کانفرنس، یعنی کشمیر کے عوام اور عوامی رہنماؤں کی کامل تائید اور حمایت بھی حاصل تھی۔ چنانچہ شیخ عبداللہ نے ۱۹۴۸ء میں کہا تھا کہ،

"اس حملہ سے مجبور ہو کر ہم نے ہندوستان کا رخ کیا تھا اور وہ ہمیں بچانے

---

1. The Struggle for Kashmir P. 37

2 Govt. of India White Paper on J. & K. Pp. 46-47

کے لئے آیا تھا۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنی جمہوری روایات کو برقرار رکھتے ہوئے محض ہمیں مدد دینے کے لئے ہمارا الحاق منظور کیا تھا اور انتہائی شرافت کا ثبوت دیتے ہوئے آخری فیصلہ کو کشمیری عوام کی توثیق پر چھوڑ دیا تھا۔ دونوں مملکتوں کے طریق کار کے فرق کو سمجھنے کے لئے اس سے زیادہ روشن مثال نہیں مل سکتی۔

ہندوستانی فوج ہمیں بچانے کے لئے بروقت پہونچی اور اس نے کشمیر کی مدافعت کے سلسلہ میں جو خدمات انجام دیں وہ اس کے طرۂ امتیاز کی حیثیت رکھتی ہیں۔ بریگیڈیر عثمان، میجر شرما، کرنل رائے اور دوسرے بہادر سپاہیوں اور افسروں نے اپنی شجاعت اور جانی قربانیوں کی بدولت پاکستان کی جارحانہ پیش قدمی کو مسدود کر دیا۔ ان کی قربانیوں پر ہر کشمیری فخر محسوس کرتا ہے اور ہم وطن کے ان بہادر اور لائق سپاہی فرزندوں کو سلام کرتے ہیں[1]۔"

یہاں ان امور کو مدنظر رکھنا ضروری ہے کہ برصغیر ہند کی تقسیم کے ساتھ ساتھ ہندوستانی ریاستوں کے حکمرانوں کو ان کی ریاستوں کے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا حق بھی دیا گیا تھا اور مسلم لیگ کی طرف سے ۱۷ جون ۱۹۴۷ء کو مسٹر جناح نے ہندوستانی ریاستوں کے حکمرانوں کے اس حق فیصلہ کو تسلیم کرتے ہوئے اعلان کیا تھا کہ :

" برطانوی اقتدار اعلیٰ کے ختم ہو جانے کے بعد دستوری اور قانونی اعتبار سے ہندوستانی ریاستیں آزاد اور خود مختار ہو جائیں گی اور وہ اپنے مستقبل کا فیصلہ

---

1. Presidential Address, All J.K National Conference Annual Session 1949

کرنے میں بالکل آزاد ہوں گی۔ ان کے لئے ہندوستان اور پاکستان کی مجالس دستور ساز میں سے کسی ایک میں شامل ہو جانے یا آزاد رہنے کی راہیں کھلی ہوئی ہیں۔[1]"

اس حق کے ساتھ ساتھ ہندوستانی ریاستوں کو، ہندوستان اور پاکستان کے ساتھ اسٹینڈ اسٹل اگریمنٹ کر لینے کا اختیار بھی دیا گیا تھا اور تقسیم کے سرکاری اعلان سے قبل مہاراجہ نے پاکستان میں قائم ہونے والی حکومت کے ساتھ یہ معاہدہ بھی کر لیا تھا، ہندوستان کو کشمیر کے الحاق کے سوال سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ نہ صرف پاکستان کے ساتھ اس کے الحاق ہی پر کوئی اعتراض نہیں کرنا چاہتا تھا بلکہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے پریس اتاشی مسٹر کیمپل جانسن کی یادداشت کے مطابق

"درحقیقت ہندوستان کی ریاستی وزارت، پٹیل کی زیر ہدایت، اپنے عمومی طریقہ کار کے برعکس، کشمیر کے معاملہ میں کوئی ایسا قدم اُٹھانا نہیں چاہتی تھی جس کے متعلق کہا جا سکے کہ ہندوستان نے یہ قدم کشمیر کو الحاق پر مجبور کرنے کے لئے اُٹھایا ہے اور اس نے پاکستان کو اس بات کا یقین دلانے میں بھی اپنے عمومی طریق کار سے انحراف کیا تھا کہ اگر کشمیر اس کے ساتھ ملحق ہو جائے گا تو ہندوستان اس الحاق کو ناقص قرار نہیں دے گا۔[2]"

پھر جہاں تک کشمیر نیشنل کانفرنس کے رہنماؤں کا تعلق ہے وہ مہاراجہ کی حکومت سے آزاد ہونے سے پہلے الحاق کے متعلق کوئی فیصلہ نہیں کرنا چاہتے تھے اور پاکستان کے ارباب حل و عقد کو اس بات کا یقین بھی دلاتے رہے تھے کہ وہ الحاق کا فیصلہ کرتے ہوئے اس مخالفت

---

1. Dawn, 18.6.47

2. The Struggle for Kashmir Pp.37, 38

کو بھی نظر انداز کر دیں گے جو کشمیریوں کی تحریک آزادی کے سلسلہ میں مسلم لیگ کی طرف سے
کی جاتی رہی تھی اور ان تمام باتوں کی موجودگی میں یقین کے ساتھ یہ بات نہیں جا سکتی تھی کہ
ریاست کے حکمران یا اس مطلق العنان حکومت کے خاتمہ کے بعد الحاق کے سلسلہ میں کشمیری عوام
کا فیصلہ کیا ہوگا۔ اس کے باوجود کشمیر پر پاکستان کی طرف سے اچانک حملہ کیا گیا اور اس
ہنگامی صورت حالات کے پیش نظر جب ریاست کے حکمراں اور عوامی رہنماؤں کی طرف سے
ہندوستان کے ساتھ ریاست کے الحاق کی درخواست کی گئی تو ہندوستان نے محض کشمیر اور
اس کے باشندوں کو تباہی سے بچانے کے لئے ان کی اس درخواست کو منظور کیا تھا اور ان
تمام حقائق کی موجودگی میں نہ تو الحاق کو قانونی اعتبار سے ناقص اور ناجائز کہا جا سکتا ہے
اور نہ ہندوستان پر یہ الزام لگایا جا سکتا ہے کہ اس نے کشمیر کو الحاق کے لئے مجبور
کیا تھا۔

ریاست کے مستقبل کے فیصلہ کو موخر کرنے کے سلسلہ میں مہاراجہ اور نیشنل کانفرنس کے
رہنما جو کچھ کرتے رہے اور اس معاملہ میں ہندوستان غیر جانبداری اور احتیاط کی جس حکمت عملی
پر کاربند رہا تھا سطور بالا میں اس کی وضاحت کی جا چکی ہے لیکن کشمیر کے باشندے الحاق
کے فیصلہ کو ملتوی کر لے اور اس فیصلہ سے قبل اس وقت کی مطلق العنان حکومت سے نجات
پانے کے جس درجہ خواہش مند تھے اس کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ ہندوستان
کے ساتھ الحاق کے فیصلہ کے باوجود شیخ محمد عبد اللہ نے ۳۱۔ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو ایک مرتبہ پھر
پاکستان کے ارباب حکومت کو مصالحت کی دعوت دیتے ہوئے کہا تھا کہ:

میں مسٹر جناح سے درخواست کرتا ہوں کہ انہیں ریاست جموں و کشمیر
کے باشندوں کے حق بالاتری کے جمہوری اصول کو تسلیم کر لینا چاہیئے۔ ریاست
کی آبادی ۷۸ فیصد مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ زندگی کے معاملہ میں ان کی آزاد

رائے کو ضرور مدِنظر رکھا جانا چاہیئے۔ میں مسٹر جناح سے درخواست کرتا ہوں
کہ وہ حملہ آوروں کو واپس بلانے میں اپنے اثر اور اپنی طاقت کو استعمال کریں
اور اگر وہ چاہیں تو میں ان سے ملنے کے لئے کراچی آنے پر بھی رضامند ہوں[1]۔"

لیکن مسٹر جناح کی طرف سے مصالحت کی اس دعوت کا کوئی جواب نہیں دیا گیا تھا حالانکہ جولائی ۱۹۴۷ء کے اواخر میں مسٹر جناح نے ایک بیان دیتے ہوئے کہا تھا کہ:

"اگر کوئی ریاست، پاکستان کے ساتھ الحاق، کوئی سمجھوتہ یا معاہدہ کرنا چاہے گی تو پاکستانی مجلسِ دستور ساز کی گفت و شنید کرنے والی کمیٹی اگر اس کا قیام عمل میں آچکا ہوگا یا پھر حکومتِ پاکستان کے نمائندے، باہمی تعلقات کی شرائط طے کریں گے[2]۔"

اس اعلان کے مطابق پاکستان کو مذکورہ بالا دعوتِ مصالحت کو قبول کر لینا چاہیئے تھا، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یا تو پاکستان کے اربابِ حکومت نیشنل کانفرنس کے رہنماؤں کو باشندگانِ کشمیر کا نمائندہ نہیں سمجھتے تھے اس لئے وہ ان کی مذکورہ بالا درخواست کو اپنے اعلان کے دائرہ سے خارج تصور کرتے تھے یا پھر وہ خود کو قبائلیوں کے حملے کا ذمہ دار سمجھتے تھے اور اس معاملہ پر گفت و شنید کو بے سود یقین کرتے تھے۔

جہاں تک نیشنل کانفرنس کے رہنماؤں کی نمائندہ حیثیت کا تعلق ہے اول تو وہ، ریاستی نظم ونسق کے معطل ہو جانے کے بعد ایک ایسی حکومت کی سربراہی کر رہے تھے جو بعد میں کشمیر کی دستوری اور قانونی حکومت ثابت ہوئی ہے لیکن اگر اس حقیقت کے باوجود اس بات کو تسلیم کر لیا جائے کہ پاکستان کشمیر کی اس ہنگامی حکومت یا نیشنل کانفرنس کو کوئی حیثیت

---

1. Hindustan Times, 2.11.47
2. Dawn, 31.7.47

دینا نہیں چاہتا تھا تو قدرتی طور پر یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ وہ مہاراجہ ہی کو ریاست کا حقیقی حکمران یقین کرتا تھا اور اس حال میں اسے مہاراجہ کے فیصلۂ الحاق کو جائز سمجھنا چاہیئے تھا اور اگر شیخ محمد عبداللہ کی اس دعوتِ مصالحت کو اس نے اس بنا پر قبول نہیں کیا تھا کہ وہ خود کو قبائلیوں کے حملہ کا ذمہ دار اور اس کے ساتھ وابستہ نہیں سمجھتا تھا تو اس کی تردید کے لئے صرف اس قدر سمجھ لینا ضروری ہے کہ جس روز ہندوستانی افواج وادیٔ کشمیر میں داخل ہوئی تھیں اسی روز مسٹر جناح نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن اور پنڈت جواہر لال نہرو کو لاہور آ کر کشمیر کے معاملہ پر گفت و شنید کی دعوت دی تھی اور اگرچہ اسی وقت پنڈت نہرو لاہور نہیں جا سکے تھے لیکن لارڈ ماؤنٹ بیٹن اور مسٹر جناح کے درمیان یکم نومبر کو لاہور ہی میں اس سوال پر تبادلۂ خیالات ہوا تھا اور اگرچہ گفت و شنید اصل سوال کو حل کرنے کے زاویۂ نظر سے ناکامیاب ثابت ہوئی تھی لیکن اس سے مسٹر جناح کا طرزِ عمل اور زاویۂ نظر واضح ہو گیا تھا۔ چنانچہ مائیکل بریچیر نے لکھا ہے کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے بیان کے مطابق:

"مسٹر جناح نے اپنی گفتگو کا آغاز ہندوستان کے خلاف اس اعتراض سے کیا کہ اس نے پاکستان کو کشمیر کے الحاق اور وہاں ہندوستانی افواج بھیجنے کی اطلاع دیر سے دی ہے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ یہ الحاق اس لئے جائز نہیں کہ اس کی بنیاد تشدد پر رکھی گئی ہے۔ میں نے جواب دیا کہ بے شک یہ الحاق تشدد پر مبنی ہے لیکن یہ تشدد قبائلیوں سے سرزد ہوا ہے ہندوستان سے سرزد نہیں ہوا۔

مسٹر جناح کی اولین تجویز یہ تھی کہ کشمیر سے تمام مسلح افواج کو بیک وقت واپس بلا لیا جائے اور جب میں نے دریافت کیا کہ قبائلیوں کو واپسی پر

کس طرح مجبور کیا جا سکتا ہے تو مسٹر جناح نے جواب دیا کہ اگر آپ ہندوستانی افواج کو واپس بلا لیں تو میں تمام قضیہ کو ختم کر دوں گا[1]"

اور اس گفتگو کے پیش نظر یہ کہنے کی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی کہ پاکستان خود کو قبائلیوں کے حملے کا ذمہ دار نہیں سمجھتا تھا یا وہ اس کے ساتھ وابستہ نہیں تھا۔

"یہاں معاملے کے اس پہلو کو بھی مدنظر رکھنا چاہیئے کہ لارڈ برڈ وڈ کے بیان کے مطابق مسٹر جناح کو کشمیر میں ہندوستان کے فوجی اقدام کی اوّلین اطلاع ۲۷، اکتوبر ۱۹۴۷ء کی شام کو لاہور میں ملی تھی .... اور انھوں نے اسی وقت ٹیلی فون کے ذریعے سے راولپنڈی میں جنرل گریسی کو یہ ہدایت دے دی تھی کہ وہ پاکستانی افواج کو وادیٔ جہلم میں بھیج دیں[2]۔"

لیکن جیسا کہ اسی باب میں کسی دوسری جگہ بتایا جا چکا ہے دوسرے دن مسٹر جناح کو اپنی یہ ہدایت واپس لے لینی پڑی تھی۔ اس حال میں قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر پاکستان کو قبائلیوں کے حملہ کے ساتھ کوئی تعلق نہیں تھا تو وہ وادیٔ کشمیر میں ہندوستانی افواج کے داخلہ کی خبر پا کر وہاں پاکستانی افواج کس لئے بھیجنا چاہتے تھے۔ ان کے اس حکم کا ایک مطلب تو یہ ہو سکتا ہے کہ وہ قبائلی حملہ آوروں کو باقاعدہ فوجی مدد دیکر کشمیر پر ان کے غاصبانہ اور جارحانہ حملے کو جاری رکھنا چاہتے تھے اور اس صورت میں پاکستان اس حملہ سے اپنے کو بری الذمہ ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا اور مسٹر جناح کے اس حکم کا دوسرا مطلب یہ لیا جا سکتا ہے کہ وہ ہندوستان کے ساتھ کشمیر کے الحاق کے

---

1. The Struggle for Kashmir P. 39

2. Two Nations & Kashmir P. 61

فیصلہ سے بے خبر تھے اور کشمیر میں ہندوستانی فوجوں کے داخلہ کے بعد اپنی اس لاعلمی کی حالت میں وہ پاکستانی افواج کو کشمیر میں بھیجنا اپنا ایک جائز حق سمجھتے تھے لیکن جیسا کہ سطور بالا میں بتایا جا چکا ہے انھوں نے ۲۷۔ اکتوبر ہی کو لارڈ ماؤنٹ بیٹن اور پنڈت جواہرلال نہرو کو لاہور آکر کشمیر کے معاملہ پر تبادلۂ خیالات کرنے کی دعوت بھی دی تھی اور اس بات سے ثابت ہو جاتا ہے کہ انھیں وادیٔ کشمیر میں ہندوستانی افواج کے داخلہ کی اطلاع کے ساتھ کشمیر کے الحاق کی اطلاع بھی مل چکی تھی اور وہ جان بوجھ کر ہندوستان کے خلاف جارحانہ پیش قدمی شروع کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ لارڈ برڈوڈ نے پاکستانی افواج کو کشمیر میں بھیج دینے کے حکم کی تنسیخ پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ :-

> "۲۸۔ اکتوبر کی صبح کو آکن لک (سپریم کمانڈر افواجِ ہند اور پاکستان) اور گریسی (کمانڈر ان چیف افواج پاکستان) مسٹر جناح سے ان کا حکم منسوخ کرانے میں کامیاب ہو گئے۔ مسٹر جناح کے لئے یہ ایک صبر آزما فیصلہ تھا اور ان کی مایوسی کا احساس اس لئے حدِ انتہا کو پہنچا ہوا تھا کہ انھیں ایک ایسے ملک سے محروم اور دست کش ہونا پڑ رہا تھا جسے وہ نسلی اور اقتصادی لحاظ سے پاکستان کا ایک حصہ سمجھتے تھے۔"[۱]

اور ان سطور سے جنھیں لکھنے والے نے اپنی تحریر کی ہر ہر سطر میں پاکستان کے مؤقف کو صحیح ثابت کرنے کی کوشش کی ہے یہ سمجھ لینا کوئی دشوار کام نہیں رہ جاتا کہ پاکستان ریاست جموں اور کشمیر کے معاملہ میں کسی قانونی یا جمہوری اصول پر عمل درآمد کرنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ وہ اس سلسلہ میں کشمیر کے باشندوں کی خواہشات کو بھی کوئی وقعت دینا

1- Two Nations & Kashmir B: 61

نہیں چاہتا تھا۔ اس نے ابتداء ہی سے اس ریاست کو پاکستان کا ایک حصہ تصور کر رکھا تھا حتیٰ کہ اس کے ارباب حکومت ہندوستان کے ساتھ اس کے الحاق کے باوجود بزور شمشیر اس پر قبضہ کر لینا چاہتے تھے لیکن مسٹر جناح کو جس بات نے ان کے حکم کی تنسیخ پر آمادہ کیا تھا وہ یہ تھی کہ:

"اس وقت پاکستان کی باقاعدہ فوج میں کسی مہم کو شروع کرنے کی قوت اور اہلیت موجود نہیں تھی۔ پاکستانی فوج کے دو یا تین دستے کشمیر میں داخل ہو کر سری نگر کو پاکستان کے لئے فتح تو کر سکتے تھے لیکن وہ (پاکستانی افواج) پاکستانی مغربی پنجاب پر ہندوستانی فوج کے براہ راست حملہ کی جو ان حالات میں یقیناً کیا جا سکتا تھا مدافعت نہیں کر سکتی تھیں[۱]۔"

غرضیکہ قبائلیوں کے حملہ کی بدولت ہندوستان کے الحاق کا جو فیصلہ کیا گیا تھا اس کی قطعیت اور قانونی جواز پر اس دور میں بھی کوئی اعتراض نہیں کیا جا سکتا تھا اور جیسا کہ آئندہ ابواب سے واضح ہوگا آج تو اس الحاق کے جواز کو معرض بحث میں لانے کی کوئی گنجائش ہی باقی نہیں ہے۔

1- Two Nations & Kashmir P. 61

پانچواں باب

تنازعہ کی حقیقت

گذشتہ باب کے مطالعہ کے بعد یہ حقیقت پوشیدہ نہیں رہ سکتی کہ ہندوستان کے ساتھ ریاست جموں اور کشمیر کے الحاق کو کشمیر کے تنازعہ کی بنیاد قرار دیا گیا ہے لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے اور کشمیر کا تنازعہ صرف اس بات پر مبنی ہے کہ پاکستان اس ریاست کو ہر قیمت پر اپنے ساتھ ملحق کر لینا چاہتا ہے۔

یہاں تفصیل کے ساتھ اس بات کے اعادہ کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی کہ ہندوستان کے تقسیم کے منصوبہ کے ساتھ ساتھ ہندوستانی ریاستوں کے حکمرانوں کو یہ حق بھی دیا گیا تھا کہ وہ ۱۵-اگست ۱۹۴۷ء سے پہلے یا تو ہند اور پاکستان میں سے کسی ایک مملکت کے ساتھ وابستہ ہو سکتے ہیں یا اپنی آزادی کا اعلان کر سکتے ہیں۔ اس فیصلہ یا اصول کو مسٹر جناح نے غیر مشروط طور پر تسلیم کر لیا تھا لیکن کانگریس چونکہ ریاستی عوام کے جمہوری حقوق کی حمایت کرتی رہی تھی اس لئے اس نے اس اصول کو کسی قدر تامل کے ساتھ قبول کیا تھا لیکن :-

"مسٹر کیمپل جانسن کی شہادت کے مطابق اس نے اس اصول کو تسلیم کر

لینے کے بعد الحاق کے اہم فیصلہ کے سلسلہ میں مہاراجہ کی رائے کو متاثر کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی تھی۔[1]

اور لارڈ برڈ وڈ نے جو اپنی تحریر کی ہر سطر میں پاکستان کے نظریات اور اقدامات کو جائز ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے اس معاملہ میں ہندوستان کی حکمت عملی کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ:۔

"بلاشبہ اس بات کا کوئی ثبوت موجود نہیں کہ ہندوستان نے کشمیر کے معاملہ میں کوئی مداخلت کی تھی۔[2]"

لیکن اس سلسلے میں قوی ترین شہادت ہندوستان کے وزیراعظم پنڈت جواہر لال نہرو کا وہ بیان ہے جو انھوں نے ۲۵ نومبر ۱۹۴۷ء کو ہندوستان کی مجلسِ دستور ساز میں دیا تھا اور اپنے اس بیان میں موصوف نے کہا تھا کہ:۔

"ایوان اس امر سے واقف ہے کہ امسال ۱۵۔ اگست کو تاج کی بالادستی ختم ہو جانے کے بعد کشمیر دونوں مملکتوں میں سے کسی ایک کے ساتھ بھی وابستہ نہیں ہوا تھا بلاشبہ ہمیں اس بات سے گہری دلچسپی تھی کہ ریاست کا فیصلہ کیا ہوگا۔ اس کے باوجود ہم نے اسے ہندوستان کے ساتھ ملحق ہو جانے کے لئے بالکل بھی مجبور نہیں کیا، کیونکہ ہم کشمیر کی مشکلات کو جانتے تھے۔[3]"

---

1. The Struggle for Kashmir P. 41
2. Two Nations & Kashmir P. 61
3. Kashmir 1947-56 P. 5

اور ان شہادتوں کی موجودگی میں جب یہ ثابت ہو جاتی ہے کہ ہندوستان نے مہاراجہ کو کسی لحاظ سے بھی الحاق پر مجبور نہیں کیا تھا اور خود مہاراجہ نے اپنے اس حق کو جسے مسلم لیگ کی طرف سے مسٹر جناح نے تسلیم کر لیا تھا، آزادانہ طریقہ پر استعمال کر کے ہندوستان کے ساتھ اپنی ریاست کے الحاق کا فیصلہ کیا تھا تو یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ خود الحاق کا فیصلہ اس تنازعہ کی بنیاد نہیں ہے بلکہ اس تنازعہ کی حقیقی بنیاد یہ ہے کہ پاکستان ریاست جموّں اور کشمیر کو لارڈ ریڈکلف کی تفصیل کے مطابق نسلی اور اقتصادی لحاظ سے اپنا ایک حصّہ یقین کرتا تھا اور ہندوستان کے ساتھ ریاست کے الحاق کے فیصلے نے اس کے اس یقین کو کامل مایوسی میں تبدیل کر دیا تھا اور برصغیر ہند کی تقسیم کے بعد ریاست جموّں اور کشمیر سے متعلق جو واقعات رونما ہوتے رہے تھے انھیں ترتیب وار مطالعہ کرنے کے بعد اس کے علاوہ کوئی اور نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتا کہ پاکستان نہ تو ریاست جموّں اور کشمیر کی آزادی کو برداشت کرنے کے لئے تیار ہو سکتا تھا اور نہ وہ ہندوستان کے ساتھ اس کے الحاق ہی کو گوارا کر سکتا تھا۔

گزشتہ باب میں اس امر کی طرف اشارہ کیا جا چکا ہے کہ برصغیر ہند کی تقسیم کے بعد ریاست جموّں اور کشمیر عملاً ہندوستان سے علیحدہ ہو گئی تھی۔ ہندوستان سے وادیٔ کشمیر تک جانے والا وہ راستہ جو درہ بانہال سے ہو کر گزرتا ہے اس وقت موسم سرما میں بند ہو جاتا تھا لیکن وادیٔ کشمیر سے راولپنڈی تک جانے والا راستہ ہر موسم میں کھلا رہتا تھا، اسی لئے تقسیم کے بعد ریاست سے متعلق رسل و رسائل، نقل و حمل اور ضروریات زندگی کی بہم رسانی کی تمام تر ذمہ داری پاکستان پر عاید ہو گئی تھی۔ چنانچہ جب مہاراجہ نے پاکستان کے ساتھ "اسٹینڈ اسٹل اگریمنٹ" کرنے کی خواہش کا اظہار کیا تو پاکستان کے ارباب حل و عقد کو مذکورہ بالا واقعات کی بنا پر اس امر کا کامل یقین تھا کہ انجام کار مہاراجہ کو پاکستان

کے ساتھ الحاق کا فیصلہ کرنا پڑے گا۔[1]

اپنے اس مفروضہ کے باوجود پاکستان کے ارباب حکومت ریاست کے حکمراں اور عوام کو الحاق کے سوال پر سکون اور اطمینان کے ساتھ غور کرنے کا موقع نہیں دینا چاہتے تھے۔ اس لئے اسٹینڈ اسٹل اگریمنٹ کے بعد انھوں نے ریاست کی اقتصادی ناکہ بندی کرکے اسے الحاق پر مجبور کر دینے کی ہر ممکن کوشش کی تھی اور عوام کی ضرورتوں میں کام آنے والی بنیادی اشیاء مثلاً غلہ، نمک، شکر اور پیٹرول وغیرہ کی فراہمی سے انکار کر کے حصول مقصد کے لئے ریاست کے باشندوں پر زیادہ سے زیادہ دباؤ ڈالا تھا۔[2]

اسٹینڈ اسٹل اگریمنٹ کے باوجود پاکستان نے ریاست پر جو اقتصادی دباؤ ڈالا تھا اس کے بنیادی مقصد کو لارڈ برڈ ووڈ نے بھی ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ:۔

"جہاں تک اس وقت کی حکومت پاکستان کا تعلق ہے، شہادتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ اقتصادی دباؤ ڈال کر مہاراجہ کو الحاق پر مجبور کر دینا چاہتی تھی لیکن اس کی اس حکمت عملی سے خود اسی کے مفادات کو نقصان پہونچنا چاہیئے تھا۔ ہند اور پاکستان میں اس وقت انتشار اور بدنظمی کا جو عالم موجود تھا اس کی بدولت کشمیر کے سیاحتی کی تجارت مردہ ہو چکی تھی اس پر مستزاد یہ کہ پاکستان نے کشمیری مصنوعات کی فروخت پر پابندی عائد کر دی تھی اور ان امور کی بدولت ریاست تقریباً دیوالیہ ہو گئی تھی۔[3]"

---

1. The Struggle for Kashmir Pp. 23-24
2. Kashmir-1947-56 P. 5
3. Two Nations & Kashmir Pp. 46, 50

یہ امر محتاج بیان نہیں کہ اگرچہ الحاق کے فیصلہ کو ملتوی کرنے کے معاملہ میں مہاراجہ اور عوامی رہنماؤں کا زاویۂ نظر مختلف تھا لیکن وہ دونوں الحاق کے فیصلہ کے التوا پر پوری طرح متفق الرائے تھے اور مہاراجہ نے پاکستان کے ساتھ جو اسٹینڈ اسٹل اگریمنٹ کیا تھا وہ بھی ان کی اسی خواہش اور کوشش کا مظہر تھا۔ چنانچہ اقتصادی دباؤ کے باوجود جب پاکستان مہاراجہ سے الحاق کا فیصلہ کرانے میں کامیاب نہیں ہو سکا تو اس کے ارباب حکومت نے مسلح پاکستانیوں کو ریاست میں بھیجا اور اپنے ہمنوا ریاستی عناصر کو فتنہ و فساد برپا کرنے پر آمادہ کرنا شروع کر دیا۔ حتیٰ کہ ان ہی عناصر کی بدولت پونچھ میں باقاعدہ بغاوت بھی برپا ہوئی۔ اس بغاوت کے متعلق لارڈ برڈ وڈ نے لکھا ہے کہ:

"اکتوبر کے وسط تک، پونچھ کی بغاوت کو، قدرتی طور پر اُس کے ان غیر سرکاری پاکستانیوں کی امداد ملنے لگی تھی جو بغاوت کے حامی تھے اور جنھیں صرف دریائے جہلم نے پونچھ سے علیحدہ کر رکھا تھا اور یقینی بات یہ ہے کہ وہ دریائے جہلم کی راہ سے باغیوں کے لئے برابر اسلحہ بھیج رہے تھے[1]۔"

اس صورت حال کے پیش نظر ۱۵۔ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو مہاراجہ نے بذریعہ تار کراچی کو اپنی اس تجویز سے مطلع کیا تھا کہ حالات کی غیر جانبدارانہ تحقیقات کرائی جائے اور اس کے ساتھ ہی اس تار میں یہ بھی لکھا تھا کہ:

"اگر بدقسمتی سے اس تجویز پر کوئی توجہ مبذول نہ کی گئی تو میری حکومت اپنی مرضی کے خلاف اس بات پر مجبور ہو جائے گی کہ وہ ریاست کی سرحدوں پر پاکستانیوں کے جارحانہ اور غیر دوستانہ اقدامات کو روکنے کے لئے امداد کی درخواست کرے[2]۔"

1-2. Two Nations & Kashmir Pp. 46, 50

پھر ۱۶۔ اکتوبر کو بھی مہاراجہ کی جانب سے ایک ایسا ہی تار روانہ کیا گیا تھا جس کے جواب میں پاکستان کے گورنر جنرل نے لکھا تھا کہ :۔

"بیرونی امداد حاصل کرنے کی دھمکی آپ کی حکومت کی اس حکمت عملی کو واضح کرتی ہے کہ وہ ہندوستان کے ساتھ شمولیت کے لئے بہانہ تلاش کرنا چاہتی ہے اور ہندوستان کی امداد اور مداخلت سے حالات کو بدل دینا چاہتی ہے۔[1]"

لیکن اس صورت میں کہ مسٹر جناح الحاق کے فیصلہ کے متعلق ہندوستانی ریاستوں کے حکمرانوں کی رائے کو قطعی اور آخری سمجھنے کے اصول کو تسلیم کر چکے تھے انھیں مہاراجہ اور ان کی حکومت کے خلاف اس بنا پر کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیئے تھا کہ وہ ریاست کو ہندوستان کے ساتھ ملحق کرنے کا فیصلہ کرنا چاہتے ہیں۔

بہرحال جب یہ طریقہ کار بھی ریاست کو پاکستان کے ساتھ ملحق کرانے میں کامیاب ثابت نہ ہو سکا تو پھر ریاست پر وہ جارحانہ حملہ کیا گیا جسے قبائیلیوں کے حملہ سے موسوم کیا جاتا ہے اور اس طرح ریاست پر بہ جبر قبضہ کر لینے کی کوشش کی گئی اور اس طرح مائیکل بریچر کی اس رائے سے اختلاف کرنے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ :۔

"اگرچہ مسلم لیگ نے (ریاستوں کے مستقبل کے متعلق) حکمرانوں کی کامل آزادی کے اصول کو تسلیم کر لیا تھا لیکن وہ کشمیر کے سوال کی بازی کو اس درجہ اہم سمجھتی تھی کہ وہاں مہاراجہ کو ریاست کے مستقبل کا فیصلہ کرنے کی آزادی نہیں دینا چاہتی تھی۔ اور حقیقت یہ ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ پاکستان نے بھی یہ اٹل فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ جس قیمت پر بھی ہو سکے گا کشمیر کو

I. Danger in Kashmir By J. Korbel Pp. 68, 69

حاصل کر کے رہے گا۔[1] "

اور پاکستان کا یہی وہ فیصلہ ہے جس نے کشمیر کے سادہ سے معاملہ کو ایک تنازعہ بنا رکھا ہے۔

ریاست جموں اور کشمیر کے سلسلہ میں پاکستان کی دراز دستیوں اور جارحانہ کارروائیوں کی داستان اس جگہ ختم نہیں ہو جاتی بلکہ اس کا تاریک ترین باب ۲۶۔ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو اس وقت سے شروع ہوتا ہے جب ہندوستان نے مہاراجہ کی درخواست اور کشمیر کے عوامی رہنماؤں کی تائید و حمایت کی بنا پر اس ریاست کا الحاق منظور کیا تھا اور جس کے بعد تقسیم ہند کے فیصلہ نیز بین اقوامی دستور کے مطابق پاکستان کو کشمیر سے اپنے مسلّح شہریوں اور قبائلی حملہ آوروں کو واپس بلا لینا چاہیئے تھا لیکن جیسا کہ گذشتہ باب میں بتایا جا چکا ہے مسٹر جناح نے الحاق کی اطّلاع پانے کے بعد ریاست جموں اور کشمیر پر بہ جبر قبضہ کر لینے کا فیصلہ کیا تھا اور اگر اس وقت پاکستان کی باقاعدہ افواج میں اس ریاست پر حملہ کر کے اس پر قبضہ کر لینے یا پھر اپنے اس اقدام کے نتائج کا مقابلہ کر لینے کی صلاحیت موجود ہوتی تو یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ وہ کسی حالت میں بھی اپنے فیصلہ کو تبدیل کرنے پر آمادہ نہ ہوتے۔ لیکن کشمیر میں باقاعدہ پاکستانی افواج کے داخلہ کے حکم کی تنسیخ کے باوجود ریاست پر قبضہ کر لینے کے سلسلے میں پاکستان کی جد و جہد میں کوئی فرق نہیں آیا تھا اور ۲۷۔ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو کشمیر میں ہندوستانی افواج کے پہونچنے کے بعد پاکستان اپنے مقصد کے حصول کی جو کوششیں کر تا رہا تھا اس کا اندازہ ہندوستان کے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو کے اس بیان سے بخوبی کیا جا سکتا ہے جو موصوف نے ۲۔ جنوری ۱۹۴۸ء کو نئی دہلی میں اخباری نمائندوں کے ایک اجتماع میں دیا تھا۔ اور اس بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ:

1— The Struggle for Kasi mir P. 41

"ہماری افواج نے ۲۷۔اکتوبر کو کشمیر میں پہونچ کر وادی اور شہر سری نگر کو بچا لیا تھا اور وادیٔ جہلم کے راستہ پر دشمن کو اوڑی تک پسپا کر دیا تھا۔
اس وقت سے ریاست کشمیر اور پاکستان کی تقریباً تمام سرحد تک لڑائی ہوتی رہی ہے۔ جدید اسلحہ سے مسلح لوگ بڑے بڑے جنگی گروہوں کی شکل میں بہت سے مقامات پر ریاست میں آتے رہے ہیں اور ان سے کہیں زیادہ تعداد میں لوگ سرحد کے ساتھ ساتھ پاکستان کے اندر جمع ہوتے رہے ہیں۔
ان حملہ آوروں کے لئے پاکستان کے یہ سرحدی علاقے جارحانہ اقدامات کے مستقر بنے ہوئے ہیں اور ان ہی مستقروں کی حفاظت میں یہ لوگ بہت بڑی تعداد میں سرحد کے پار، ریاست کشمیر کے علاقہ میں آکر جو ہندوستان کا علاقہ ہے چھاپے مارتے، آگ لگاتے اور لوٹ مار کرتے ہیں۔
اگر ہندوستان کی حکومت اپنی مدافعت کے پیش نظر ان مستقروں پر حملہ کر کے ان حملہ آوروں کے مرکزوں کو ختم کر دیتی تو وہ حق بجانب ہوتی لیکن وہ ایسا کرنے سے صرف اس لئے گریزاں رہی کہ اول تو وہ لڑائی کے دائرے کو محدود رکھنا چاہتی تھی اور دوسرے اسے امید تھی کہ پاکستان کی حکومت حملہ آوروں کو امداد اور اسلحہ دینا بند کر دے گی۔
پچھلے دو مہینوں میں پاکستان کی حکومت سے متواتر درخواستیں کی جاتی رہی ہیں کہ وہ ہندوستان پر حملہ کرنے کے سلسلے میں اپنے علاقے کے استعمال کو روک دے لیکن یہی نہیں کہ اس نے ایسا نہیں کیا بلکہ یہ بھی ایک حقیقت ثابت ہے کہ ان حملہ آوروں کو جن کی بہت بڑی تعداد پاکستانیوں پر مشتمل ہے حکومت پاکستان کی طرف سے ہر طرح امداد ملتی رہی ہے۔

انہیں موٹر گاڑیوں اور ریل گاڑیوں میں سوار ہو کر پاکستانی علاقہ سے گذرنے کی اجازت دی جاتی رہی ہے انہیں پٹرول، خوراک اور رہائش گاہیں مہیا کی جاتی رہی ہیں ان کے پاس جو اسلحہ ہیں وہ پاکستانی فوج کے اسلحہ ہیں اور کشمیر کی لڑائی کے میدان میں ہمارے سپاہیوں نے پاکستانی فوجیوں کو بھی گرفتار کیا ہے .... پاکستان نے اس حملہ کو روکنے کے لئے نہ صرف کوئی موثر قدم ہی نہیں اُٹھایا بلکہ اس نے ان حملہ آوروں کو ان کے اس جارحانہ اقدام سے باز رہنے کی دعوت دینے سے بھی انکار کر دیا۔

حکومت ہند اس بات کو نظر انداز نہیں کر سکتی کہ ایک دوست اور ہمسایہ ملک کے علاقہ کو ہندوستان پر جارحانہ حملہ کے لئے استعمال کیا جائے لیکن اس وقت تک کوئی کارروائی کرنے سے بچنے کے لئے جب تک حالات اسے مجبور ہی نہ کر دیں اس نے اس معاملہ کو مجلسِ تحفظ میں پیش کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔

۲۲۔ دسمبر ۱۹۴۷ء کو پاکستان کے وزیر اعظم سے باقاعدہ تحریری درخواست کی گئی تھی۔ اس مراسلہ میں پاکستان کے جارحانہ اقدامات اور پاکستان کی طرف سے حملہ آوروں کو دی جانے والی امداد کی صورتوں کو اختصار کے ساتھ بیان کرنے کے بعد حکومت پاکستان سے کہا گیا تھا کہ وہ پاکستانی شہریوں کو جموں اور کشمیر پر حملہ میں شریک ہونے سے روک دے اور حملہ آوروں کو (۱) پاکستانی علاقہ میں آنے اور اس علاقہ کو ریاست جموں اور کشمیر پر حملہ کے لئے استعمال کرنے کی اجازت نہ دے (۲) انہیں فوجی اور دوسرے قسم کے سامان کی بہم رسانی بند کر دے اور (۳) انہیں ایسی کوئی امداد نہ دے جس سے موجودہ کشمکش کے طویل ہونے میں مدد مل سکتی ہو۔

حکومت ہند نے ایک مرتبہ پھر پاکستان کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم رکھنے کے سلسلے میں اپنی مخلصانہ خواہش کا اظہار کیا تھا اور اسے توقع تھی کہ اس کی درخواست پر فوری اور غیر مشروط توجہ مبذول کی جائے گی۔ ۔ ۔ ۔ اس باقاعدہ درخواست کا کوئی جواب موصول نہیں ہوا تھا اور دو مرتبہ یاد دہانی بھی کرائی گئی تھی۔[1]"

اس زمانہ میں پاکستان کا جو منظر یہ اور طریقۂ کار رہا تھا اس کے متعلق لارڈ برڈ وڈ نے لکھا ہے کہ:۔

"جون ۱۹۴۹ء میں جب پاکستان کے چیف آف اسٹاف جنرل سفیر خاں اقوام متحدہ کے کمیشن سے بات چیت کرنے کے لیے دہلی آئے اور اپنے پرانے دوست جنرل کلونت سنگھ سے ملے تو دوران گفتگو میں شیر خاں نے بتایا کہ ہمارا مقصد یہ تھا کہ پہلے تو ہندوستانی افواج کو منتشر کر دیا جائے اور اس کے بعد اقوام متحدہ کی مؤثر مداخلت کا انتظار کیا جائے۔[2]"

اور اس حکمت عملی کے سلسلہ میں اپنی اس رائے کا اظہار بھی کیا ہے کہ:

نومبر ۱۹۴۷ء تک پاکستان، ہندوستان سے فیصلہ کن مقابلہ کی جس حکمت عملی پر کاربند رہا تھا وہ سیاسی اعتبار ہی سے نہیں بلکہ فوجی لحاظ سے بھی اس کے لئے بری تھی۔[3]"

غرضیکہ ان اقتباسات سے جہاں یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ پاکستان ابتداء ہی سے کشمیر

---

1. Kashmir 1947-56 Pp. 8, 9
2. Two Nations & Kashmir P. 78
3. " " " — P. 77

پر قبضہ کر لینے کا خواہش مند تھا اور اس کے ارباب حل و عقد نے الحاق کے بعد بھی اپنے اس مقصد کو حاصل کرنے کی کوششوں میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی وہاں یہ بات بھی ثابت ہو جاتی ہے کہ حکومت ہندیہ جانتے ہوئے بھی کہ پاکستان، ہندوستان کے خلاف جارحانہ حملے میں مصروف ہے اس تنازعہ کو پرامن طریقے پر طے کرنا چاہتی تھی اور اسی لئے وہ ہندوستان کی سرحد کے پار کسی قسم کی فوجی کارروائی کرنے سے گریز کرتی رہی تھی۔

یہ بات بتائی جا چکی ہے کہ ریاست جموں اور کشمیر پر قبائلیوں نے جو جارحانہ حملہ کیا تھا وہ صرف پاکستان کی رضامندی ہی سے نہیں کیا گیا تھا بلکہ اس میں پاکستان انھیں ہر قسم کی امداد بھی دیتا رہا تھا حتیٰ کہ خود پاکستانی سپاہی بھی حملہ آوروں میں شامل تھے لیکن یہاں معاملہ کے اس پہلو پر کسی قدر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

حکومت ہند کی جانب سے، ریاست جموں اور کشمیر پر حملہ کرنے والے قبائلیوں کو امداد دینے کے سلسلے میں پاکستان پر جو اعتراضات کئے گئے تھے اُن کا جواب دیتے ہوئے پاکستان کے وزیر اعظم نے لکھا تھا کہ :-

"جہاں تک حکومت پاکستان پر حملہ آوروں کو امداد دینے کے الزامات کا تعلق ہے ہم پوری قوت کے ساتھ ان کی تردید کرتے ہیں۔ اس کے برعکس حکومت پاکستان قبائلیوں کی نقل و حرکت کی ہمت شکنی کرنے کے لئے جنگ کے علاوہ اپنی قوت کے مطابق ہر ممکن کوشش کرتی رہی ہے[1]۔"

حتیٰ کہ ریاست پر حملہ سے آٹھ ماہ بعد بھی جب کشمیر کا مسئلہ ادارۂ اقوام متحدہ میں پیش تھا پاکستان کے وزیر خارجہ نے کہا تھا کہ :-

---

1. White Paper on J. & K. Pp 80-81

"ہم اس الزام کی پُر زور تردید کرتے ہیں کہ حکومتِ پاکستان ان نام نہاد حملہ آوروں کو امداد دے رہی ہے۔"

لیکن حقیقت اس بیان سے بالکل مختلف تھی چنانچہ 'نیوز کرانیکل' لندن کے نامہ نگار نے ۲۷۔ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو لکھا تھا کہ:

"اس بات پر یقین کرنے کے تمام ثبوت موجود ہیں کہ ان کی مہم (قبائلی حملہ) کو فوجی امداد حاصل تھی اور اسے فوجی صلاحیت کے ساتھ چلایا جارہا ہے[1]۔"

اور ان سطور کی اشاعت سے چھ روز بعد اخبار 'آبزرور' لندن میں اے مورہیڈ کی جو تحریر شائع ہوئی تھی اس میں بتایا گیا تھا کہ:

"ہر جگہ بھرتی جاری ہے اور یہ بھرتی قبائلی علاقوں میں ہی نہیں بلکہ پاکستان میں بھی کی جارہی ہے[2]۔"

پھر اسی قدر نہیں بلکہ اخبار 'نیو اسٹیسمین اینڈ نیشن' لندن کے اڈیٹر مسٹر کنگز لے مارٹن نے کشمیر کا دورہ کرنے کے بعد فروری ۱۹۴۸ء میں اس خیال کا اظہار کیا تھا کہ:۔

"یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ پاکستان کی طرف سے قبائلی حملہ آوروں کی ہمت افزائی نہیں کی جارہی ہے اور انہیں امداد نہیں دی جارہی ہے[3]۔"

قبائلی حملہ آوروں کے ساتھ پاکستان کے تعلق کے سلسلہ میں اگرچہ مذکورہ بالا غیر ملکی اور غیر جانب دار مشاہدین کی عینی شہادتوں کو کافی سمجھنا چاہیئے لیکن ان شہادتوں کی تصدیق کے لئے پاکستان کے بعض اربابِ حکومت کے بیانات بھی موجود ہیں۔ مثلاً

1-2-3. White Paper on Jammu Kashmir Pp. 38 & 42-43

سرحد کے اس وقت کے وزیرِ اعظم خان عبدالقیوم خان نے ۳۰۔ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو کہا تھا کہ

"پٹھان ہندوستان کو کشمیر پر حملہ کرنے کی اجازت نہیں دیں گے۔"[1]

اور دوسرے ہی روز سندھ کے وزیرِ صحت نے

"تمام تربیت یافتہ سابق فوجی سپاہیوں سے بطور رضاکار محاذِ کشمیر پر جانے کی اپیل کی تھی۔"[2]

حتیٰ کہ پاکستان کے وزیرِ خارجہ چودھری ظفر اللہ خان نے ۱۱۔ جنوری ۱۹۴۸ء کو رائٹر کے ایک نمایندہ کو بتایا تھا کہ :۔

"پاکستان کے لئے اس امر کی ضمانت دینا ناممکن ہے کہ کوئی پاکستانی یا پاکستان سے گزرنے والے دوسرے لوگ، آزادی کی جدوجہد میں حصہ لینے کے لئے کشمیر نہیں جائیں گے۔"[3]

ان تمام شواہد اور بیانات کے باوجود ۱۹۴۸ء کے اواخر تک پاکستان کشمیر پر قبائلیوں کے حملہ کے ساتھ اپنے تعلق کو چھپانے کی ہر ممکن کوشش کرتا رہا لیکن ۲۲۔ نومبر ۱۹۴۸ء کو جب اقوامِ متحدہ کے کمیشن برائے ہند اور پاکستان کی پہلی عبوری رپورٹ شائع ہوئی تو ان حقائق کی تصدیق بھی ہوگئی جو اس حملہ کے پہلے ہی دن سے ہندوستان کے علم میں تھے اور جن پر وہ پاکستان کو بار بار توجہ دلاتا رہا تھا۔ اقوامِ متحدہ کے اس کمیشن نے اپنی رپورٹ میں لکھا تھا :

"کمیشن کی ایک بے ضابطہ نشست میں جو یکم اگست ۱۹۴۸ء کو منعقد ہوئی تھی شمال مغربی سرحدی صوبہ کے گورنر سر جارج کننگھم نے اپنے بیان میں

---

1. Pakistan Times 30-10-47
2. The Times of India 1-11-47
3. The Hindustan Times 13-1-48

کہا تھا کہ دراصل پاکستانی علاقہ میں جگہ جگہ بھڑ جانے کے خطرے سے بچنے کے لئے میرے صوبہ سے گزر کر قبائلیوں کو کشمیر جانے کا موقعہ دیا گیا تھا... قبائلیوں نے پاکستان میں مقامی ذرائع سے پٹرول حاصل کیا تھا اور انہوں نے ریلوں اور مقامی موٹر ٹرانسپورٹ کو بھی استعمال کیا تھا.... مسٹر محمد علی نے (جو اس وقت پاکستان کے وزیر مالیات تھے اور بعد میں وزیر اعظم بھی رہ چکے ہیں) کہا تھا کہ اگر پٹرول مہیا کرنے سے انکار کر دیا جاتا تو پاکستان کی اقتصادی ناکہ بندی کر لی جاتی اور اس کے نتائج پاکستان کی حکومت کے حق میں نہایت ہی خطرناک برآمد ہوتے..... سر ظفر اللہ نے اس بات کی تصدیق کی تھی کہ قبائلیوں نے مقامی ذرائع سے پٹرول حاصل کیا تھا[1]"

لیکن اقوام متحدہ کے کمیشن برائے ہندو پاکستان کی پہلی عبوری رپورٹ سے جو مذکرہ بالا اقتباسات پیش کئے گئے ہیں ان کے مطالعہ کے بعد بھی بعض محتاط حضرات یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان سے جزوی طور پر قبائلیوں کے ساتھ بعض پاکستانیوں اور پاکستانی حکام کے تعلق پر تو ضرور روشنی پڑتی ہے لیکن ان کے ساتھ حکومت پاکستان کا براہِ راست تعلق ثابت نہیں ہوتا۔ لیکن صوبہ سرحد کے وزیر اعظم خان عبدالقیوم خان نے ۷۔ مارچ ۱۹۴۹ء کو صوبہ کی مجلس قانون ساز میں قبائلیوں کے لئے خصوصی مالی امداد کا مطالبہ پیش کرتے ہوئے جو تقریر کی تھی اس میں کہا تھا کہ:

"ایوان اس واقعہ کو فخر کے ساتھ یاد کرے گا کہ ہمارے خطرناک ترین لمحات میں مسعودیوں نے ریاست جموں اور کشمیر کے مجبور مسلمانوں کی نجات کے لئے وہاں جا کر ہماری آواز پر لبیک کہا تھا[2]"

---

1. The Struggle for Kashmir Pp. 31-32
2. The Making of Pakistan by R. Symonds P. 122

اور اس اعتراف کے بعد اس بات کو ثابت کرنے کے لئے کہ ریاست جموں اور کشمیر پر قبائیلیوں کا حملہ حکومت پاکستان ہی کے منصوبہ اور دعوت پر مبنی تھا مزید دلائل پیش کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی اور اس طرح کشمیر کے تنازعہ کی حقیقت صرف یہ رہ جاتی ہے کہ پاکستان ابتداء ہی سے اس ریاست پر قبضہ کر لینے کا خواہش مند تھا۔ وہ تقسیم ہند کے بعد ہی سے اس ریاست کے الحاق کے لئے مختلف وسائل اختیار کرتا رہا تھا۔ اس نے "اسٹینڈ اسٹل اگریمنٹ" کے باوجود ریاست کی اقتصادی ناکہ بندی کرنے سے بھی گریز نہیں کیا تھا۔ ریاستی مصنوعات کی درآمد اور فروخت پر پابندیاں عائد کر کے مالی اعتبار سے ریاست کو کھوکھلا بھی بنا دیا تھا، ریاست میں مسلح پاکستانیوں کو بھیج کر فتنہ و فساد بھی برپا کرائے تھے اور ریاست میں بغاوت بھی برپا کرا دی تھی لیکن جب وہ ان عام طریقوں کے استعمال کے باوجود اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکا تو اس نے قبائیلیوں کو حملہ کی ترغیب دی اور اس حملہ میں انھیں ہر قسم کی امداد دیتا رہا۔ حتیٰ کہ جب ہندوستان کے ساتھ اس کا الحاق ہو گیا تو اس نے اپنی باقاعدہ افواج بھی بھیج دیں اور آج بھی وہ ہندوستان کے اس حصہ سے دست کش ہونے کے لئے تیار نہیں ہے جو اس وقت قبائیلیوں کے توسط سے اس کے قبضہ میں چلا گیا تھا۔

چھٹا باب

تصویر کے دو رُخ

گذشتہ صفحات کے مطالعہ کے بعد یہ حقیقت پوشیدہ نہیں رہ سکتی کہ " انڈین انڈیپنڈنس ایکٹ " میں دیسی ریاستوں کے مستقبل کا فیصلہ کرنے کے لئے ان کے حکمرانوں کو جو حق دیا گیا تھا، مسلم لیگ کے صدر کی حیثیت سے مسٹر جناح نے اسے غیر مشروط طور پر تسلیم کیا تھا، لیکن چونکہ کانگریس ابتداہی سے عوام کی بالادستی کی علمبردار رہی تھی اس نے دیسی حکمرانوں کی بالادستی کے اصول کو تامل کے ساتھ منظور کیا تھا اور یہ بات بھی ثابت ہو چکی ہے کہ جہاں تک ریاست جموں اور کشمیر کا تعلق ہے پاکستان، جس کی عنانِ حکومت مسلم لیگ کے ہاتھوں میں آئی تھی مسٹر جناح کے منظور کردہ اصول پر قائم نہیں رہا تھا۔ اس کی طرف سے ہر طرح، مہاراجہ کو اس بات پر مجبور کیا جا رہا تھا کہ وہ اپنی ریاست کو پاکستان کے ساتھ ملحق کر دیں۔ حتیٰ کہ شیخ محمد عبداللہ نے ۲۷۔ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو دہلی میں ایک بیان دیتے ہوئے کہا تھا کہ:

" کشمیر پر جارحانہ حملہ کا مقصد، وہاں کے عوام کو خوفزدہ کر کے ان سے ایک مخصوص فیصلہ کرانا یعنی پاکستان کے ساتھ الحاق پر مجبور کرنا ہے۔ لیکن ہر کشمیری اپنی رائے پر اس دباؤ سے نفرت کرتا

ہے۔[1]"

پھر اسی قدر نہیں بلکہ ہندوستان کے ساتھ ریاست کے الحاق کے بعد بھی پاکستان اور مسٹر جناح نے اسے جائز اور قانونی الحاق تسلیم نہیں کیا اور پاکستان آج بھی اسے جائز اور قانونی الحاق تسلیم نہیں کرتا۔ حالانکہ

"الحاق قانونی طور پر مہاراجہ نے کیا تھا اور انھوں نے یہ قدم ریاست کی مقبول اور با اثر ترین سیاسی جماعت 'آل جموں اور کشمیر نیشنل کانفرنس' کے رہنما شیخ عبداللہ کے مشورہ پر اٹھایا تھا۔[2]"

اس کے برعکس لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے پریس اتاشی مسٹر کیمپ بیل جانسن کی شہادت کے مطابق ریاستوں کے الحاق یا عدم الحاق کے فیصلہ کے سلسلہ میں دیسی حکمرانوں کی بالادستی کے اصول کو بادلِ ناخواستہ تسلیم کر لینے کے بعد کانگریس نے اس معاملہ میں مہاراجہ کی رائے کو متاثر کرنے کی ذرہ برابر بھی کوشش نہیں کی تھی لیکن یہ بات ظاہر ہے کہ الحاق کے بعد ریاست جموں اور کشمیر کو ہندوستان کے ایک جزو لاینفک کی حیثیت حاصل ہو گئی تھی اس لئے ہندوستان الحاق کے بعد سے اس وقت تک اپنے اس علاقہ کی آزادی اور اپنی علاقائی سالمیت کو برقرار رکھنے اور بحال کرانے کے لئے جو کچھ کرتا رہا ہے وہ سب کچھ اس کا فرض تھا اور اس کے عوامل اور محرکات کو سمجھ لینا کوئی مشکل کام نہیں ہے لیکن جہاں تک اس معاملے سے پاکستان کا تعلق ہے یہ بات آج تک بھی سمجھ میں نہیں آتی کہ اس کے ارباب اختیار نے کشمیر میں اپنے تسلیم کردہ اصول سے کیوں انحراف کیا تھا، انھوں نے مہاراجہ کے فیصلۂ الحاق کو جسے کشمیری عوام کی تائید اور حمایت بھی حاصل تھی کس لئے تسلیم نہیں کیا اور وہ آج بھی ہندوستان کے اس علاقہ سے دست بردار ہونے کے لئے کیوں تیار نہیں ہے؟

---

1. The Times of India 28-10 47
2. Govt. of India White Paper on J. & K. P. 3

کسی دوسری جگہ لارڈ برڈ وڈ کے حوالہ سے یہ بات بتائی جا چکی ہے کہ مسٹر جناح ابتداء ہی سے ریاست جموں اور کشمیر کو پاکستان کا جزو لاینفک سمجھتے رہے تھے اور اسی لئے ۲۷۔ اکتوبر ۱۹۴۷ء کی شام کو کشمیر پر فوج کشی کا حکم دینے کے بعد جب دوسرے دن فیلڈ مارشل سر کلوڈ آکن لک اور جنرل گریسی کے مشورہ پر انہیں اپنا یہ حکم منسوخ کرنا پڑا تھا تو یہ امران پر بے حد شاق گزرا تھا لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ اسباب کیا تھے جن کی بنا پر مسٹر جناح نے کشمیر کو پاکستان کا ایک حصّہ فرض کر لیا تھا؟ اور اگرچہ آج تک بھی اس سوال کا کوئی جامع، مدلّل اور معقول جواب نہیں مل سکا لیکن قبائلی حملہ کے دوران میں ۴۔ نومبر ۱۹۴۷ء کی اس نشری تقریر میں جو پاکستان کے پہلے وزیر اعظم مسٹر لیاقت علی خاں مرحوم نے کی تھی، نیز مجلسِ تحفظ کی رپورٹوں اور پاکستان کی سرکاری اور غیر سرکاری مطبوعات سے اس سوال کا جو جواب متعین کیا جا سکتا ہے خود ہندوستان کے مقدّمہ اور مؤقف کو سمجھنے کے لئے اسے بھی مدِ نظر رکھنا چاہیئے۔

مسٹر لیاقت علی خاں نے ریاست جموّں اور کشمیر پر قبائلیوں کے حملہ کو حق بجانب قرار دیتے ہوئے اپنی اس تقریر میں یہ اعلان کرنے کے بعد کہ ——— ہم اس الحاق کو تسلیم نہیں کرتے کہا تھا کہ

"ہندوستان کے ساتھ کشمیر کا الحاق، پاکستان کے تحفظ کے لئے ایک بہت بڑا خطرہ ہے[1]۔"

مسٹر اے۔ ڈی صمانی نے ۱۹۴۷ء کے ہنگاموں کی یک طرفہ تفصیلات بیان کرنے کے بعد مسلمانوں کے تحفظ کے زاویۂ نظر سے لکھا ہے کہ:

"اس لئے کشمیر، ہند اور پاکستان کے مسئلہ کا ایک بہت ہی اہم پہلو

---

1. Road to Kashmir P. 186

ہے۔ پہلے ہی سے ضعیف پاکستان کو کشمیر سے محروم کر دینے کی کوششوں کو کسی طرح بھی جائز نہیں قرار دیا جاسکتا۔ مزید یہ کہ نقشہ پر ایک نظر ڈالنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ کشمیر، پاکستان کی پوری تعمیر میں منڈیر کی حیثیت رکھتا ہے۔ مگر پاکستان اس بنا پر اس کا مطالبہ نہیں کرتا بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہاں کے باشندوں کی بہت بڑی اکثریت مسلمانوں پر مشتمل ہے جن کے لئے جیسا کہ مذکورہ بالا تفصیلات سے ظاہر ہے ہندوستان میں کوئی جگہ نہیں۔ ان مسلمانوں کو پاکستان ہی میں آنا پڑے گا[1]"

کراچی یونیورسٹی کے شعبۂ جغرافیہ کے صدر مسٹر مانک بی پیٹھاوالا نے، کشمیر کے ارضی اور جغرافیائی احوال کو تفصیل کے ساتھ بیان کرتے ہوئے کشمیر کے ساتھ پاکستان کے قدرتی تعلق کو ثابت کرنے کے لئے جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ:

"پہلی بات تو یہ ہے کہ مغربی پاکستان اور کشمیر کے درمیان جو سرحد واقع ہے وہ کافی طویل اور تقریباً ۵۸۰ میل ہے اور اس کی مسلسل حفاظت اور نگہداشت درکار ہے۔ بیشتر مغربی پاکستان، دریائے سندھ کی وادی پر مشتمل ہے اور کشمیر دراصل اس طبعی علاقہ کا بالائی حصہ ہے اور یہی دریا ان دونوں مسلسل علاقوں کے لئے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے۔ پنجاب کے ان دریاؤں کے منبعے بھی کشمیر ہی میں ہیں جو پاکستان کے دریا ہو گئے ہیں۔ ان دریاؤں کے لئے کشمیر کے برف پوش پہاڑ ذخائر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ پاکستان اپنی شادابی کے لئے ان ہی سے آب پاشی کا پانی حاصل کر سکتا ہے۔ لیکن اگر منبع پر کوئی اُفتاد پڑ جائے تو نشیبی وادیوں کو نقصان پہونچنا ضروری ہے

---

1. Road to Kashmir P. 194

یہی دریا کشمیر کے پہاڑوں سے زرخیز مٹی بہا کر پنجاب اور سندھ کے زیریں حصّوں میں بھی لاتے ہیں۔[1]"

مذکورہ بالا اقتباسات کے مطالعہ کے بعد جو نتیجہ برآمد ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ پاکستان اپنی فوجی اور اقتصادی ضرورتوں کی بنا ہی پر کشمیر کو اپنے ساتھ نہیں رکھنا چاہتا بلکہ وہ مغربی پاکستان اور کشمیر کے جغرافیائی تعلق، طبعی ارتباط اور مغربی پاکستان کے باشندوں کے ساتھ باشندگانِ کشمیر کی اکثریت کی مذہبی ہم آہنگی کی بنیاد پر بھی اپنے ساتھ اس ریاست کے الحاق کو اپنا حق سمجھتا ہے۔ چنانچہ پاکستان کے سابق وزیر خارجہ سر ظفراللہ خاں نے ۸۔ فروری ۱۹۵۰ء کو مجلسِ تحفظ کے روبرو اپنے ملک کا مقدمہ پیش کرتے ہوئے بھی ان ہی نکات پر زور دیا تھا۔ اور مسٹر لیاقت علی خاں مرحوم نے بھی ۱۹۵۱ء میں مسٹر ڈیوڈ لی لین تھل کو ایک بیان دیتے ہوئے پاکستان کے زاویۂ نظر سے کشمیر کی اہمیت پر ان الفاظ میں روشنی ڈالی تھی کہ:۔

"پاکستان کے لئے کشمیر بہت زیادہ اہمیت رکھتا ہے لیکن ہندوستان کے لئے اس کی جو حیثیت ہے آپ اسے تعیش سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ کشمیر کو ہماری بقا اور زندگی کی ضرورت کی حیثیت حاصل ہے۔ نقشہ پر ایک نظر ڈالئے تو معلوم ہو جائے گا کہ کشمیر پاکستان کے سر پر کلاہ کا درجہ رکھتا ہے اور اگر میں ہندوستان کو یہ کلاہ اتار لینے کی اجازت دے دوں تو میں ہمیشہ ہندوستان کا محتاج اور زیر دست رہوں گا اور کروڑوں انسانوں کی قربانیاں اکارت ہو جائیں گی۔[2]"

---

1. An Introduction to Kashmir— its Geology and Geography Pp. 51-53
2. "Another Korea in the making"-Colliers, New York. Aug. 4. 1951

اور مذکورہ بالا تمام سرکاری اور غیر سرکاری تحریروں اور تقریروں کی روشنی میں کشمیر سے متعلق پاکستان کے دعویٰ کو سمجھنے کے بعد ہمیں ہندوستان کے مقدمہ اور موقف کو بھی سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔

ہندوستان کی حکومت نے، ریاست جموں اور کشمیر کے حکمران مہاراجہ ہری سنگھ اور نیشنل کانفرنس کے رہنما شیخ محمد عبداللہ کی درخواست پر ہندوستان کے ساتھ اس ریاست کے الحاق کو منظور کیا تھا لیکن اس الحاق کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی واضح کر دی تھی کہ:—

"ہندوستان کی اس حکمت عملی کے پیش نظر کہ جس ریاست میں الحاق کے سوال پر اختلاف ہوگا وہاں اس سوال کا فیصلہ رائے عامہ کے ذریعہ سے کرایا جائے گا۔ اس لئے جس وقت بھی کشمیر میں امن قائم اور قانون بحال ہو جائے گا اور ریاست کی سرزمین حملہ آوروں سے پاک ہو جائے گی الحاق کے سوال پر عوام کی رائے لی جائے گی۔[1]"

اور جیسا کہ لارڈ برڈووڈ نے یہ کہہ کر کہ

میں نے اس بات پر زور دیا ہے کہ (ہندوستان نے کشمیر میں فوج بھیجنے اور اسے ملحق کرنے کے لئے) پہلے سے کوئی منصوبہ نہیں بنا رکھا تھا۔[2]"

اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ ہندوستان، مہاراجہ اور کشمیر کے عوامی رہنماؤں کی درخواست سے پہلے کشمیر میں اپنی فوجیں بھیجنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا اس لئے یہ بات ثابت کرنے کے لئے کسی مزید دلیل کی ضرورت باقی نہیں رہتی کہ الحاق سے پہلے ہندوستان اپنی

---

1. Letter from Lord Mountbatten
Hari Singh dated 27th October, 1947
2. Two Nations & Kashmir P. 59

ایک سرحدی ریاست کے حالات کو تشویش کی نظر سے دیکھنے کے باوجود ان کی اصلاح یا انسداد کے لئے کوئی قدم اُٹھانے پر تیار نہیں تھا لیکن جب اس نے مہاراجہ اور کشمیر کے عوامی رہنماؤں کی اس درخواست کو منظور کر لیا جو مہاراجہ کے قانونی حق پر مبنی تھی تو پھر ہندوستان کے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو کے الفاظ میں

"ہندوستان کے لئے اُن لوگوں کے ساتھ جنہوں نے اس پر بھروسہ کیا تھا غداری کرنا ممکن نہیں ہو سکتا تھا"[1]

اور یہاں اس امر پر زور دینے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی کہ کشمیر کے معاملے میں ہندوستان کا مضبوط ترین مؤقف اخلاقی ہے اور حکومت ہند اپنی اس اخلاقی ذمہ داری کو محسوس کرتی ہے کہ کشمیر کے باشندوں کو ایک بار اس بات کا یقین دلانے کے بعد کہ ہندوستان ان کے وطن کی آزادی اور خود اُن کے جمہوری نظریات کا تحفظ کرے گا اسے کسی حال میں بھی اپنی اس یقین دہانی سے انحراف نہیں کرنا چاہیئے۔

یہ امر کسی وضاحت کا محتاج نہیں کہ پاکستان کی طرف سے مذہب کی بنا پر کشمیر کے الحاق کا مطالبہ مسٹر جناح کے "دو قومی نظریہ" پر مبنی ہے۔ لیکن یہ بات بھی واضح ہے کہ ہندوستان کی تقسیم کے باوجود کانگریس کے رہنماؤں اور حکومت ہند نے تقسیم سے پہلے اور تقسیم کے بعد کسی موقع پر بھی اس نظریہ کو تسلیم نہیں کیا۔ چنانچہ آج بھی ہند یونین میں کم و بیش ۴½ کروڑ مسلمان آباد ہیں۔ ہندوستان کے آئین میں ہندوستان کے مسلمانوں اور غیر مسلموں کو مساوی حقوق حاصل ہیں اور حکومت ہند کا کوئی ایسا محکمہ نہیں جس میں مسلمان بھی اعلیٰ مناصب پر فائز نہ ہوں۔ ان حالات میں یہ بات ظاہر ہے کہ ہندوستان کشمیر کے سلسلہ میں پاکستان کے مقدمہ کے اس جزو کو کوئی اہمیت نہیں دے سکتا۔ اس کے

1. Kashmir 1947-56 P. 15

برعکس ہندوستان میں، انڈونیشیا اور پاکستان کے بعد سب سے زیادہ مسلمانوں کی موجودگی اس امر کا بیّن ثبوت ہے کہ انڈین نیشنل کانگریس نے ہندوستان کی تقسیم کو 'دو قومی نظریہ' کے ماتحت منظور نہیں کیا تھا۔ چنانچہ ہندوستان کے وزیراعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے اس غلط فہمی کی تردید کرتے ہوئے جو ہندوستان کی تقسیم کے بنیادی اسباب کے متعلق متحدہ امریکہ میں پھیلی ہوئی تھی ۱۶ نومبر ۱۹۴۹ء کو لندن میں ایک پریس کانفرنس کو خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ:

"متحدہ امریکہ ہی میں نہیں بلکہ دُنیا کے دوسرے حصوں میں بھی جو ایک غلط فہمی پھیلی ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ ہندوستان کی تقسیم کی بدولت ہندوستان کے ہندو اور مسلمان، مذہب کی بنا پر ایک دوسرے سے بالکل علیحدہ ہو گئے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں تقسیم کو پُرانی مسلم لیگ یا مسٹر جناح کے "دو قومی نظریہ" کا نتیجہ سمجھا جاتا ہے۔ لیکن جہاں تک ہمارا تعلق ہے ہم نے کبھی اس نظریہ کو تسلیم نہیں کیا بلکہ ہمیشہ اس کی تردید ہی کرتے رہے ہیں[1]۔"

اور یکم مارچ ۱۹۵۱ء کو مجلس تحفظ میں ہندوستان کا مقدمہ پیش کرتے ہوئے مسٹر بی' این راؤ نے کہا تھا کہ

"کشمیر کا سوال جیسا کہ اسے ظاہر کیا جاتا ہے یا غلط طور پر ظاہر کیا جاتا ہے ہندو، مسلم سوال نہیں ہے۔ چنانچہ پاکستان کی علیحدگی کے باوجود ہندوستان میں تقریباً چار کروڑ مسلمان آباد ہیں اور یہ آبادی (انڈونیشیا اور پاکستان کے بعد) سب سے زیادہ ہے[2]۔"

---

1. Indiagram (daily bulletin of the Indian High Commission to U. K.) Nov, 17, 1949
2.

پھر ۲۳-جنوری ۱۹۵۷ء کو مسٹر وی، کے کرشنا مینن نے مجلسِ تحفظ میں ہندوستان کے نظریہ کو زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان کرتے ہوئے کہا تھا کہ:

"دوسری بات ایسی ہے جس کے سلسلہ میں میری حکومت اپنے موقف کو ہرگز تبدیل نہیں کرے گی۔ ہم اس چیز کو ہرگز قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں جسے "دو قومی نظریہ" کہا جاتا ہے۔ ہندوستان ایک سیکولر ملک ہے اور وہاں کا ہر باشندہ خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان، عیسائی ہو یا بودھ یا کوئی اور ہندوستان کا مساوی الحیثیت بیٹا اور بیٹی ہے۔۔۔۔ ہندوستان اسلام کو بھی اپنا ایسا ہی مذہب سمجھتا ہے جیسا عیسائیت یا کسی اور مذہب کو، لہٰذا ہم اس منطق کو مسترد کرتے ہیں کہ اگر کسی خاص علاقہ میں کسی مذہب کے پیرو زیادہ تعداد میں ہوں تو اس علاقہ کا سوال سیاسی سوال بن جاتا ہے۔۔۔۔ ہم اسلام کو غیر ملکی مذہب یا ثقافت (کلچر) خیال نہیں کرتے۔ اس سے بھی بڑی بات یہ ہے کہ ہندو ہوں یا مسلمان، عیسائی ہوں یا کچھ اور، ان سب کے بزرگ تقریباً ایک ہی تھے۔۔۔۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی اتنی بڑی آبادی ہے کہ انھیں اقلیت بھی نہیں کہا جا سکتا۔ وہ ہمارے ملک کے ہم رتبہ شہری ہیں اور حکومت، سرکاری ملازمت، صنعت، زراعت اور دوسری تمام چیزوں میں مسلمانوں کو ایک مقام حاصل ہے[1]۔"

اور ہندوستان کے اس مؤقف کی وضاحت کے بعد یہ کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی کہ دنیا کے تمام جمہوری اور سیکولر ملکوں کی طرح وہ بھی مذہب کی بنا پر ملکوں اور علاقوں

---

[1] مسئلۂ کشمیر۔ وی، کے، کرشنا مینن کی مکمل تقریر۔ سلامتی کونسل میں (ترجمہ) صفحات ۵۹--۶۰

کی تقسیم کے نظریہ کو تسلیم نہیں کر سکتا۔

پھر پاکستان کے دعوے کی یہ دلیل تاریخی اعتبار سے بھی قطعاً بے بنیاد ہے۔ مثال کے طور پر اس بات کو مدِ نظر رکھنا چاہیئے کہ پہلی عالم گیر جنگ سے پہلے تقریباً پورا عالم اسلام سلطنتِ عثمانیہ میں شامل تھا لیکن مذہب کی اس ہم آہنگی اور سلطنتِ عثمانیہ کے ساتھ خلافتِ اسلامیہ کے عظیم منصب کی وابستگی کے باوجود پہلی عالم گیر جنگ کے دوران میں عرب محض اپنی قومی آزادی کے تصور کے ماتحت اس وقت کی اتحادی طاقتوں کے دوش بدوش ترکوں کے خلاف صف آرا ہو گئے تھے اور آج بھی ایشیا میں عوامی چین کی سرحد سے شروع ہو کر شمالی افریقہ کے انتہائی مغربی گوشہ تک مسلمانوں کی جو بہت سی چھوٹی بڑی ریاستیں پھیلی ہوئی ہیں وہ مذہبی مماثلت کی بنیاد پر متحد ہو جانے کا تصور تک بھی نہیں کرتیں۔ چنانچہ مصر اور سوڈان کے باشندے ہم مذہب ہونے کے باوجود آج دو جداگانہ آزاد اور خود مختار ریاستوں کے باشندے ہیں اور مصر و شام کے الحاق نے تو اس حقیقت کو بالکل ہی واضح کر دیا ہے کہ آج دنیا میں مذہب کی مماثلت کی بنیاد پر ملکوں کے باہمی الحاق اور قوموں کے باہمی اتحاد کے لئے کوئی گنجائش نہیں۔ چنانچہ متحدہ عرب جمہوریہ کے باشندوں کی بہت بڑی اکثریت کے مسلمان ہونے کے باوجود اسلام کو ریاست کا سرکاری مذہب قرار نہیں دیا گیا اور یمن کی ریاست میں شیعہ مسلمانوں کی اکثریت اور انھیں کی حکومت ہونے کے باوجود یہ ریاست ایران کے ساتھ متحد ہونے کی بجائے، متحدہ عرب جمہوریہ کی ریک وحدت ہے اور متحدہ عرب جمہوریہ کے آئین میں ریاست کے لئے کوئی مذہب متعین نہ کر کے اس بات کی جو گنجائش رکھی گئی ہے کہ متحدہ عرب جمہوریہ میں وہ عرب ریاستیں بھی شامل ہو سکتی ہیں جن میں غیر مسلم عرب بھی آباد ہیں وہ بھی بات کی کھلی ہوئی دلیل ہے کہ آج پاکستان کی طرح مذہب کی بنیاد پر قوموں اور ملکوں کو اتحاد کی دعوت دینا کسی طرح بھی ممکن نہیں ہو سکتا۔

اسی طرح یورپ کے باشندوں کا عام مذہب عیسائیت ہے لیکن تاریخ بتاتی ہے کہ صرف مذہب کی بنا پر ان تمام ریاستوں کو ایک دوسرے کے ساتھ ملحق کر دینے کا کبھی خیال تک بھی نہیں کیا گیا۔ اس کے برعکس آج اقوام عالم کو جن دو گروہوں میں منقسم سمجھا جاتا ہے، ان کی یہ حقیقی یا مفروضہ تقسیم بھی محض سیاسی، معاشی اور تہذیبی نظریات ہی کے اختلاف پر مبنی ہے۔

جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے وہ کم بیش نصف صدی تک غیر ملکی حکومت سے نجات حاصل کرنے کی مسلسل جدوجہد کرتے رہنے کے بعد آزاد ہوا ہے۔ اس جدوجہد میں اس کے ہر گوشہ کے بسنے والے ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی اور پارسی ایک دوسرے کے دوش بدوش حصہ لیتے رہے تھے اور اس کا مقصد ہمیشہ ہندوستان کی آزادی اور خود مختاری کے اصول کے ساتھ یہاں ایک غیر مذہبی جمہوریت کا قیام بھی رہا تھا اور اگرچہ ہندوستان کے قوم پرور عناصر کو ملک کی تقسیم منظور کرنے پر مجبور ہو جانا پڑا تھا۔ اس کے باوجود انھوں نے اس کی اس مذہبی بنیاد کو تسلیم نہیں کیا تھا جو مسلم لیگ کے رہنماؤں کے پیش نظر تھی اس لئے اگر آج ہندوستان کشمیر کے معاملہ میں پاکستان کے دعوے کے اس مذہبی جزو کو تسلیم نہیں کرتا تو یہ امر اس کے سیکولر اور جمہوری نظریات اور کردار کی پختگی کا مظہر ہے۔

حسن اتفاق سے کشمیر ہند یونین کی ایک ایسی ریاست ہے جہاں کے باشندوں کی اکثریت مسلمانوں پر مشتمل ہے اور چونکہ مسلمانوں کو ریاست کی آبادی میں اکثریت حاصل ہے اس لئے وہ ریاست کی مجلس قانون ساز اور کابینہ میں بھی اکثریت ہی میں ہیں لیکن کیا اس بات کو ہندوستان کے جمہوری اور سیکولر نظریات کے نفوذ اور مقبولیت کی ایک روشن دلیل اور کشمیر کے باشندوں کے سیاسی شعور کی بیداری کی ایک زبردست علامت نہیں کہنا چاہیئے کہ اس ریاست کے مسلمان، مغربی پاکستان کے باشندوں کے ہم مذہب ہونے کے باوجود سیاسی

اور اقتصادی زاویۂ نظر سے ہندوستان کے ساتھ الحاق کے خواہش مند ہی نہیں ہوئے تھے بلکہ آج تک ہر موقع پر اس الحاق کی توثیق بھی کرتے رہے ہیں۔ اس لئے اگر پاکستان اس ریاست کے تین چوتھائی باشندوں کے ساتھ، مغربی پاکستان کے باشندوں کی مذہبی مماثلت کی بنا پر اس کے الحاق کے سلسلہ میں ایک ایسا دعویٰ کر سکتا ہے جو تاریخ اور شواہد کے بالکل برعکس ہے اور جسے اس ریاست کے مسلمان باشندے بھی تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں تو ہندوستان کو اپنے جمہوری اور سیکولر نظریات کے ساتھ، ریاست جموں اور کشمیر کی پوری آبادی کے جمہوری اور سیکولر نظریات کی مماثلت کی بنا پر اپنے ساتھ اس کے الحاق کو قائم رکھنے کا پاکستان سے کہیں زیادہ حق پہنچتا ہے اور کشمیر کے باشندوں کے اس جمہوری اور سیکولر کردار کا ثبوت صرف اس کے ماضی ہی سے نہیں ملتا بلکہ اس کا حال بھی اس کے کردار کی ان ہی خصوصیات کا مظہر ہے۔ حتّٰی کہ ۱۹۴۸ء کے آغاز میں شیخ محمد عبداللہ نے جنھیں اس وقت کشمیر کے باشندوں کا اعتماد حاصل تھا ہندوستان کے ساتھ کشمیر کے الحاق پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا تھا کہ:-

"کشمیر مسلمانوں کی آبادی کی زبردست اکثریت کے باوجود پاکستان سے علٰحدہ رہا ہے اور اس کی یہ علٰحدگی نہ صرف مسٹر جناح کے "دو قومی نظریہ" کے بودے پن ہی کو ثابت کرتی ہے بلکہ ان بنیادوں کی مضبوطی کے لئے ایک چیلنج کی حیثیت بھی رکھتی ہے جن پر پاکستان کا قیام عمل میں آیا ہے[1]۔"

پھر اسی قدر نہیں بلکہ موصوف نے ۲۰ ستمبر ۱۹۴۸ء کو دہلی میں ایک پریس کانفرنس کو خطاب کرتے ہوئے اعلان کیا تھا کہ

"ہم نے (الحاق کا جو فیصلہ کیا ہے) ہمارے لئے اس سے انحراف کی

---

1. The Times of India 21-2-48

کوئی صورت ممکن نہیں اور اس کا سبب یہ ہے کہ کشمیر میں کسی دینی حکومت کے قیام کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔[1] "

اور اس کے بعد انھوں نے ۱۲۔فروری کو مدراس میں ایک جلسۂ عام میں فرمایا تھا کہ:

" ہمیں پنڈت نہرو اور ہندوستان کے دوسرے رہنماؤں کی ذات میں امید کی ایک جھلک نظر آتی ہے۔ یہ لوگ ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ دنیا کے ہر حصہ میں فرقہ وارانہ نظریات کا بطلان کر رہے ہیں۔ لیکن پاکستان کی حیثیت کو سمجھنے میں کوئی غلط فہمی نہیں ہو سکتی۔ وہاں کی حکومت دینی حکومت ہے اور اسے محض جاگیرداروں اور فرقہ وارانہ رجعت پسندی کی بقا اور تحفظ کے ساتھ دل چسپی ہے۔[2] "

اور ان تمام باتوں کے پیشِ نظر یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ کشمیر کے معاملہ میں مذہب کو کوئی دخل حاصل نہیں ہے اور خود کشمیر کے مسلمان باشندے بھی پاکستان کے دعوے کے اس جزو کو تسلیم نہیں کرتے اور جب وہ خود ہی اسے تسلیم نہیں کرتے تو پاکستان کے دعوے کا یہ جزو بے وزن اور بے جان ہو کر رہ جاتا ہے۔

جہاں تک اقتصادی زاویۂ نظر سے کشمیر کے ساتھ پاکستان کا تعلق قائم کرنے کا سوال ہے۔ اس کا ایک پہلو تو یہ ہے کہ کشمیر کی بدولت پاکستان کی اقتصادیات اور معاشیات میں کشادگی پیدا ہو اور دوسرا پہلو یہ ہے کہ پاکستان کشمیر کی اقتصادی اور معاشی فراخی کا موجب ثابت ہو سکے۔

اس سلسلے میں اس بات کو مدِ نظر رکھنا چاہیئے کہ کشمیر کا تنازعہ آج سے ۱۲ سال

1.2. Kashmir Decides its Destiny. P. 5

پہلے شروع ہوا تھا اور اس کے مقدمات کی ترتیب بھی اسی زمانہ میں کی گئی تھی۔ اور اگرچہ آج کا کشمیر اقتصادی اعتبار سے اس وقت کے کشمیر کے مقابلہ میں کہیں زیادہ ترقی یافتہ ہے پھر بھی ہمیں پاکستان کے مقدمہ کے دوسرے جزو کے سلسلہ میں اسی وقت کے کشمیر کو مدنظر رکھنا چاہیئے۔ اور جب ہم اقتصادی زاویۂ نظر سے آج سے بارہ سال پہلے کے کشمیر کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ:۔

"اس زمانہ میں یہ ریاست اقتصادی اعتبار سے برصغیر ہند کی سب سے کم ترقی یافتہ ریاست تھی۔[1]"

اور اگرچہ اس بارہ سال کی مدت میں اس کے اقتصادی حالات بہتر ہو چکے ہیں لیکن پھر بھی بعض طبعی اسباب اور قدرتی حالات کے باعث اس کے حالات کی یہ بہتری بھی اسے خود مکتفی نہیں بنا سکی اور ان حالات میں یہ بات ظاہر ہے کہ کشمیر کی بدولت پاکستان کو اقتصادی اعتبار سے کوئی قابل ذکر فائدہ نہیں پہونچ سکتا تھا اور جہاں تک پاکستان سے کشمیر کو کوئی فائدہ پہونچنے کے سوال کا تعلق ہے اس کا اندازہ مسٹر بی۔ این راؤ کی اس تقریر سے کیا جا سکتا ہے جو انھوں نے سر ظفر اللہ خاں کی تقریر کے اسی جزو کے جواب میں مجلس تحفظ کے روبرو کی تھی۔

مسٹر راؤ نے کشمیر اور پاکستان کے اقتصادی اور تجارتی تعلق کا تجزیہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ:۔

"۴۵-۱۹۴۴ء میں کشمیر نے تقریباً ۵ کروڑ ۲۰ لاکھ روپیہ کا سامان درآمد کیا تھا لیکن چونکہ یہ اعداد و شمار تقسیم ہند سے قبل کے ہیں اس لئے یہ نہیں بتایا جا سکتا کہ آج کے ہندوستان اور پاکستان میں شامل علاقوں

1. The Struggle for Kashmir P. 49

کے درمیان اس درآمد کا تناسب کیا تھا۔ پھر بھی سرکاری رپورٹوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں سے ۴ کروڑ ۶۰ لاکھ روپے کا سامان ان علاقوں سے گیا تھا جو ہندوستان میں شامل ہیں اور ایک کروڑ ۲۰ لاکھ روپے کا سامان ان علاقوں سے درآمد کیا گیا تھا جو پاکستان میں شامل ہیں۔ ۴۹-۵۰ء میں یہ تناسب ۴ کروڑ ۷۰ لاکھ اور ۹۰ لاکھ روپے رہ گیا تھا اور ۱۹۴۶-۴۷ء میں ہندوستان نے کشمیر کو ۵ کروڑ ۹۰ لاکھ روپے کا سامان مہیا کیا تھا اور پاکستان نے ایک کروڑ ۲۰ لاکھ روپے کا اور ان ہی تین سال کی مدت میں کشمیر کی برآمد کا تناسب ہند اور پاکستان کے درمیان علی الترتیب ۸۰ اور ۲۰ فیصد رہا تھا[1]۔"

اور اگرچہ پاکستان کے اس دعوے کی بے بضاعتی کو سمجھنے کے لئے کہ کشمیر اور اس کی اقتصادیات ایک دوسرے کے ساتھ مربوط ہیں، مذکورہ بالا اعداد و شمار کا مطالعہ ہی کافی ہے لیکن اگر مزید حقائق کو سامنے رکھا جائے تو یہ دعویٰ بالکل ہی بے وزن ہو کر رہ جاتا ہے۔ چنانچہ یہاں یہ بتا دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ کشمیر کی تمام تر مصنوعات اور پیداوار کا سب سے بڑا خریدار ہندوستان ہی رہا ہے۔ کشمیر کے پھل تقسیم ہند سے پہلے راولپنڈی کے راستہ سے آ کر ہندوستان کے تمام بڑے شہروں ہی میں فروخت ہوتے تھے اور آج وہ راولپنڈی کے طویل راستہ سے آنے کی بجائے براہ راست دہلی، لکھنؤ، پٹنہ، بمبئی، کلکتہ، مدراس اور دوسرے سینکڑوں چھوٹے بڑے شہروں میں حتیٰ کہ قصبوں اور دیہات تک پہنچتے اور فروخت ہوتے ہیں۔ کشمیر کے شال ہندوستان کی آبادی کے لئے زندگی کی ایک ضرورت کی حیثیت رکھتے ہیں، اور ہر مذہب و ملت کے لوگوں کی مختلف ضرورتوں میں کام

1. The Struggle for Kashmir P. 49

آتے ہیں۔ لکڑی اور بیناکاری کی صنعتیں ہمیشہ سے ہندوستان کی سرپرستی میں فروغ پاتی رہی ہیں اور پیپر ماشی کی کشمیری صنعت بھی ہندوستان ہی کی بدولت فروغ پاتی رہی ہے اور آج بھی ان تمام صنعتوں کی ترقی اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ کسی زمانہ میں بھی پاکستان کی سرپرستی کی محتاج نہیں تھیں۔

حفاظتی اور دفاعی زاویۂ نظر سے پاکستان کے مقدمہ کا مطالعہ کرنے کے بعد جو نتیجہ برآمد ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ یا تو پاکستان ہندوستان کے علاوہ کسی دوسرے ملک کے حملہ کے اندیشہ میں مبتلا ہے یا پھر اسے ہندوستان ہی کی طرف سے حملے کا اندیشہ لاحق ہے۔ لیکن جہاں تک دوسرے ملکوں کے حملے کا اندیشہ کا تعلق ہے، ہندوستان کے ایک حصہ کی حیثیت سے ریاست جموں اور کشمیر کا پاکستان اور ان ملکوں کے درمیان حائل رہنا دفاعی زاویۂ نظر سے پاکستان کے لئے زیادہ مفید ہے۔ اس حال میں اس ریاست کے تحفظ اور دفاع کی تمام ذمہ داریاں ہندوستان پر عاید ہوتی ہیں لیکن ان کا فائدہ پاکستان کو پہنچتا ہے۔ لیکن اگر اسے ہندوستان کی جانب سے حملہ کا اندیشہ لاحق ہے تو اس کا اندیشہ اس لئے بالکل بے بنیاد ہے کہ اول تو گذشتہ بارہ سال کی مدت میں کسی نازک سے نازک موقع پر بھی حکومت ہند نے پاکستان کے خلاف معاندانہ رجحانات کا مظاہرہ نہیں کیا اور وہ ہمیشہ اس کے متعلق خیرسگالی کی حکمت عملی ہی پر کاربند رہی ہے۔ اپنی اس حکمت عملی کی بنا پر اس نے کشمیر کے معاملہ کو مجلس تحفظ میں پیش کیا تھا اور اپنے ان ہی خیرسگالانہ جذبات کے ماتحت جنوری ۱۹۵۰ء میں یہ تجویز بھی پیش کی تھی کہ دونوں ملکوں کو باہم جنگ نہ کرنے کا ایک معاہدہ کر لینا چاہیئے اور اسے پاکستان کی طرف سے مسترد کئے جانے کے باوجود یہ پیشکش اب تک بحال ہے لیکن اگر اس اندیشہ کو بھی صحیح فرض کر لیا جائے تو ریاست جموں اور کشمیر کو اس سلسلے میں کوئی اہمیت نہیں دی جا سکتی۔

کشمیر ایک دشوار گذار کوہستانی علاقہ ہے اور اگر بفرض محال ہندوستان کشمیر کی راہ سے پاکستان پر حملہ کرنے کا ارادہ بھی کرے تو اسے راہ کی ان تمام رکاوٹوں پر غالب آنا پڑے گا اور ایسی حالت میں کہ ان دونوں ملکوں کے درمیان ۸۰۰ سو میل تک کوئی قدرتی سرحد موجود نہیں ہے، کسی فوجی اقدام کے لئے اس ۸۰۰ میل کی غیر قدرتی سرحد کو چھوڑ کر محض کشمیر کو منتخب کرنا ایک ایسی فوجی غلطی ہوگی جس کی توقع فنِ جنگ کے کسی مبتدی سے بھی نہیں کی جا سکتی اور اس نا دیۂ نظر سے کشمیر کی عدم اہمیت کو سمجھ لینے کے بعد یہ سمجھ لینا دشوار نہیں رہ جاتا کہ پاکستان کی طرف سے اس کی دفاعی اہمیت پر زور دینا بھی کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔

پھر جہاں تک مغربی پاکستان کے ساتھ کشمیر کی طبعی مماثلت اور دریائے سندھ کی بدولت ان دونوں کے ارتباط کا تعلق ہے، پاکستان کے مقدمہ کی یہ کڑی سب سے زیادہ کمزور ہے اور علم طبقات الارض کا ایک مبتدی بھی اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھتا ہے کہ جو ممالک ایک دوسرے سے متصل واقع ہوتے ہیں ان کی بعض طبعی خصوصیات مشترک ہوتی ہیں لیکن ان طبعی خصوصیات کی مماثلت کی بنا پر کوئی ملک اپنے ہمسایہ ملکوں کو ملحق کر لینے کا تصور بھی نہیں کرتا۔ اسی طرح دریائے سندھ دو ملکوں میں بہنے والا دنیا کا کوئی واحد دریا نہیں ہے بلکہ یورپ کا بین اقوامی دریا ڈینیوب متعدد ریاستوں سے ہو کر گذرتا ہے اور دریائے نیل بھی مصر اور سوڈان کو سیراب کرتا ہے لیکن یہ دونوں دریا یورپ اور افریقہ کی جن ریاستوں سے ہو کر گذرتے ہیں ان میں سے کسی ریاست نے کبھی دوسری ریاستوں کو صرف اس بنا پر اپنا جزو نہیں قرار دیا کہ یہ دریا ان ریاستوں کو بھی سیراب کرتے ہیں۔ اس کے برعکس ایسے حالات کے لئے آب پاشی، جہاز رانی اور بحری تجارت کے بین اقوامی ضوابط پر عمل درآمد کیا جاتا ہے اور ہند اور پاکستان کے درمیان بھی آسانی کے ساتھ ان مسائل پر قابلِ عمل سمجھوتے ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ گذشتہ بارہ سال کے واقعات اس امر کے شاہد ہیں کہ اس تمام مدت میں پاکستان کشمیر سے نکلنے والے ان تمام

دریاؤں سے پورا پورا فائدہ اُٹھا رہا ہے اور ان ہی میں اقوامی ضوابط کے ماتحت عالمی بنک کے توسط سے ہند اور پاکستان کے درمیان نہری پانی کے تنازعہ کا فیصلہ ہوا ہے اور اب پاکستان آب پاشی کے لئے نہریں تعمیر کرنے پر رضامند ہو گیا ہے۔ کشمیر سے متعلق پاکستان کے مقدمہ کے تمام اجزا کی حقیقت کو سمجھ لینے کے بعد یہ سمجھ لینا بھی کوئی دشوار کام نہیں رہ جاتا کہ اپنے اس بے دلیل دعوے کے باوجود وہ اس ریاست پر قبضہ کر لینے کا خواہش مند ہے لیکن کیا ہندوستان سے اس بات کی توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ اپنے ایک حصہ سے دست بردار ہو کر اپنے کسی ہمسایہ ملک کے حوالہ کر دینے پر آمادہ ہو جائے گا؟

ریاست جموں اور کشمیر کے سلسلہ میں ہندوستان کے مؤقف کو سمجھنے کے لئے اس بات کو بھی ذہن نشین کر لینا چاہیئے کہ ۳- اکتوبر ۱۹۴۷ء کو مسلم کانفرنس کے بعض رہنماؤں نے راولپنڈی کے ایک ہوٹل میں جمع ہو کر آزاد کشمیر کے نام سے ایک متوازی حکومت قائم کرنے کا فیصلہ اور اعلان کیا تھا۔ برائے نام آزاد کشمیر کی یہ حکومت آج تک قائم ہے لیکن اول تو اس نام نہاد اثر ورسوخ اس کے صدر مقام مظفرآباد اور اس کے گرد ونواح ہی تک محدود ہے اور کشمیر کے ان اہم علاقوں کے ساتھ جو اس وقت پاکستان کے قبضہ میں ہیں عملاً اس نام نہاد حکومت کا کوئی تعلق نہیں، دوسرے اس نام نہاد حکومت نے بارہ سال کی اس طویل مدت میں پاکستان کے ساتھ اپنے زیر اثر علاقہ کے الحاق کا کوئی اعلان نہیں کیا۔ اس کے برعکس ہندوستان کے ساتھ ریاست جموں اور کشمیر کا الحاق قانونی طور پر اس کے حکمران مہاراجہ ہری سنگھ نے کیا تھا اور ان کے اس فیصلہ میں انھیں باشندگان کشمیر کی تائید اور حمایت حاصل تھی۔ اس لئے ایک جانب تو ہندوستان بجا طور پر مقبوضہ کشمیر کو بھی اپنا ایک حصہ تصور کرتا ہے اور دوسری طرف ہندوستان کی حکومت دنیا کے روبرو پوری ذمہ داری کے ساتھ ہند یونین کے ایک حصہ یعنی کشمیر کی نمایندگی کر سکتی ہے لیکن چونکہ اول تو ہندوستان کی

سرزمین پر اس برائے نام آزاد کشمیر کی حکومت کا وجود ہی غیر قانونی ہے اور دوسرے اس نے پاکستان کے ساتھ کشمیر کے الحاق کا کوئی اعلان بھی نہیں کیا اس لئے ان دونوں کو دنیا کے روبرو کشمیر کی نمائندگی کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔

بہرحال کشمیر کے مسئلہ کے ان دونوں پہلوؤں کو ذہن نشین کر لینے کے بعد ان پیچیدگیوں کو سمجھ لینے میں کوئی دشواری پیدا نہ ہوگی جو اس مسئلہ کو مجلس تحفظ میں پیش کرنے کے بعد سے اس وقت تک پیدا ہوتی رہی ہیں اور ان ہی سطور کی روشنی میں یہ بات بھی واضح ہو سکے گی کہ آج اس معاملہ میں ہندوستان کا موقف کیا ہے۔

سا تواں باب

مجلسِ تحفظ میں

گذشتہ ابواب کے مطالعہ کے بعد اس بات کے اعادہ کی ضرورت باقی نہیں رہتی کہ ۲۶ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو ریاست جموں اور کشمیر کے حکمران مہاراجہ ہری سنگھ کی اس درخواستِ الحاق کو منظور کر لینے کے بعد جسے ریاست کی عوامی سیاسی تنظیم "نیشنل کانفرنس" کے رہنماؤں کی کامل تائید اور حمایت حاصل تھی، یہ ریاست قانونی طور پر ہندوستان کا ایک حصہ بن گئی تھی اور حکومت ہند کو اپنے ایک ایسے علاقہ کے تحفظ کے لئے جس پر قبائلیوں کی مسلح یورش جاری تھی وہاں اپنی افواج بھیجنی پڑی تھیں۔ لیکن حکومت کی ان دفاعی سرگرمیوں کے دوران میں اسے اس امر کا اندازہ ہوا تھا کہ کشمیر پر حملہ کرنے والے ان قبائلیوں کو اس کے ہمسایہ ملک، پاکستان سے امداد مل رہی ہے اس لئے پہلے تو وہ حکومتِ پاکستان کو اس بات پر توجہ دلاتی رہی تھی کہ پاکستان سے مختلف طریقوں پر قبائلی حملہ آوروں کو جو امداد مل رہی ہے اسے بند کر دیا جانا چاہیئے۔ لیکن جب مسلسل کوششوں کے باوجود پاکستان نے اپنے رویہ میں کوئی تبدیلی نہیں کی تو اسے مجبور ہو کر اس معاملہ کو مجلسِ تحفظ میں پیش کرنا پڑا تھا۔ چنانچہ ۲۔ جنوری ۱۹۴۸ء کو ہندوستان کے وزیرِ اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے نئی دہلی میں ان واقعات کی وضاحت کرتے ہوئے نمائندگانِ جرائد کو بتایا تھا کہ:

"۲۲۔ دسمبر ۱۹۴۷ء کو ایک باقاعدہ مراسلہ کے ذریعہ سے وزیراعظم پاکستان کو، پاکستان کے جارحانہ اقدام اور اس کی طرف سے حملہ آوروں کو دی جانے والی امداد کے طریقوں سے مطلع کر کے ان سے اس جارحانہ اقدام اور حملہ آوروں کی امداد کو روکنے کی درخواست کی گئی تھی۔ حکومتِ ہند نے اس امر کا اعادہ کیا تھا کہ وہ پاکستان کے ساتھ اپنے دوستانہ تعلقات کو قائم رکھنے کی خواہش مند ہے اور اس بات کی توقع ظاہر کی تھی کہ اس کی شکایت پر فوری اور غیر مشروط توجہ مبذول کی جائے گی..... لیکن جب اس مراسلہ کا کوئی جواب موصول نہیں ہوا تو دو مرتبہ یاد دہانی کرانے کے بعد انجام کار ۳۰۔ دسمبر ۱۹۴۷ء کو یہ معاملہ مجلس تحفظ میں پیش کر دیا گیا۔[1]"

ہندوستان نے مجلس تحفظ میں اپنا جو مقدمہ پیش کیا تھا اس کے آغاز میں تمام حقائق کو تفصیل کے ساتھ قلم بند کرنے کے بعد یہ نتائج اخذ کیے تھے کہ:

(الف) حملہ آوروں کو پاکستانی علاقہ سے گذرنے کی اجازت ہے

(ب) انہیں پاکستانی علاقہ کو ہندوستان کے خلاف جارحانہ اقدامات کے لئے بطور مستقر استعمال کرنے کی اجازت حاصل ہے۔

(ج) حملہ آوروں میں پاکستان کے شہری بھی شامل ہیں

(د) حملہ آوروں کو ان کا بیشتر فوجی سامان، نقل و حمل کے وسائل اور رسد جس میں پٹرول بھی شامل ہے پاکستان ہی سے ملتا ہے

(ہ) پاکستان کے افسران حملہ آوروں کو تربیت دیتے، ان کی رہنمائی کرتے اور انہیں دوسرے طریقوں سے مدد دیتے ہیں۔

---

1. Kashmir 1947-1956

اور ان نتائج کی بنیاد پر مجلسِ تحفظ سے درخواست کی تھی کہ وہ حکومتِ پاکستان کو مشورہ دے کہ :-

(۱) پاکستان کے سرکاری ملازمین کو خواہ وہ فوجی ہوں یا انتظامی، ریاست جموں اور کشمیر کے خلاف جارحانہ حملہ میں شریک ہونے یا اس حملہ میں اعانت کرنے سے روک دیا جائے۔

(۲) پاکستان کے دوسرے شہریوں کو ریاست جموں اور کشمیر کی لڑائی میں کسی طرح بھی حصہ نہ لینے کی ہدایت کر دی جائے اور

(۳) (وہ) حملہ آوروں کو (الف) اپنے علاقہ سے گذر کر کشمیر پر حملہ کرنے اور اس علاقہ کو جارحانہ اقدامات کا مستقر بنانے کی اجازت نہ دے (ب) انھیں فوجی اور دوسری قسم کا سامان پہونچانا بند کر دے اور (ج) انھیں اس قسم کی کوئی امداد نہ دے جس سے یہ کشمکش طویل ہو سکتی ہو۔

اس ... کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا مقصد اس کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا کہ وہ اقوامِ متحدہ کو ریاست جموں اور کشمیر کے ساتھ اپنے قانونی تعلق سے آگاہ کر کے، مجلسِ تحفظ کے توسط سے پاکستان کو اس بات پر آمادہ کر سکے کہ وہ اپنے شہریوں کو کشمیر پر حملہ میں حصہ لینے سے روک دے، حملہ آوروں کو اپنے علاقہ سے گذرنے اور اپنے وسائلِ نقل و حمل استعمال کرنے کی اجازت نہ دے اور انھیں ضروری سامان مہیا نہ کرے۔ اور ہندوستان کو اس امر کی توقع تھی کہ مجلسِ تحفظ ادارۂ اقوامِ متحدہ کے ایک رکن کے خلاف دوسرے رکن کی اس اہم شکایت کو دور کرانے کے لئے کوئی فوری اور موثر قدم اٹھائے گی۔ چنانچہ ۱۵۔جنوری ۱۹۴۸ء کو مجلسِ تحفظ کے روبرو ہندوستان کے مقدمہ کی وضاحت کرنے کے بعد مسٹر گوپالا سوامی آئنگر آنجہانی نے کہا تھا کہ :

"ہم نے مجلسِ تحفظ کے روبرو ایک سیدھا سادہ معاملہ پیش کیا ہے...

اور ہمیں اپنی توجہات کو جن امور پر مرکوز کرنا چاہیئے وہ یہ ہیں کہ کشمیر کی سرزمین کو حملہ آوروں سے خالی کرایا جائے۔ اور وہاں لڑائی کو فوراً بند کرایا جائے۔" [1]

ہندوستان اور کشمیر کے تعلق کے سلسلہ میں بنیادی طور پر پاکستان کا کوئی تعلق نہیں ہونا چاہیئے تھا لیکن چونکہ قبائلی کشمیر پر پاکستانی علاقہ سے گذر کر حملہ آور ہوئے تھے، کشمیر کی سرحد کے قریب، پاکستان میں ان حملہ آوروں کے فوجی مستقر قائم تھے، ان کے ساتھ پاکستان کے شہری شامل تھے اور پاکستان میں سے انھیں ضروری سامان، رسد اور نقل و حمل کی آسانیاں مل رہی تھیں اس لئے ہندوستان اپنے مقدمہ میں اسے شامل کرنے پر مجبور تھا اور جیسا کہ ہندوستان نے اپنی ان مفصل تجاویز میں بتایا تھا جو اس نے اس سلسلہ میں ۲۷ جنوری ۱۹۴۷ء کو مجلسِ تحفظ میں پیش کی تھیں۔ وہ یہ چاہتا تھا کہ:-

"پاکستان ان قبائلیوں اور دوسرے لوگوں کو جنھوں نے کشمیر پر حملہ کیا ہے اور جو ابھی تک ریاست میں موجود ہیں، سمجھا بجھا کر ریاست سے واپس چلے جانے اور لڑائی سے دست کش ہو جانے پر آمادہ کرے، انھیں اپنے علاقہ سے گذرنے اور اُسے کشمیر کے خلاف جارحانہ اقدامات کا مستقر بنانے کی ممانعت کر دے اور انھیں براہ راست یا بالواسطہ کسی قسم کی امداد نہ دے۔" [2]

نوٹ:- ادارۂ اقوامِ متحدہ نے مجلسِ تحفظ (سیکورٹی کونسل) کی تمام یادداشتوں کے لیے انگریزی کا حرف S اختیار کیا ہے۔ P.V سے مراد وہ تقریریں ہیں جو مجلس کی نشستوں میں کی جاتی ہیں۔ ان تمام یادداشتوں پر ترتیبی نمبر اور تاریخیں درج ہوتی ہیں۔ اس کتاب میں حوالوں کے لئے یہی طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔

1. S/P. V. 227, Jan. 15, 1948
2. S/P. V. 236, Jan. 28, 1948 Pp. 266-267

لیکن اسے ادارۂ اقوامِ متحدہ کی تاریخ کا ایک حادثہ کہنا چاہیئے کہ

" بین اقوامی حالات کی پیچیدگیوں کی بدولت مجلسِ تحفظ اس معاملہ میں
غیر جانبدارانہ اور بے لاگ رویہ اختیار نہیں کرسکی جس کی بدولت کشمیر کا سوال
غیر قدرتی طور پر بین اقوامی الجھنوں سے وابستہ ہو کر رہ گیا اور اس مسئلہ کو
پُرامن طریقہ پر حل کرنے کی کوشش میں دُور افتادہ اور غیر متعلق سوالات
بھی شامل ہو گئے[1] "

چنانچہ شیخ محمد عبداللہ نے ۱۹۴۸ء میں مجلسِ تحفظ کو خطاب کرتے ہوئے اس حقیقت کو ان الفاظ
میں بیان کیا تھا کہ :

مجلسِ تحفظ کو اس معاملہ کے ساتھ دوسرے دُور افتادہ مسائل کو وابستہ
کرنے سے گریز کرنا چاہیئے ..... مجلسِ تحفظ کے سامنے صرف یہ مسئلہ ہے
کہ پاکستان کو اپنی بین اقوامی ذمہ داریوں پر قائم رہنا چاہیئے اور اسے
بیرونی حملہ آوروں کی امداد نہیں کرنی چاہیئے[2] "

لیکن یہاں اس بات کو بھی ذہن نشین کر لینا چاہیئے کہ مجلسِ تحفظ میں کشمیر کے سوال سے متعلق
کھلی ہوئی حقیقتوں کو نظرانداز کر کے اسے اقتدار پسندی کی سیاست (پاور پالٹیکس) کے
ساتھ وابستہ کر دینے کی وجہ یہ تھی کہ دنیا کی اکثر قومیں ابتداء ہی سے دو گروہوں میں
منقسم چلی آرہی ہیں اور ان میں سے ہر گروہ اس کوشش میں مصروف رہا ہے کہ وہ زیادہ
سے زیادہ قوموں کو اپنے ساتھ ملا کر خود کو دوسرے گروہ کے مقابلہ میں زیادہ مضبوط اور
طاقتور بنائے۔ یہی دونوں گروہ ادارۂ اقوامِ متحدہ میں بھی ایک دوسرے کے حریف
رہتے چلے آئے ہیں اور بین اقوامی مسائل میں بھی ان دونوں گروہوں کے درمیان
مستقل کشمکش جاری رہی ہے لیکن ہندوستان ہمیشہ سے نہ صرف ایک غیر جانبدار ملک

1-2. Kashmir Decides its Destiny P. 2

ہی رہا ہے بلکہ دوسروں کو بھی غیر جانبدار رہنے اور فوجی نیز سیاسی گروہ بندیوں سے علیحدہ رہنے کی دعوت دے رہا ہے اور یہ بات ظاہر ہے کہ اس کا یہ طرزِ عمل کسی گروہ میں بھی پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھا جا سکتا اس لئے جو گروہ بھی ادارۂ اقوام متحدہ میں برسرِ اقتدار ہوگا وہ ہندوستان ہی کو نہیں بلکہ ہر غیر جانبدار ملک کو اپنا ہمنوا بنانے کے لئے یا پھر اپنے گروہ سے تعلق رکھنے والے ملکوں کو فائدہ پہونچانے کی غرض سے کم از کم ان ملکوں سے تعلق رکھنے والے مسائل کو اُلجھا ضرور سکتا ہے اور یہ بات واضح ہے کہ کشمیر کے معاملہ میں بھی ہندوستان کو اسی بین الاقوامی کش مکش کا شکار ہونا پڑا ہے۔

تنازعات کے تصفیہ کا آسان طریقہ یہ ہے کہ ان کے دائرہ کو زیادہ سے زیادہ محدود کر کے ان کے بنیادی اسباب و علل کو متعین کر لیا جائے اور پھر واقعات اور مشاہدات کی روشنی میں اس بات کا فیصلہ کیا جائے کہ کسی تنازعہ کی ذمہ داری کس فریق پر عاید ہوتی ہے۔ ہندوستان نے مجلسِ تحفظ میں اپنی شکایت پیش کرتے ہوئے اسی اصول کو مدِ نظر رکھا تھا اور مجلسِ تحفظ کو اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی تھی کہ ـــــ کشمیر ہندوستان کے ساتھ الحاق کے بعد، اس ملک کا ایک حصہ بن چکا ہے۔ اس لئے آج ہندوستان کے خلاف جو جارحانہ حملہ جاری ہے اسے ختم ہو جانا چاہیئے اور پاکستان کی جانب سے حملہ آوروں کو جو امداد مل رہی ہے اسے بند ہو جانا چاہیئے ـــــ اور اگر مجلسِ تحفظ ان ہی حدود میں رہ کر ہندوستان کی شکایت پر غور کر سکتی تو یہ مسئلہ آج سے بہت پہلے طے ہو چکا ہوتا لیکن اس نے اس کے دائرے کو وسعت دے کر اس میں بہت سے دور افتادہ اور غیر متعلق مسائل اور مباحث کی شمولیت کا دروازہ کھول دیا جس کے نتیجہ میں اس کے زاویۂ نظر سے یہ مسئلہ آج تک اُلجھا ہوا ہے۔

ہندوستان کے مندوب مسٹر گوپالا سوامی آئینگر نے مجلسِ تحفظ کے روبرو

۱۵ جنوری ۱۹۴۸ء کو اپنے ملک کے مقدمہ کی وضاحت کی تھی اور ۱۶ جنوری ۱۹۴۸ء کو پاکستان کے مندوب اور وزیرِ خارجہ سر ظفراللہ خاں نے اس کا جواب دیا تھا۔ لیکن اس جواب میں ہندوستان کی شکایت کی تردید کرنے کی بجائے ان کی کوشش یہ رہی تھی کہ اس کے دائرہ کو زیادہ سے زیادہ وسیع کرا دیں اور اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے انھوں نے بھی وہی نفسیاتی طریقۂ کار اختیار کیا تھا جو ہندوستان کی تقسیم کے مطالبہ میں مسلمانوں کی ایک معقول تعداد کو اپنا ہمنوا بنانے کے لئے مسلم لیگ کے رہنما اختیار کر چکے تھے۔ لیکن ان دونوں طریقوں میں فرق یہ تھا کہ مسلم لیگ کے رہنماؤں نے براہِ راست مذہب کے نام پر مسلمانوں کو ہندوستان کی تقسیم کے مطالبہ کی تائید پر آمادہ کرنے کی کوشش کی تھی اور سر ظفراللہ خاں نے اپنے جواب میں حقائق اور استدلال کو نظر انداز کر کے محض جذباتِ انسانیت کو اُبھار کر حصولِ مقصد کی سعی کی تھی۔ چنانچہ مسٹر مائیکل بریچر نے لکھا ہے کہ:

"مجلسِ تحفّظ کی توجہ کو قبائلیوں کے حملہ کی جانب سے ہٹا کر فرقہ وارانہ فسادات کی جانب مرکوز کر دینے کی سعی کے ساتھ ساتھ سر ظفراللہ خاں کی کوشش یہ بھی رہی تھی کہ جو سوال اقوامِ متحدہ کے زیرِ غور ہے اس کے دائرہ کو وسیع تر بنا دیا جائے[1]"

لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کا حقیقی مقصد اس کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا کہ وہ مجلسِ تحفّظ کی توجہ کو ہندوستان کی اصل شکایت سے ہٹا کر غیر متعلق مسائل کی جانب مبذول کرا دیں اور انھوں نے جذباتِ انسانیت کو متحرک کرنے کا جو طریقہ اختیار کیا تھا وہ اس مقصد کے حصول کے ایک ذریعہ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا تھا۔

بہر حال سر ظفراللہ خان نے ابتدا ہی سے اپنی تقریر میں اپنے اس متعین طریقۂ کار

1. The Struggle for Kashmir P. 67

کو مدِ نظر رکھا تھا اور یہ بات ذہن نشین کرانے کی کوشش کی تھی کہ

"کشمیر کا مسئلہ بجائے خود کوئی اہم اور منفرد واقعہ نہیں بلکہ یہ تقسیم سے پہلے کے ان واقعات کے سلسلہ کی ایک کڑی اور خصوصاً ۴۷-۱۹۴۶ء میں پنجاب میں برپا ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات کا نتیجہ ہے۔[1]"

چنانچہ انھوں نے ۱۵ جنوری ۱۹۴۸ء کو مسٹر آئنگر کی تقریر کا مختصر جواب دیتے ہوئے کہا تھا کہ

"ہندوستان کے مندوب نے اس سوال کو جس درجہ سادہ اور ایماندارانہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے وہ ہمیں اس درجہ سادہ اور ایماندارانہ معلوم نہیں ہوتا۔ اس لئے مجلس تحفظ کے روبرو کشمیر کے مسئلہ کا تمام تر پس منظر پیش کرنا ضروری ہے۔[2]"

اور دوسرے دن اپنی مفصل تقریر کے دوران میں انھوں نے اعلان کیا تھا کہ

"کشمیر میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ انھیں واقعات کی ایک کڑی ہے جن کی شدت مشرقی پنجاب میں حدِ انتہا کو پہنچ چکی ہے اور کشمیر کے واقعات کو ان واقعات سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔[3]"

لیکن یہ امر محتاجِ بیان نہیں کہ سر ظفر اللہ خان نے اپنی تقریر میں مشرقی پنجاب کے جن فرقہ وارانہ ہنگاموں کا حوالہ دیا تھا وہ صرف مشرقی پنجاب ہی تک محدود نہیں تھے بلکہ مغربی پنجاب کے پاکستانی حصہ میں اس سے بھی زیادہ شدت کے ساتھ برپا ہوئے تھے۔

سر ظفر اللہ خاں نے اپنی تقریر میں جذبات انسانیت کو متحرک کرنے کا جو نفسیاتی طریقہ اختیار کیا تھا اس کا تذکرہ کرتے ہوئے مائیکل بریچر نے لکھا ہے کہ

1. The Struggle for Kashmir P. 66
2. S/P. V. 227, P. 31
3. S/P. V. 229, P. 117

(الف) ہندوستان کی شکایت میں 'جارحانہ حملہ' کے سوال کو بہت زیادہ اہمیت حاصل تھی۔ پاکستان اس سوال کو نظر انداز کرا دینا چاہتا تھا

(ب) ہندوستان کی شکایت میں بنیادی اہمیت کا دوسرا عنصر' کشمیر پر اس کے قانونی حق کا سوال تھا۔ پاکستان اس سوال کی اہمیت کو کم سے کم کر دینا چاہتا تھا۔

(ج) پاکستان کشمیر پر حملہ میں اپنے شہریوں کی شرکت کو بھی ان کے جذبات انسانیت کا تقاضا ثابت کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ سر ظفر اللہ خاں نے کہا تھا کہ — اب یہ لوگ (پاکستانی فوجی) رخصت پر جاتے ہیں اور یہ دیکھتے ہیں کہ ان کے ہم قوموں کا قتل عام کیا جا رہا ہے یا انھیں شدید اذیتیں دی جا رہی ہیں تو اگر ان میں سے کچھ ان واقعات میں خود حصہ لینے لگتے ہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ انھیں لڑائی میں شریک ہونے کے لئے رخصت دی جاتی ہے۔ ایک انسان ان حالات میں اور کر ہی کیا سکتا ہے؟

(د) پاکستان اپنے ان ممتاز عمال کی مدافعت کرنا چاہتا تھا جنھوں نے قبائلیوں اور پاکستان کے شہریوں کو کشمیر پر حملہ کی ترغیب دی تھی۔ چنانچہ سر ظفر اللہ خاں نے کہا تھا کہ — ان حالات میں .... یہ بات صحیح ہے کہ بعض صوبائی وزراء نے کچھ ایسی باتیں کہی ہیں جنھیں نہ کہنا ہی مناسب ہوتا لیکن اس بات کی توقع کی جانی چاہیئے کہ وزیر ہو جانے کے بعد وہ انسانیت کے دائرے سے خارج نہیں ہو گئے ہیں اور یہ امید کرنا کہ چونکہ وہ وزیر ہیں اس لئے انھیں مسلمان کی حیثیت سے بھی اپنے جذبات ہمدردی اور اپنی خواہشات کا اظہار نہیں کرنا چاہیئے۔ ایک ایسی امید

ہے جو انسانوں سے قائم نہیں کی جا سکتی۔

(سر ظفر اللہ خاں نے ان سطور میں جن باتوں کا حوالہ دیا ہے وہ پاکستانی باشندوں اور قبائلیوں کو مشتعل کر کے انھیں کشمیر پر حملہ کرنے اور لڑائی جاری رکھنے سے متعلق پاکستان کے اعلیٰ حکام اور رہنماؤں کے وہ اعلانات اور تقریریں ہیں جن کا مفصل تذکرہ گزشتہ ابواب میں کیا جا چکا ہے)

(ج) پاکستان ہندوؤں اور سکھوں کے اس قتل عام پر پردہ ڈالنا چاہتا تھا جو مغربی پنجاب میں ہوا تھا۔

(د) اور سب کے بعد پاکستان کا مقصد کشمیر پر قبائلیوں کے جارحانہ حملوں کو جائز اور معقول ثابت کرنا تھا[1]"

سر ظفر اللہ خان کے بیان کے اس خلاصہ اور اس پر مائیکل بریچیر کے ان تاثرات کی روشنی میں غور کرنے کے بعد یہ دو باتیں بالکل واضح ہو جاتی ہیں کہ اوّل تو انھوں نے اپنے اس پورے بیان میں مسلم لیگ کی بنیادی فرقہ وارانہ حکمت عملی کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے کشمیر کے مسئلہ کو 'دو قومی نظریہ' پر مبنی ثابت کرنے کی کوشش کی تھی اور دوسرے انھوں نے ہندوستان کی شکایت کے تمام اجزاء کی صحت کو تسلیم کر لیا تھا لیکن واقعات کے اسباب علل کو دوسرے رنگ میں پیش کیا تھا اور اس وقت کے بین اقوامی حالات کی پیچیدگیوں کی بدولت مجلسِ تحفظ نے بھی ان کے ان گمراہ کن نظریات کو قبول کر لیا تھا اور اسی لئے اس نے ۲۲ جنوری ۱۹۴۸ء کو ہندوستان کی شکایت کے اصل عنوان 'جموں اور کشمیر کا سوال' کو تبدیل کر کے اسے 'ہند اور پاکستان کا سوال' کے نام سے موسوم کر دیا تھا۔ مجلسِ تحفظ نے اس معاملے میں جو رویہ اختیار کیا تھا اس کے متعلق

1. The Soruggle for Kashmir Pp. 69-70

مسٹر کنگز لے مارٹن نے وسط فروری ۱۹۴۸ء کے نیو اسٹیٹسمن اینڈ نیشن میں ان الفاظ میں اظہارِ خیال کیا تھا کہ :-

"ہندوستان اس بات کا مستحق ہے کہ اس کی درخواست پر ایمانداری کے ساتھ غور کیا جائے اور اسے نظر انداز نہ کر دیا جائے۔ مجلسِ تحفظ کے سامنے جو سیدھا سادہ سوال پیش کیا گیا تھا اس پر غور کرنے سے اس کے انکار سے تقریباً ہر ہندوستانی کو اس بات کا یقین ہو گیا ہے کہ معاملہ پر حقائق کی روشنی میں غور نہیں کیا گیا ہے بلکہ اسے اقتدار پسندانہ سیاست کے تابع کر دیا گیا ہے اور خصوصاً یہ کہا جاتا ہے کہ اس طرزِ عمل کے پس پردہ جو عناصر کام کر رہے ہیں ان میں سے اہم ترین عنصر پاکستان میں اینگلو امریکن فوجی مستقروں کا معاملہ ہے[1]"

اور ان ہی حقائق کے سلسلہ میں ۱۹۴۸ء میں شیخ محمد عبداللہ نے مجلسِ تحفظ میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ :

"میں ایک بار پھر مجلسِ تحفظ سے درخواست کرتا ہوں کہ اسے کشمیر کے سوال کو طے کرتے ہوئے متنازعہ فیہ نکتہ کو دوسرے معاملات کے ساتھ اُلجھا نہیں دینا چاہیے[2]"

لیکن یہ امر محتاجِ بیان نہیں کہ مجلسِ تحفظ میں بعض معلوم اور غیر معلوم اسباب کی بنا پر اس سوال کا دائرہ وسیع تر ہوتا گیا۔ اس کے باوجود جیسا کہ آئندہ سطور سے واضح ہو سکے گا ہندوستان اس مسئلہ کو پرامن طریقے سے حل کرنے کے بنیادی نصب العین

---

1. New Statesman and Nation, Feb. 1948

2. Kashmir Decides its Destiny P. 2

پر قائم رہا اور اس نے اسے طے کرنے کے لئے ۲۷۔ جنوری ۱۹۴۸ء کو مجلسِ تحفظ کے روبرو اپنی جو مفصل تجاویز پیش کیں وہ اس کی اس خواہش کے بیّن ثبوت کی حیثیت رکھتی ہیں۔

گذشتہ ابواب میں یہ بات بتائی جا چکی ہے کہ اوّل تو ہندوستان کی حکومت ۲۶۔ اکتوبر ۱۹۴۷ء سے کشمیر میں رونما ہونے والے تمام واقعات سے باخبر ہونے کے باوجود وہاں کسی طرح بھی مداخلت نہیں کرنا چاہتی تھی لیکن جب اس نے ہندوستان کے ساتھ مہاراجہ ہری سنگھ کی اس درخواستِ الحاق کو منظور کر دیا جسے ریاست جموّں اور کشمیر کی واحد سیاسی تنظیم "نیشنل کانفرنس" کے رہنماؤں کی کامل تائید اور حمایت حاصل تھی تو اس نے اپنے مسلّمہ اصول کے ماتحت اس الحاق کو اس مقصد کے پیشِ نظر منظور کیا تھا جسے ہندوستان کے وزیر اعظم اور وزیر خارجہ پنڈت جواہرلال نہرو نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ:

"میں اس بات کو واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ اس ہنگامی صورت حال میں کشمیر کی امداد کا سوال کسی طرح بھی اسے ہندوستان کے ساتھ ملحق ہو جانے کے لئے متاثر کرنے کے خیال پر مبنی نہیں ہے۔ بلکہ ہمارا نظریہ یہ ہے اور ہم متواتر اس کا اعلان کرتے رہے ہیں کہ ہر متنازعہ فیہ علاقہ یا ریاست میں الحاق کے سوال کو عوام کی خواہشات کے مطابق طے کیا جائے گا اور ہم اپنے اس نظریہ پر قائم ہیں لیکن یہ بات ظاہر ہے کہ اگر بیرونی حملہ کشمیر کی علاقائی سالمیت کو نقصان پہونچانے میں کامیاب ہو گیا تو کشمیر کے باشندوں کے لئے اظہار رائے کی آزادی کو قائم رکھنا ممکن نہ ہو سکے گا[1]"

اور جس کے متعلق مسٹر لنگڑ لے مارٹن نے فروری ۱۹۴۸ء میں لکھا تھا کہ:

1. Telegram from Foreign, New Delhi to Prime Minister U. K. London 25-10-47

"اس بات میں شبہ کی ذرہ برابر بھی گنجائش نہیں کہ اگر ہندوستان گذشتہ اکتوبر میں (کشمیر میں) مداخلت نہ کرتا تو سری نگر اور حسین وادئ کشمیر میں آج راکھ کے ڈھیروں کے علاوہ کچھ نظر نہ آتا۔"[1]

اس لئے یہ بات ظاہر ہے کہ مجلس تحفظ میں اپنی شکایت پیش کرنے سے بھی ہندوستان کا مقصد یہ تھا کہ اس کے توسط سے کشمیر کی سرزمین کو حملہ آوروں کو پاک کرانے کے بعد ایسی سازگار اور پُرامن فضا پیدا کی جائے جس میں کشمیر کے باشندے آزادی کے ساتھ اپنے مستقبل یا ریاست کے الحاق کا فیصلہ کر سکیں۔

ہندوستان نے کشمیر کے سوال کو طے کرنے کے لئے ۲۷ جنوری ۱۹۴۸ء کو مجلس تحفظ کے روبرو تجاویز کا جو مسودہ پیش کیا تھا اس میں انھیں ہر دو مقاصد کو مدّنظر رکھتے ہوئے پہلے مقصد کے حصول کے لئے یہ تجویز پیش کی تھی کہ

"پاکستان کی حکومت اپنے اثر سے کام لے کر حملہ آوروں کو کشمیر سے واپس چلے جانے پر آمادہ کرے۔ انھیں پاکستانی علاقہ سے گذرنے کی ممانعت کر دے، انھیں پاکستانی علاقہ میں فوجی مستقر قائم کرنے کی اجازت نہ دے اور ان کی امداد نہ کرے۔

اور جب یہ پہلا مقصد حاصل ہو جائے تو دوسرا مقصد یعنی امن قائم کرنے اور حالات کو حسب معمول بنانے کے لئے

ان تمام کشمیریوں کو جو جنگ کے باعث اپنے گھروں سے بھاگ گئے تھے واپس بلایا جائے اور انھیں پورے شہری حقوق کے استعمال کی اجازت دی جائے۔ تمام سیاسی قیدیوں کو چھوڑ دیا جائے۔ مناسب سیاسی سرگرمیوں پر

---

1. New Statesman and Nation, Feb. 1948

کوئی پابندی نہ لگائی جائے اور اختلافِ خیالات یا سابقہ سیاسی سرگرمیوں
کی بنا پر کسی کے خلاف کوئی انتقامی کارروائی نہ کی جائے[1]۔"

اپنی ان تجاویز میں ہندوستان نے یہ بھی کہا تھا کہ لڑائی ختم ہونے کے بعد سے استصواب رائے عامہ کے وقت تک کشمیر کے تحفظ کی یقین دہانی کی جانی چاہیئے اور چونکہ کشمیر ہندوستان کے ساتھ ملحق ہو چکا ہے اس لئے

"جس وقت تک ہندوستان کے ساتھ کشمیر کا یہ الحاق قائم ہے
حکومت ہند اس کے دفاع کی ذمہ دار بھی ہے اس لئے اگرچہ جنگ بندی
کے بعد کشمیر میں متعین ہندوستانی افواج کی تعداد کو کم کر دیا جائے گا لیکن
آئندہ کے لئے کسی بیرونی حملہ کی مدافعت اور انتظامی حکام کو امن اور قانون
کی بقا میں مدد دینے کے لئے مناسب تعداد میں ہندوستانی افواج کا
وہاں رہنا ضروری ہے[2]۔"

پھر جہاں تک کشمیر کے داخلی، سیاسی اور انتظامی معاملات کا تعلق ہے ہندوستان نے تجویز کیا تھا کہ

"اس وقت کشمیر میں جو ہنگامی حکومت قائم ہے اُسے ذمہ دار وزارت
میں تبدیل کر دیا جائے[3]۔"

اور سب کے بعد ہندوستان نے کشمیر کے تنازعہ کو طے کرنے کی غرض سے استصواب رائے عامہ کے سلسلہ میں یہ تجویز پیش کی تھی کہ

"بالغوں کے حق رائے دہندگی کی بنیاد پر نیشنل اسمبلی طلب کی جائے
اس اسمبلی کی بنیاد پر نیشنل گورنمنٹ قائم کی جائے اور یہ حکومت، اقوام متحدہ

1-2-3. S/P. V. Jan. 1948, Pp. 266- 267

کے مقرر کردہ افراد کی ہدایت کے مطابق اور ان کی نگرانی میں استصواب رائے عامہ کرائے[1]۔"

ہندوستان کی ان تجاویز کے مقابلہ میں پاکستان نے کشمیر کے تنازعہ کو طے کرنے کے لئے جو تجاویز پیش کی تھیں ان کا خلاصہ یہ تھا کہ ادارۂ اقوامِ متحدہ

(الف) جموں اور کشمیر میں ایک غیر جانب دار عبوری حکومت قائم کرانے کا اہتمام کرے

(ب) ریاست کو تمام تر مسلح افواج سے خالی کرائے

(ج) ریاست کے جو باشندے ہنگاموں کے باعث ریاست سے چلے گئے تھے یا انہیں چلے جانے پر مجبور کیا گیا تھا انہیں واپس بلائے۔ اور

(د) استصواب رائے عامہ کا انتظام کرے[2]۔"

اور اگرچہ کشمیر کے تنازعہ کو طے کرنے کے سلسلے میں بظاہر دونوں ملکوں کی تجاویز میں کوئی فرق نظر نہیں آتا لیکن تھوڑی سی توجہ کے ساتھ ان دونوں کا مطالعہ کرنے کے بعد ان کا بنیادی فرق اور دونوں ملکوں کے زاویۂ نظر کا اختلاف واضح ہو جاتا ہے۔

گذشتہ سطور میں کئی مرتبہ اس کا اعادہ کیا جا چکا ہے کہ ۲۶۔ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو ہندوستان کے ساتھ ریاست جموں اور کشمیر کے الحاق کے بعد اس ریاست کے دفاع کی تمام تر ذمہ داری ہندوستان پر عاید ہو گئی تھی۔ اس لئے وہ اپنے اس مطالبے میں قطعاً حق بجانب تھا کہ کشمیر میں جنگ کو فوراً بند کر دیا جائے اور استصواب رائے عامہ کی تکمیل تک ہندوستانی افواج معقول اور مناسب تعداد میں وہاں مقیم رہیں۔ اور چونکہ پاکستان نے

---

1. S/P. V. January 1948, Pp. 266-267

2. S/P: V. 236, Jan. 28, 1948, Pp. 267-268

کشمیر پر حملہ کرنے میں حملہ آوروں کی مدد کی تھی اس لئے پاکستان کو اپنے اثر سے کام لے کر ان حملہ آوروں کو واپسی پہ آمادہ کرنا چاہیئے اور اس انکشاف کے بعد کہ پاکستان کی باقاعدہ افواج بھی کشمیر کی سرزمین پہ موجود ہیں اس کی طرف سے اس بات کے مطالبہ کو بھی غیر حق بجانب نہیں قرار دیا جا سکتا کہ ان پاکستانی افواج کو بھی واپس چلا جانا چاہیئے۔

پاکستان بھی ریاست میں قیام امن کی ضرورت کا منکر نہیں تھا لیکن ہندوستان کے برعکس وہ قیام امن کے مقصد کو بنیادی اور مقدم ترین مقصد نہیں سمجھتا تھا اور چونکہ وہ ہندوستان کے ساتھ کشمیر کے الحاق کو بھی تسلیم نہیں کرتا تھا اس لئے وہ کشمیر سے متعلق ہندوستان پہ عاید ہونے والی ذمہ داریوں کا منکر بھی تھا اس لئے اس کا مطالبہ یہ تھا کہ کشمیر میں امن قائم کرنے اور جنگ بند کرانے کے لئے قبائلی حملہ آوروں نیز نام نہاد آزاد کشمیر کو اس بات کا یقین دلایا جائے کہ الحاق کے سوال پہ کشمیر کے باشندوں کی رائے معلوم کرنے کے لئے استصواب بین اقوامی انتظام کے ماتحت کرایا جائے گا اور اس تجویز کا صاف مطلب یہ تھا کہ اول تو پاکستان قبائلی حملہ آوروں کو واپسی کے لئے آمادہ کرنے کے سلسلہ میں خود کوئی ذمہ داری قبول نہیں کرنا چاہتا دوسرے وہ قبائلی حملہ آوروں کو بھی اس تنازعہ میں ایک فریق کا درجہ دلانا چاہتا ہے اور تیسرے استصواب کے معاملہ کو پوری طرح بین اقوامی انتظام کے ماتحت دے کر ایک جانب تو کشمیر کی جائز اور قانونی حکومت کو اس معاملے میں بالکل مفلوج کرا دینا چاہتا تھا اور دوسری طرف ہندوستان کو کشمیر کے دفاع اور تحفظ کے قانونی حق سے محروم کر دینا چاہتا تھا۔

بہر حال مجلس تحفظ کی طرف سے اصل شکایت کو نظر انداز کر دئے جانے اور کشمیر کے سوال کو طے کرانے کے لئے پاکستان کی جانب سے یہ الجھی ہوئی اور متضاد تجاویز پیش کئے جانے کے باوجود ہندوستان اس تنازعہ کو طے کرانے کی جد و جہد میں مصروف رہا۔

اور جیسا کہ آئندہ صفحات کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ وہ ان تجاویز کو قبول کرتا رہا جو اس سلسلہ میں ادارۂ اقوام متحدہ کی جانب سے طے کی جاتی رہی تھیں اور ان ہی صفحات کے مطالعہ سے یہ بات بھی واضح ہو سکے گی کہ ادارۂ اقوام متحدہ کے زاویۂ نظر سے مسئلہ ابھی تک کیوں طے نہیں ہو سکا ہے۔

آٹھواں باب

ابتدائی بحث کے نتائج

ہندوستان نے کشمیر کے معاملہ کو مجلسِ تحفظ کے روبرو ۳۰ دسمبر ۱۹۴۷ء کو پیش کیا تھا۔ اس طرح یہ معاملہ بارہ سال سے مجلسِ تحفظ کے زیرِ غور ہے اور وہ اسے طے کرانے کے لئے مختلف اوقات میں مختلف اقدامات بھی کرتی رہی ہے جنھیں یہاں تفصیل کے ساتھ بیان کرنا ممکن نہیں ہو سکتا لیکن اس معاملہ کی موجودہ نوعیت کو سمجھنے کے لئے مجلسِ تحفظ کی کارروائیوں کو پیشِ نظر رکھنا بھی ضروری ہے۔ خصوصاً اس مسئلہ پر مجلسِ تحفظ میں جو ابتدائی بحث ہوئی تھی اس کے نتائج آج تک اس سوال پر اثر انداز ہو رہے ہیں اس لئے مجلسِ تحفظ کی کارروائیوں کا مختصر تذکرہ کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

مجلسِ تحفظ نے ہندوستان کی شکایت موصول ہونے کے بعد جو پہلا رسمی قدم اُٹھایا تھا وہ دونوں ملکوں کے نام اس کے صدر کی ایک اشد ضروری اپیل تھی۔ یہ اپیل ۶ جنوری ۱۹۴۸ء کو دونوں ملکوں کی حکومتوں کے نام بھیجی گئی تھی اور اس میں کہا گیا تھا کہ — دونوں ملکوں کو حالات کو مزید پیچیدہ بنانے سے احتراز کرنا اور انھیں ان کی موجودہ صورت ہی پر برقرار رکھنا چاہیئے — اور ۱۷ جنوری ۱۹۴۸ء کو اس نے ایک قرارداد منظور کر کے

دونوں ملکوں کو اس امر پر توجہ دلائی تھی کہ وہ :

"کوئی ایسا بیان دینے اور کوئی ایسا کام کرنے سے پرہیز کریں جس سے حالات کے مزید خراب ہونے کا احتمال ہو اور...... ایسی حالت میں کہ یہ معاملہ مجلسِ تحفظ کے زیرِ غور ہے اگر حالات میں کوئی اہم تبدیلی واقع ہو یا اس کے وقوع کا امکان ہو یا پھر کوئی ایسی تبدیلی رونما ہو رہی ہو تو اس کی اطلاع فوراً مجلسِ تحفظ کو دیں[1]۔"

اسی روز برطانوی مندوب کی تحریک پر یہ تجویز بھی منظور کی گئی کہ

"مجلسِ تحفظ کے صدر کو فریقین سے تبادلۂ خیالات کر کے کوئی ایسی صورت نکالنے کی کوشش کرنی چاہیئے جسے فیصلہ کی بنیاد بنایا جا سکے[2]۔"

اور پھر تیسرے روز ۲۰ جنوری ۱۹۴۸ء کو مجلسِ تحفظ نے اپنی وہ قرارداد منظور کی جس کے ماتحت اس سلسلہ میں اقوامِ متحدہ کے تین اراکین پر مشتمل ایک کمیشن کے تقرر کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ اس کمیشن کے دو اراکین کے انتخاب کا حق علٰحدہ علٰحدہ ہندوستان اور پاکستان کو دیا گیا تھا اور تیسرے رکن کے انتخاب کو دونوں ملکوں کے منتخبہ نمائندوں کے اتفاقِ رائے پر منحصر رکھا گیا تھا او

اس کمیشن کے دائرۂ عمل میں جن امور کو شامل کیا گیا تھا ان میں سے پہلی بات یہ تھی کہ وہ —— اس امر کی تحقیقات کرے کہ اس تنازعہ میں وہ حقائق موجود ہیں یا نہیں جن پر اقوامِ متحدہ کے منشور (چارٹر) کی دفعہ ۳۴ کا اطلاق ہوتا ہے[3] اور دوسری بات یہ تھی کہ وہ فیصلہ کی راہ میں حائل

1. S/651, 17.1.48

2. S/P. V. 229, P. 125

[3] ادارہ اقوامِ متحدہ کے منشور کی دفعہ ۳۴ کا ترجمہ یہ ہے کہ: مجلسِ تحفظ، ایسے ہر تنازعہ اور ہر ایسی صورتِ حال کی تحقیقات کر سکتی ہے جس کی بدولت بین الاقوامی اختلافات کا اندیشہ ہو یا جس کی بنا پر کوئی تنازعہ برپا ہو سکتا ہو۔ تاکہ وہ اس نتیجہ پر پہونچ سکے کہ اگر یہ تنازعہ قائم رہا یا یہ صورتِ حال جاری رہی تو اس سے بین الاقوامی امن اور سلامتی خطرے میں تو نہیں پڑ جائے گی!

مشکلات کو دُور کرنے میں اپنے اثر و رسوخ سے کام لے اور ان ہدایات پر عمل درآمد کرے جو مجلس تحفظ کی طرف سے اسے دی جائیں اور اس طرح ہندوستان کی اصل شکایت کی حیثیت محض ثانوی ہو کر رہ گئی۔

اس کے بعد ۲۲۔جنوری ۱۹۴۸ء کو ہندوستان کی مخالفت کے باوجود مجلس تحفظ نے کثرت رائے سے اس تنازعہ کے ابتدائی عنوان "جموں اور کشمیر کے سوال" کو بدل کر اسے "ہند اور پاکستان کے سوال" کے نام سے موسوم کر دیا اور اس طرح ہند اور پاکستان کو ایک ہی سطح پر لا کھڑا کیا۔ چنانچہ مجلس تحفظ کی اکثریت نے اسی رویہ اور فیصلہ کی بنا پر چند ہفتوں کے بعد سر ظفر اللہ خاں نے مجلس تحفظ میں ایک تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ

"کشمیر کے سوال کو بھی مجلس تحفظ کے روبرو صرف ہندوستان ہی نے نہیں بلکہ ہند اور پاکستان دونوں نے پیش کیا ہے۔[1]"

لیکن ظاہر ہے کہ ہندوستان اس معاملہ میں پاکستان کی مساوی حیثیت کو تسلیم نہیں کر سکتا تھا اور جیسا کہ آئندہ واقعات سے ثابت ہوگا اس مرحلہ پر ہندوستان کو مجلس تحفظ کی اکثریت اور پاکستان کے زاویۂ نظر سے جو اختلاف پیدا ہو گیا تھا وہی اختلاف مجلس اقوام میں اس سوال کے فیصلہ کی راہ میں حائل رہا ہے۔

گذشتہ باب میں یہ بات واضح کی جا چکی ہے کہ ہندوستان نے اس تنازعہ کو طے کرنے کے لئے مجلس تحفظ کے روبرو جو تجاویز پیش کی تھیں ان میں کشمیر کی جنگ کو فوراً ختم کرا دئے جانے کو اوّلین مقصد قرار دیا تھا۔ اس کے برعکس پاکستان استصواب رائے کو بنیادی مقصد قرار دلانا چاہتا تھا چنانچہ اس معاملہ میں بھی مجلس تحفظ کی اکثریت کا رجحان پاکستان ہی کے مطالبہ کی طرف رہا۔ چنانچہ ہند اور پاکستان کی ان تجاویز پر بحث کے

1. S/P. V. 244, 11.2.48. P. 21

دوران ہی برطانوی مندوب مسٹر نوئل بیکر نے لکھا تھا کہ:

"میری رائے میں لڑائی کو ختم کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ جو لوگ لڑائی میں مصروف ہیں انہیں اس بات کا یقین دلایا جائے کہ ایک ایسا مناسب فیصلہ ہو جائے گا جس کے ماتحت ان کے حقوق کا تحفظ ہو سکے گا۔ دوسرے الفاظ میں ..... جب جنگ میں مصروف عناصر اپنے مستقبل کے متعلق مطمئن ہو جائیں گے تب وہ لڑائی سے دست کش ہونے پر رضا مند ہوں گے[1]"

اسی موقع پر بلجیم کے نمائندہ نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ چونکہ جنگ بندی اور استصواب رائے کے سوالات ایک ہی مسئلے کے دو پہلو ہیں اس لئے ان میں کسی ایک کو دوسرے پر مقدم نہیں رکھنا چاہیئے اور اس سلسلہ میں اس نے یہ دو قرار دادیں پیش کی تھیں کہ:-

(۱) مجلس تحفظ اپنی نگرانی میں استصواب رائے عامہ کی تیاری کرائے اور اسے انجام تک پہونچائے

(۲) (مجلس تحفظ کے مقرر کردہ) کمیشن کو ہدایت کی جائے کہ اس کے جو فرائض مقرر کئے گئے ہیں ان میں وہ اقدامات بھی شامل ہیں جن کی بدولت تصادم اور تشدد کے واقعات کے بند ہونے کی صورتیں پیدا ہو سکتی ہوں[2]

اور ان قرار دادوں کی حمایت کرتے ہوئے متحدہ امریکہ کے مندوب نے کہا تھا کہ

کوئی شخص بھی یہ نہیں چاہتا کہ کشمیر پر حملہ کرنے والوں کو وہاں سے نکالنے کے لئے ان سے قوی تر فوج کو وہاں بھیجا جائے[3]

1- S/P. V. 236, 28.1.48, P. 283 2. S/661, S/662, 29.1.48
3-S/P. V. 237, 29.1.48, P. 286

پھر ۴ - فروری ۱۹۴۸ء کو امریکہ ہی کے مندوب مسٹر آسٹن نے مجلس کے روبرو تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ

"لڑائی کے بغیر قبائلیوں کو جموں اور کشمیر سے نکال لینا یا واپسی پر آمادہ کرنا کس طرح ممکن ہو سکتا ہے ؟ اور اگر قبائلیوں کو اس بات کا یقین نہ دلایا جا سکا کہ ایک عبوری حکومت کے ماتحت جو بظاہر بالکل غیر جانبدار ہوگی، غیر جانبداری کے ساتھ استصواب رائے عامہ کرایا جائے گا تو پھر انہیں لڑائی کے بغیر واپسی پر آمادہ کرنا ممکن نہیں ہو سکتا۔[1]

ان تمام حوالوں کے پیش نظر یہ سمجھ لینا کچھ مشکل کام نہیں رہ جاتا کہ کشمیر کے سوال پر بحث و غور کے اس ابتدائی مرحلہ ہی میں نہ صرف ہندوستان کی حقیقی شکایت ہی کو نظر انداز کر دیا گیا تھا اور اسے دوسرے غیر متعلق مسائل کے ساتھ مخلوط کر کے اسے ثانوی درجہ دے دیا گیا تھا بلکہ اس امر کی کوشش بھی کی جاتی رہی تھی کہ پاکستان کے علاوہ قبائلی حملہ آوروں کو بھی اس تنازعہ میں ہندوستان کے مساوی درجہ دے کر انہیں تنازعہ کا ایک فریق تسلیم کر لیا جائے۔

بہر حال پاکستان بلجیم کی ان قراردادوں کو صرف اس لئے منظور کر لینا چاہتا تھا کہ یہ دونوں اس کے مفید مطلب تھیں لیکن ہندوستان انھیں اس بنا پر مسترد کر دینا چاہتا تھا کہ اول تو ان میں جنگ بندی کے متعلق کوئی واضح ہدایت موجود نہیں تھی اور دوسرے ان میں اس کی پیش کردہ تجاویز کو نظر انداز کر دیا گیا تھا۔ چنانچہ اس پر تقریر کرتے ہوئے مسٹر گوپال اسوامی آئنگر نے کہا تھا کہ

"ہم نے فیصلہ کے لئے اپنی جو تجاویز پیش کی تھیں ان میں اس

1. S/P. V. 240, 4.2.48, P. 369

سوال (جنگ بندی) کو مقدم جگہ دی تھی لیکن ہم نے جس کام کے لیے کوشش
کی تھی اسے نظر انداز کر دیا گیا ہے ۔ ہم نے ایک ٹھوس تجویز پیش کی تھی لیکن
اس کی طرف سے آنکھیں بند کر لی گئی ہیں اس کی بجائے مجلس کے روبرو جس
قرارداد کا مسودہ پیش کیا گیا ہے اگر ناگوار نہ گذرے تو میں کہنا چاہتا ہوں[1]
کہ وہ انتہائی حد تک بے معنی ہے ۔"

اس کے بعد انھوں نے اس قرارداد کے مبہم الفاظ پر سخت تنقید کرنے کے بعد دریافت کیا تھا کہ :

"کیا ہم فوری سوال یعنی جنگ بندی کے سوال کو حل کرنے کے قریب پہونچ
رہے ہیں ؟ اور اس وقت جبکہ ہندوستان میں آگ لگی ہوئی ہے کیا ہماری
یہ مہمل باتیں وقت ضائع کرنے کی ایک روشن مثال نہیں ہے[1] ۔"

اور اس کے بعد جب ہندوستان کے مندوب نے یہ درخواست کی کہ اسے دہلی جا کر اپنی حکومت
سے مشورہ کرنے کی مہلت دی جائے اور اس مسئلہ پر بحث کو چند روز کے لئے ملتوی کر دیا جائے
تو اس کی اس درخواست کی بھی مخالفت کی گئی تھی کہ اس واقعہ سے متاثر ہو کر پنڈت جواہر لال نہرو
جیسے حقیقت پسند انسان کو بھی ۱۵ فروری ۱۹۴۸ء کو جموں میں اس خیال کا اظہار کرنا پڑا
تھا کہ :-

"ہمارے پیش کردہ سوالات پر سیدھے سادے طریقہ سے بحث کرنے
اور انھیں اسی طرح سے طے کرنے کی بجائے وہ قومیں جن پر یہ جماعت
(مجلس تحفظ) مشتمل ہے اقتدار پسندانہ سیاست میں گم ہو کر رہ گئی ہیں[2] ۔"

مختصر یہ کہ اس ناسازگار ماحول کے باوجود مسٹر آئنگر مجلس تحفظ کو اپنا نقطۂ نظر سمجھانے میں

---

1. S/P. V. 237, 29.1.48, Pp. 295 296

2. The Times of India, 16.2.48

کامیاب ہو گئے اور اس مسئلہ پر بحث کو دو ہفتوں کے لئے ملتوی کر دیا گیا۔

اس التواکے خاتمہ پر ۱۸۔ مارچ ۱۹۴۸ء کو کشمیر کا سوال دوبارہ مجلس تحفظ کے زیر بحث آیا اور اس موقع پر چین (فارموسا) کے مندوب مسٹر سیانگ نے جو قرارداد پیش کی اس کی بعض خامیوں کے باوجود ہندوستان اسے اس بنا پر منظور کرنے کے لئے رضامند تھا کہ اس میں پاکستان کے مطالبۂ استصواب رائے کے ساتھ ہندوستان کی خواہش جنگ بندی کو بھی مد نظر رکھا گیا تھا۔ اس قرارداد میں

پاکستان سے کہا گیا تھا کہ وہ قبائلیوں کو مزید امداد دینا بند کر دے اور ہندوستان کو اس بات کی اجازت دی گئی تھی کہ وہ لڑائی ختم ہو جانے سے بعد کشمیر کے تحفظ اور وہاں امن اور قانون کو برقرار رکھنے کے لئے اپنی مسلح افواج کے کچھ حصہ کو وہاں رکھ سکتا ہے۔ کشمیر کی موجودہ حکومت سے کہا گیا تھا کہ اسے بڑی بڑی سیاسی جماعتوں کے نمائندوں کو بھی شریک کرنا چاہیئے (اور اس کا مطلب آزاد کشمیر کے نمائندوں کی شرکت تھا) استصواب رائے عامہ کے لیے ایک جداگانہ نظام قائم کرنے کی سفارش کی گئی تھی لیکن اسے رسمی طور پر حکومت کشمیر کا ایک شعبہ قرار دیا گیا تھا۔ یہ تجویز کی گئی تھی کہ اس شعبہ کا نظم ونسق ، اقوام متحدہ کے سکریٹری جنرل کے مقرر کردہ ایک شخص کے ہاتھوں میں رہے گا اور اگرچہ اسے تمام اختیارات حکومت کشمیر کی تفویض کرے گی لیکن وہ اپنے کاموں میں بالکل آزاد رہے گا۔ [1]

لیکن بعض اسباب کی بنا پر یہ قرارداد بھی منظور نہیں ہو سکی اور ایک ماہ بعد ۲۱۔ اپریل ۱۹۴۸ء کو مجلس تحفظ نے جو نئی تجویز منظور کی وہ اس قرارداد کی مسخ شدہ شکل تھی اور اس کی رُو سے

1. S/699. 8.3.48

"مجلسِ تحفّظ کے مقرر کردہ کمیشن کو تین افراد کی بجائے پانچ افراد پر مشتمل کر دیا گیا تھا۔ دو زائد اراکین کے انتخاب کا حق مجلسِ تحفّظ کے لئے مخصوص رکھا گیا تھا۔ یہ بات طے کی گئی تھی کہ جس رکن کے انتخاب کا اختیار ہند اور پاکستان کے منتخب کردہ اراکین کو دیا گیا ہے اگر وہ اس کے انتخاب پر متفق الرائے نہ ہوں تو اسے مجلسِ تحفّظ کا صدر نامزد کر دے۔ کمیشن کو فوراً برصغیر ہند روانہ ہو جانے کی ہدایت کی گئی تھی اور اسے اس بات کی ہدایت بھی کی گئی تھی کہ وہ قیامِ امن اور استصواب رائے کے سلسلہ میں دونوں ملکوں کی حکومتوں کے روبرو اپنی خیر سگالانہ خدمات پیش کرے[1]"

اور اس قرارداد پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے چین کے مندوب نے کہا تھا کہ:

"اس قرارداد میں استصواب رائے عامہ کو محراب کی حیثیت حاصل ہے ... اور اس کا بیشتر حصہ استصواب رائے عامہ کو ایسا مذارانہ اور غیر جانبدارانہ بنانے کے خیال پر مبنی ہے[2]"

مجلسِ تحفّظ کی اس قرارداد کی تشریح کرتے ہوئے مسٹر مائیکل بریچر نے لکھا ہے کہ:

"افواج کی واپسی کے سلسلہ میں مجلسِ تحفّظ نے ہندوستان کے نقطۂ نظر کا خیال رکھا تھا اور پاکستان سے کہا تھا کہ وہ قبائلیوں اور ان پاکستانیوں کو کشمیر سے واپس چلے جانے پر آمادہ کرنے کی کوشش کرے جو کشمیر کے باشندے نہیں ہیں۔ جو لوگ کشمیر میں لڑ رہے ہیں انھیں مدد دینے سے گریز کرے اور

1 S/726, 22.4.48

2. S/P V 284, 17.4.48 ; p. 5.

ریاست میں ان کے داخلہ کو روک دے۔ اس کے برعکس حکومت کشمیر امن اور قانون کو برقرار رکھنے میں مدد دینے کی غرض سے ریاست ہندوستان کو کم از کم فوج رکھنے کی اجازت دی گئی تھی اور باقی ماندہ ہندوستانی فوج کی واپسی کو کمیشن کے مشورہ پر منحصر کر دیا گیا تھا۔ پاکستان کو واضح طور پر اس سے مستثنیٰ کر دیا گیا تھا اور اسے ہدایت کی گئی تھی کہ وہ اپنی افواج کی واپسی کا کام اس وقت شروع کرے جب کمیشن کو ان باتوں کا اطمینان ہو جائے کہ قبائلی واپس جانے لگے ہیں اور جنگ بندی کے انتظامات مؤثر ہو چکے ہیں۔

جمہوری حکومت کے سلسلہ میں ہندوستان کا مطالبہ یہ تھا کہ ذمہ دار حکومت کو بحال رکھا جائے اور پاکستان ایک غیر جانبدار عارضی حکومت کے قیام پر مصر تھا اور اس قرارداد میں ان دونوں نظریوں کو یکجا کرنے کے لئے ہندوستان کو اس بات کا یقین دلانے کی دعوت دی گئی تھی کہ کشمیر کی حکومت وہاں کی بڑی سیاسی جماعتوں (آزاد کشمیر اور نیشنل کانفرنس) کے نمائندوں پر مشتمل ہوگی اور اسی کے ماتحت استصواب رائے کی تیاری اور تکمیل کرائی جائے گی۔

استصواب رائے کے سلسلہ میں پاکستان کا نظریہ یہ تھا کہ اس کے تمام انتظامات کو بین اقوامی کنٹرول میں رہنا چاہیئے۔ اس زاویۂ نظر سے یہ قرارداد واضح طور پر پاکستان کے مطالبہ کی تائید کرتی تھی اور یہ بات استصواب رائے عامہ کے ناظم کے اختیارات کی تشریح اور تفصیل سے اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اس کی "خود مختاری" کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ اگرچہ اس کے تقرر کا اختیار رسمی طور پر حکومت کشمیر کو دیا گیا تھا لیکن اس نامزدگی یا انتخاب کا حقیقی اختیار اقوام متحدہ کے

سکرٹری جنرل ہی کو حاصل تھا۔ پھر اس کا تعلق براہ راست کمیشن کے ساتھ
اور اس کے توسط سے مجلسِ تحفظ کے سامنے رکھا گیا تھا اور اسے اس کے
عملہ کے انتخاب اور تقرر کا اختیار بھی دیا گیا تھا۔ پھر ناظم استصواب رائے
کو اس کے فرائض کی ادائیگی کے سلسلہ میں بھی غیر محدود اختیارات دئے
گئے تھے مثلاً (الف) ریاستی حکومت کو اس امر کا پابند بنایا گیا تھا کہ
وہ ناظم استصواب رائے کو وہ تمام تر اختیارات دے گی جو ناظم استصواب
رائے کے خیال میں استصواب رائے کے لئے ضروری ہوں گے۔ اسے صرف
اسی مقصد سے ریاستی فوج اور پولیس کو ہدایات دینے اور ان کی نگہداشت
کرنے کا اختیار بھی دیا جائے گا (ب) اسے استصواب رائے کرانے
کے لئے جتنی فوج کی ضرورت ہوگی وہ ہندوستان مہیا کرے گا اور (ج)
ریاستی حکومت ایسے تمام مقدمات کی جماعت کے لئے جو غیر جانبدارانہ
استصواب رائے پر اثر انداز ہوسکتے ہیں، ناظم استصواب رائے کو
اسپیشل مجسٹریٹ کی ایک جماعت مہیا کرے گی[1]

اور اس قرارداد پر بحث کے دوران میں مسٹر گوپالا سوامی آئینگر نے ہندوستان کے زاویۂ نظر
کو ان الفاظ میں بیان کیا تھا کہ:۔

"بنیادی خصوصیات کے لحاظ سے اس قرارداد میں مسٹر سیانگ کی
تجویز کی شکل کو بالکل ہی بدل دیا گیا ہے .... اس لئے ہم اس قرارداد
کے ساتھ اتفاق رائے نہیں کرسکتے۔[2]"

---

1. The Struggle for Kashmir. Pp. 82
2. S/P. V. 285. 19 3 48. Pp. 4-5

اور اپنی اس تقریر میں انھوں نے یہ بھی کہا تھا کہ

"ہماری حقیقی شکایت کو اس سرد مہری کے ساتھ نظر انداز کر دئے جانے سے ہمیں، ہماری حکومت اور میری قوم کو سخت صدمہ پہونچا ہے۔ ہندوستان کی شکایت پر بر وقت کوئی قدم اُٹھانے کی بجائے تقریباً چار ماہ تک تو اسے سرد خانہ میں رکھا گیا اور اس چار ماہ کی مدت میں مسلسل خونریزی اور اقتصادی تباہی جاری رہی اور اب اس مدت کے خاتمہ پر ہمیں ایک ایسی قرارداد کو قبول کر لینے کی نصیحت کی جا رہی ہے جس میں ہمارے مقدمہ کے حقائق کو تسلیم کرنے میں خست سے کام لیا گیا ہے اور جس کے الفاظ پاکستان کے اقدامات کے سلسلہ میں مبہم اور غیر واضح ہیں۔ پھر ان الفاظ کی وضاحت کرتے ہوئے تو مجلس تحفظ اور بھی آگے بڑھ گئی ہے اور پاکستان کو اس کا فرض یاد دلاتے ہوئے معذرت خواہی کی حد تک پہونچ گئی ہے۔ اور ہندوستان اپنی عزت کے پیشِ نظر اپنے مقدمہ کے ساتھ اس طرزِ عمل سے اتفاق رائے نہیں کر سکتا۔[1]"

اس موقع پر ہندوستان کے مندوب نے اس قرارداد کی مخالفت ہی پر اکتفا نہیں کیا تھا بلکہ ان دو مفروضات کی تردید بھی کی تھی کہ ہندوستان کے ساتھ کشمیر کا الحاق استصواب کے نتیجہ کے ساتھ مشروط ہے اور یہ کہ کشمیر کے تنازعہ میں ہند اور پاکستان مساوی درجہ کے فریق کی حیثیت رکھتے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے کہا تھا کہ:-

"الحاق بالکل قانونی فیصلہ کی حیثیت رکھتا ہے اور یہ فیصلہ اس صورت میں تو منسوخ ہو سکتا ہے جب استصواب رائے کا نتیجہ پاکستان کے حق میں برآمد ہو۔

1. S/P. V. 285. P. 12

اس لئے پاکستان کو استصواب رائے کے انتظامات میں شرکت کا حق نہیں پہونچتا
مزید براں جنگ بندی کے بعد پوری ریاست کو کشمیر کی آئینی حکومت کے زیر انتظام
آجانا چاہیئے اور چونکہ ہندوستان اپنی تمام تر وحدتوں (ریاستوں) کی مدافعت
کا ذمہ دار ہے اس لئے اسے ریاست کے اس حصہ میں بھی اپنی افواج رکھنے
کا حق حاصل ہے جو فی الحال (نام نہاد) آزاد کشمیر کے زیر انتظام ہے۔[1]"

اور آخر میں انھوں نے کہا تھا کہ :

(الف) موجودہ کشمکش کے دور میں مشترکہ حکومت نظم ونسق کو مفلوج
کردے گی۔ پھر بھی ہندوستان بڑی سیاسی جماعتوں کو حق نمائندگی دینے پر اعتراض
نہیں کرتا لیکن ان کا انتخاب ریاست کے وزیر اعظم کریں گے۔

(ب) ہندوستان کو ریاست میں کم از کم فوج رکھنے کا جو حق دیا گیا ہے
اس کے ماتحت ہندوستانی فوج کی تعداد کو امن اور قانون کو برقرار رکھنے کے لئے
نہیں بلکہ بیرونی حملہ کی مدافعت کے لئے بھی کافی ہونا چاہیئے۔[2]"

اسی سلسلہ میں انہوں نے ناظم استصواب رائے کو وسیع تر اختیارات دئے جانے کی مخالفت
کرتے ہوئے کہا تھا کہ :-

"ناظم استصواب رائے کو، استصواب رائے سے پہلے ہی ریاستی فوج اور
پولیس پر حاکمانہ اختیارات کیوں دے جانے چاہئیں؟ اور اسے پاکستان کے ساتھ
مراسلت کا حق کیوں ملنا چاہیئے؟ ناظم استصواب رائے درحقیقت حکومت کشمیر
کا ایک افسر ہوگا جسے ایک ایسی بیرونی حکومت کے ساتھ براہ راست مراسلت
کا حق دیا جاتا ہے استصواب رائے میں کوئی دخل حاصل نہ ہوگا سیاسی اور انتظامی

1-2. S/P. V. 285, Pp. 13-18

دونوں لحاظ سے غیر مناسب ہے۔"[1]

ان اعتراضات نیز بعض دیگر اسباب کی بنا پر ہندوستان نے اس قرارداد کو مسترد کر دیا تھا، لیکن اس کے ساتھ ہی مسٹر آئنگر نے کہا تھا کہ

"ہماری طرف سے اس قرارداد کو مسترد کر دئے جانے کے باوجود اگر مجلس تحفظ اپنے مجوزہ کمیشن کو بھیجنے کا فیصلہ کرے گی تو ہندوستان اس کے ساتھ بات چیت اور تبادلۂ خیالات کرنے سے گریز نہ کرے گا۔"[2]

دوسری طرف پاکستان بھی شہ پاکر اس قرارداد کو غیر اطمینان بخش کہنے لگا۔ چناں چہ سر ظفر اللہ خاں نے اس قرارداد کے متعلق جو کچھ کہا تھا اس کا خلاصہ یہ ہے کہ — جنوری اور فروری میں اس سوال پر بحث کے دوران میں اراکین مجلس تحفظ کا عام رجحان یہ تھا کہ ریاست کی عارضی حکومت کو قطعاً غیر جانبدار ہونا چاہیئے۔ استصواب رائے تمام فریقوں کو غیر طرفدارانہ معلوم ہونی چاہیئے۔ تمام باقاعدہ اور بے قاعدہ مسلح افواج کو ریاست سے چلا جانا چاہیئے اور افواج کی یہ واپسی ہند اور پاکستان، دونوں ملکوں کے فوجی ہائی کمانڈ کے اشتراک سے عمل میں آنی چاہیئے لیکن ۲۱۔اپریل ۱۹۴۸ء کی اس قرارداد میں ان مذکورہ باتوں میں سے ایک بات بھی موجود نہیں ہے — اور انھوں نے اس قرارداد کے بعض مخصوص حصوں پر تنقید کرتے ہوئے کہا تھا کہ:

مجلس تحفظ نے اس بات کا اعلان کیا تھا کہ قبائلیوں کی واپسی اس شرط کے ساتھ مشروط ہونی چاہیئے کہ انھیں اس بات کا یقین دلایا جائے کہ غیر جانبدارانہ استصواب رائے کرایا جائے گا لیکن اس لحاظ سے یہ قرارداد نشہ ہے۔ پھر اس کام کے لئے ایک مشینری کی موجودگی بھی ضروری ہے۔

---

1 S/P. V. 285. Pp. 13-18 2. S/434, 6.5 48

(اس لئے انھوں نے تجویز کیا تھا کہ) پاکستان کو کشمیر میں فوج اور پولیس رکھنے یا پھر فوج یا پولیس بھیجنے کی اجازت دی جائے۔ (انھوں نے لڑائی ختم کروانے کے لئے ہند اور پاکستان کے درمیان اشتراکِ عمل کی تجویز بھی پیش کی تھی اور کہا تھا کہ) ہندوستانی افواج کو ایک اتفاقِ رائے سے طے شدہ خط سے آگے نہیں بڑھنا چاہیئے۔ عارضی حکومت کے سلسلہ میں انھوں نے کہا تھا کہ یہ قرارداد مبہم ہے۔

اور اس طرح پاکستان نے بھی اس قرارداد کو نامنظور کر دیا تھا۔[1]

بہرحال کشمیر کے متعلق اس مرحلہ پر مجلسِ تحفظ نے ۳۔جون ۱۹۴۸ء کو جو آخری قرارداد منظور کی تھی اس میں کمیشن کو ہدایت کی گئی تھی کہ

"پاکستان کے وزیرِ خارجہ نے اپنے مراسلہ مورخہ ۱۵ جنوری ۱۹۴۸ء میں جو سوالات اٹھائے ہیں وہ جس وقت بھی مناسب سمجھے ان مسائل کا مطالعہ کر کے اپنے مطالعہ کے نتائج سے مجلسِ تحفظ کو مطلع کرے۔"[2]

اس طرح کشمیر کے تنازعہ کے اس ابتدائی مرحلہ کے آخر میں مجلسِ تحفظ نے مذکورہ بالا قرارداد منظور کر کے پاکستان کے اس نظریہ کو تسلیم کر لیا کہ اس کے زیرِ غور صرف کشمیر ہی کا سوال نہیں بلکہ ہند اور پاکستان کے مابین پیدا شدہ تمام تنازعات ہیں۔ ہندوستان کے لئے یہ صورتِ حال ناقابلِ قبول تھی چنانچہ ہندوستان کے وزیرِ اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے اس صورتِ حال کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے مجلسِ تحفظ کو اطلاع دی تھی کہ

"حکومتِ ہند کمیشن کے دائرۂ عمل کو وسیع کر دئے جانے کے خلاف شدید

---

1. S/P.V.285/19.4.48, Pp. 20-47, S/735, 6.5.48

2. S/819. 3.6.48

احتجاج کرتی ہے اور اس بات کو واضح کر دینا چاہتی ہے کہ وہ اس کے ساتھ اتفاق رائے نہیں کرتی[1]"

سطور بالا میں مجلس تحفظ کی جن کارروائیوں کا تذکرہ کیا گیا ہے ان کے مطالعہ سے یہ امور واضح ہو جاتے ہیں کہ وہ ابتدا ہی سے ہندوستان کی بنیادی شکایت کو نظرانداز کرتی رہی تھی اور وہ اسے دوسرے غیر متعلق مسائل کے ساتھ وابستہ کر کے اس کی اہمیت کو کم کر دینا چاہتی تھی حتیٰ کہ مجلس تحفظ کے بعض ممتاز اراکین قبائلی حملہ آوروں کو بھی عملاً ایک مسلمہ فریق کی حیثیت دے دینا چاہتے تھے۔ ہندوستان اس مرحلہ میں بار بار یہ اعلان کرتا رہا تھا کہ اس نے اپنے ساتھ کشمیر کا الحاق منظور کرتے ہوئے اپنے جمہوری مسلک کے ماتحت استصواب رائے عامہ کرانے کی جو رضاکارانہ پیش کش کی تھی وہ اس پر قائم ہے لیکن وہ جنگ بندی کو مقدم سمجھتا ہے مگر پاکستان کا اصرار یہ رہا تھا کہ جب تک استصواب رائے کے متعلق اس کے زاویۂ نظر کے مطابق اطمینان بخش فیصلہ نہ ہو جائے جنگ بندی ممکن نہیں ہو سکتی۔ پھر ہندوستان اس معاملہ میں پاکستان کو اپنے برابر کا فریق تسلیم کرنے کے لئے بھی تیار نہیں تھا اور مجلس تحفظ کے اس غیر حقیقت پسندانہ رویہ اور پاکستان کے غیر معقول اصرار کے خلاف، غیر مبہم الفاظ میں اپنے عدم اتفاق رائے کا اظہار کرتا رہا تھا۔ اسی لئے اس بات پر کوئی تعجب محسوس نہیں کیا جانا چاہیئے کہ اس نے ۲۱۔ اپریل ۱۹۴۸ء اور اس کے بعد ۳ جون ۱۹۴۸ء کی قراردادوں کو نامنظور کر دیا تھا اور وہ اس تحفظ کے ان ابتدائی فیصلوں کی جن خامیوں کو محسوس کرتا تھا وہ لارڈ برڈوڈ کے الفاظ میں یہ تھیں کہ مجلس تحفظ نے ان فیصلوں میں

نہ تو کسی ٹھوس نتیجہ پر پہونچنے کی کوشش کی تھی اور نہ کوئی واضح فیصلہ

---

1. S/825. 7.6.18

صادر کیا تھا۔ ان میں نہ تو ہندوستان کے ساتھ کشمیر کے الحاق کے قانونی پہلو پر کوئی تبصرہ کیا گیا تھا اور نہ پاکستان کو جارحانہ حملے کا مرتکب قرار دے کر اس کی مذمت کی گئی تھی۔[1]

اور ان تمام باتوں کے باوجود چونکہ ہندوستان کشمیر کے تنازعہ کے فیصلہ کا خواہش مند تھا اس لئے نہ صرف اس نے کمیشن کے ساتھ تبادلۂ خیالات کرنے جو پر آمادگی کا اظہار کیا تھا بلکہ وہ (جیسا کہ آئندہ واقعات سے ثابت ہو سکے گا تصفیہ اور مصالحت کے ہر مرحلہ میں پیش پیش رہا تھا۔ لیکن جہاں وہ مصالحت کا خواہش مند تھا وہاں نہ تو اپنے اس قانونی حق سے دست بردار ہو سکتا تھا جو اسے الحاق کے بعد کشمیر پر حاصل تھا اور نہ ان ذمہ داریوں کو نظرانداز کر سکتا تھا جو کشمیر سے متعلق اس پر عائد ہو گئی تھیں۔ چنانچہ وہ اس معاملہ میں مجلس تحفظ کی مداخلت کے ہر دور میں ان ہی دو باتوں کو مدِنظر رکھتا رہا تھا۔

بہرحال مجلسِ تحفظ نے کشمیر کے سوال پر بحث اور کارروائی کے اس ابتدائی مرحلہ میں، ۲۰ جنوری، ۲۱ - اپریل اور ۳ جون ۱۹۴۸ء کو جو قرارداد یں منظور کی تھیں ان کی بنیاد پر "اقوامِ متحدہ کے کمیشن برائے ہند اور پاکستان" کا قیام عمل میں آیا تھا اور ان ہی قراردادوں کی بنا پر اس کے دائرۂ عمل کا تعین کیا گیا تھا۔*

---

1. Two Nations & Kashmir, P. 91

* اقوامِ متحدہ کے اس کمیشن کا سرکاری نام "اقوامِ متحدہ کا کمیشن برائے ہند اور پاکستان۔"
United Nations Commission for India & Pakistan

اور مختصر نام انسپ (Uncip) تھا لیکن اس کتاب میں اس کا ذکر صرف کمیشن کے نام سے کیا گیا ہے۔

نواں باب

کمیشن کی سرگرمیاں اور جنگ بندی

مجلسِ تحفظ نے ۲۰ جنوری ۱۹۴۸ء کو کمیشن کے تقرر کا فیصلہ کیا تھا اور ہندوستان نے اس کے لئے ۱۰ فروری ۱۹۴۸ء کو چیکوسلاواکیہ کو اپنا نمائندہ منتخب کرلینے کا اعلان کر دیا تھا لیکن مئی ۱۹۴۸ء کے دوسرے ہفتہ سے پہلے یہ کمیشن اپنا کام شروع نہیں کر سکا۔ اس مدت میں ایک جانب تو اس کے اراکین کی تعداد کو بڑھا دیا گیا تھا اور دوسری طرف اس کے دائرۂ عمل کو وسیع تر کر دیا گیا تھا۔ چناں چہ ۲۱ اپریل کی قرارداد کے مطابق ۲۳ اپریل ۱۹۴۸ء کو مجلسِ تحفظ نے اس کے لئے بلجیم اور کولمبیا کو کمیشن کا رکن مقرر کیا اور ۶ مئی کو پاکستان نے اپنی طرف سے ارجنٹائن کے تقرر کا اعلان کیا اور چوں کہ ہند اور پاکستان دونوں ۲۱ اپریل کی قرارداد کو مسترد کر چکے تھے اس لئے ۷ مئی ۱۹۴۸ء کو مجلسِ تحفظ کے صدر نے متحدہ امریکہ کو کمیشن کا پانچواں رکن مقرر کر دیا۔[1]

---

[1] کمیشن جن ممالک پر مشتمل تھا ان کے نمائندوں کے نام حسب ذیل ہیں:-

ارجنٹائن	ریکارڈو جے سری	Ricardo-J-Siri

کمیشن کی تکمیل کے بعد، اس کے ابتدائی تین ہفتے جنیوا میں بسر ہوئے۔ اس مدت میں ایک طرف تو اس نے اپنی سرگرمیوں کا طریق کار اور کام کے ضوابط مرتب کئے اور دوسری طرف حالات پر زیادہ سے زیادہ عبور حاصل کرنے کے لئے ہند اور پاکستان کی حکومتوں کے ساتھ خط و کتابت کرتا رہا اور اس طرح ۵۔ جولائی ۱۹۴۸ء کو جنیوا سے برصغیر ہند کے لئے روانہ ہوا۔

کمیشن کے تقرر میں اس تاخیر کی بدولت کشمیر کے مسئلہ میں جو مزید پیچیدگیاں پیدا ہو گئی تھیں، مسٹر جوزف کاربیل نے ان کی طرف اشارا کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

"ماضی کے پیشِ نظر یہ امر بے حد افسوسناک ہے کہ ایک ایسے کمیشن کو جس کے تقرر پر اتفاق رائے ہو چکا تھا بلا تاخیر مقرر کر کے برصغیر ہند نہیں بھیجا گیا۔ اگر یہ کمیشن لڑائی کو بند نہ بھی کرا سکتا تو کشمیر میں اس کی موجودگی ہی موسم بہار کی لڑائی اور وسیع پیمانہ پر فوجی اقدامات کو تو ضرور ہی مسدود کر دیتی۔ لیکن ایسا نہیں کیا گیا اور اقوامِ متحدہ کی یادداشتوں سے اس فروگذاشت کا کوئی سبب بھی معلوم نہیں ہوتا۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اب زیادہ قوت کے ساتھ تصادم شروع ہو گیا ہے[1]"۔

(فٹ نوٹ گزشتہ صفحہ سے آگے)

بلجیم	واڈی کرچوے	VADE-Kerchove
چیکوسلاواکیہ	جوزف کاربیل	Joseph Korbel
کولمبیا	الفریڈو لوزانو	Alfredo Loyantl
متحدہ امریکہ	جے کلر ہڈل	J Klahr Huddle

1 • Danger in Kashmir, Chapter 5.T 104 ۱

مسٹر کابیل نے مذکورہ بالا سطور میں جس خوفناک تصادم کا ذکر کیا ہے اس کا پس منظر یہ ہے کہ خود پاکستان کے اعتراف کے مطابق اس مدت میں اس کی باقاعدہ افواج بھی کشمیر میں داخل ہو چکی تھیں اور اگرچہ ہندوستان پہلے ہی دن سے اس حقیقت سے باخبر تھا کہ پاکستان کی باقاعدہ افواج کشمیر کی لڑائی میں باقاعدہ طور پر حصہ لے رہی ہیں۔ چناں چہ ۷ ستمبر ۱۹۴۸ء کو مجلس آئین ساز کے دستور ساز اجلاس میں ہندوستان کے وزیر اعظم نے کمیشن کی سرگرمیوں کی پہلی یادداشت پر بیان دیتے ہوئے کہا تھا کہ:

"جہاں تک دنیا کا تعلق ہے کل شام کے چار بجے تک پاکستان اس کے سامنے اس بات سے انکار کرتا رہا تھا کہ کشمیر کے فوجی تصادم کے ساتھ کسی طرح بھی اس کا کوئی تعلق ہے۔ لیکن ہم جانتے تھے اس سلسلے میں نہایت واضح اور پختہ شہادت موجود تھی اور حقیقت تو یہ ہے کہ بڑی بڑی فوجوں کی نقل و حرکت کو پوشیدہ نہیں رکھا جا سکتا[1]"

لیکن اگر اس بات کو فرض بھی کر لیا جائے کہ کشمیر پر جارحانہ حملہ کے شروع ہی سے پاکستان کی باقاعدہ افواج اس میں حصہ نہیں لے رہی تھیں اور پاکستان کے اعتراف کے مطابق مئی ۱۹۴۸ء میں پاکستانی افواج کے تین ڈویژن کشمیر میں بھیجے گئے تھے تو یہ بات تسلیم کرنی پڑتی ہے کہ اگر مجلس تحفظ ۲۰ جنوری ۱۹۴۸ء کو کمیشن کے تقرر کی وہ قرارداد منظور کرنے کے بعد ہی اس کمیشن کو مقرر کر کے اسے برصغیر ہند روانہ کر دیتی تو پاکستان کو مئی میں اپنی باقاعدہ افواج کو کشمیر بھیجنے کا موقع نہ مل سکتا اور مجلس کے روبرو آج تک ان غیر ملکی افواج کو ہندوستان کی سرزمین سے واپس کرانے کی راہ میں جو مشکلات حائل ہیں وہ پیش نہ آتیں۔

---

1. Kashmir 1947-1950 P. 17

بہر حال ۷- جولائی ۱۹۴۸ء کو کراچی پہونچنے کے بعد کمیشن کو، پاکستان کے وزیر خارجہ نے پہلی ہی ملاقات میں جو اطلاع دی تھی وہ یہ تھی کہ

"اس وقت کشمیر میں پاکستانی افواج کے تین باقاعدہ ڈویژن موجود ہیں اور ان ڈویژنوں کو مئی ۱۹۴۸ء کے نصف اول میں وہاں بھیجا گیا تھا۔[1]"

اور پھر ۹- اگست ۱۹۴۸ء کو پاکستان نے اس بات کا اعتراف کیا کہ فی الحال "آزاد کشمیر" فوج کی قیادت بھی پاکستانی فوج ہی کر رہی ہے- اور ان انکشافات کے بعد مجلس تحفّظ کا پورا پورا احترام مدّنظر رکھنے کے باوجود یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ کشمیر کے سوال پر غور و بحث کے ابتدائی مرحلہ میں اس نے ہندوستان کی بنیادی شکایت کو ثانوی حیثیت دے کر جو فیصلے کئے تھے وہ اپنی جگہ حقائق پر مبنی اور اصل مسئلہ کا صحیح حل پیش نہیں کرتے تھے۔

لارڈ برڈ وڈ نے مجلس تحفّظ کے ان فیصلوں کی صحت اور اجابت کو ثابت کرنے کے لئے لکھا ہے کہ

مجلس تحفّظ نے یہ فیصلے اقوام متحدہ کے منشور کے چھٹے* باب کے پیش نظر کئے تھے۔ اس لئے مجلس صرف یہ کہہ سکتی تھی کہ 'یہ کرنا چاہیئے' اور اسی لئے اس کی سفارشات مخلصانہ توقعات ہی کی حیثیت رکھتی تھیں اور ان کی کامیابی کا انحصار فریقین کی رضامندی ہی پر تھا۔[2]"

لیکن کیا پاکستان کے مذکورہ بالا اعتراف کے بعد یہ بات واضح نہیں ہو گئی تھی کہ ہندوستان کی

---

* اقوام متحدہ کے منشور کا چھٹا باب ۶ دفعات (۳۳-۳۸) پر مشتمل ہے اور ان دفعات میں متنازعہ فیہ مسائل کو پُر امن طریقوں پر طے کرنے اور انہیں طے کرانے کے سلسلہ میں مجلس تحفّظ کے اقدامات اور اختیارات کی وضاحت کی گئی ہے۔

1. S/1100, Para 40
2. Two Nations and Kashmir P. 92

سرزمین پر پاکستان کی باقاعدہ افواج موجود ہی نہیں بلکہ جارحانہ جنگ میں معروف بھی ہیں اور اگر پاکستان کے اس اعتراف کو درست بھی فرض کر لیا جائے کہ یہ باقاعدہ افواج وسط مئی ۱۹۴۸ء میں وہاں بھیجی گئی تھیں تو کیا اس نے مجلس تحفظ کی ۱۷ جنوری ۱۹۴۸ء کی قرارداد کی کھلی ہوئی خلاف ورزی نہیں کی تھی ؟ اور ان حقائق کی روشنی میں کیا مجلسِ تحفظ کو پاکستان کے جارحانہ حملہ آور ہونے کا اعتراف اور اعلان نہیں کر دینا چاہیئے تھا ؟

پاکستان کے مذکورہ بالا اعتراف کے بعد ہندوستان مجلسِ تحفظ سے جو کچھ چاہتا تھا وہ اس کے وزیر اعظم پنڈت نہرو کے الفاظ میں یہ تھا کہ

> اس سلسلہ میں پاکستان کی مذمت کی جانی چاہیئے۔ میں پاکستان کے خلاف کوئی باقاعدہ اور بہت ہی سنجیدہ فیصلہ کرانا نہیں چاہتا لیکن ایک ایسا اعلان ضرور کرانا چاہتا ہوں جس میں کشمیر میں پاکستانی افواج کی موجودگی کا اعتراف ہو اور ان کی واپسی کا مطالبہ کیا جائے[1]

لیکن واقعہ یہ ہے کہ مجلس تحفظ نے ہندوستان کے اس معتدل مطالبہ پر بھی کوئی توجہ مبذول نہیں کی۔ چناں چہ لارڈ برڈ ووڈ نے بھی مجلس تحفظ کی اس کوتاہی کا اعتراف کرنے کے بعد، مندرجہ ذیل الفاظ میں اس کی تاویل کی ہے کہ

> یہ بات تعجب خیز معلوم ہوتی ہے کہ اس مرحلہ پر بھی جب کہ کمیشن کے پاس سر ظفر اللہ خاں کا یہ اعتراف موجود تھا کہ کشمیر میں باقاعدہ پاکستانی فوجوں کا استعمال کیا گیا ہے، عوام حقیقت حال سے بالکل ناواقف تھے۔ یہ بات قابلِ غور ہے کہ اگر اس مرحلہ پر کمیشن کی طرف سے حقائق پر مشتمل کوئی بیان شائع کیا جاتا اور اس کے ساتھ مجلس تحفظ کی جانب سے محتاط الفاظ میں پاکستان کو ملامت کر دی

---

1. Danger in Kashmir, Chapter 6, P. 129

جاتی تو کیا اس سے اسے ہندوستان کا اشتراکِ عمل حاصل نہ ہو جاتا۔ لیکن اندیشہ یہ تھا کہ اس صورت میں وہ پاکستان کے تعاون سے محروم ہو جاتی۔[1]

اور لارڈ برڈ ووڈ کے ان الفاظ پر جن میں حقیقت کی جھلک پائی جاتی ہے کسی قسم کا تبصرہ کئے بغیر یہ کہنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مجلس تحفظ کی یہی وہ کمزوری تھی جس نے اُسے حقائق کے اعتراف سے باز رکھا تھا اور اسی کمزوری نے تصفیہ کے سنگِ بنیاد کو اتنا ٹیڑھا بنا دیا تھا جس پر کوئی تعمیر ممکن ہی نہیں ہو سکتی تھی۔ اس کے باوجود اور ۲۱۔ اپریل نیز ۳ جون ۱۹۴۸ء کی قراردادوں کو منسوخ کر دینے کے بعد بھی جیسا کہ آئندہ صفحات کے مطالعہ سے معلوم ہوگا ہندوستان اپنے بنیادی موقف سے ہٹے بغیر تصفیہ کی راہ پر اقوامِ متحدہ کے ہر اقدام میں اس کے ساتھ تعاون اور اشتراکِ عمل کرتا رہا۔

اقوامِ متحدہ کا کمیشن برصغیر ہند میں چھ ہفتہ مقیم رہنے کے بعد ۲۱ ستمبر ۱۹۴۸ء کو مجلسِ تحفظ کے لئے اپنی رپورٹ تیار کرنے کی غرض سے جنیوا واپس چلا گیا تھا۔ لیکن برصغیر ہند میں اپنے قیام کے پہلے ایک ماہ کے دوران میں، ہند اور پاکستان کی حکومتوں کے نمائندوں سے تبادلۂ خیالات کرنے کے بعد اپنے مطالعہ اور مشاہدہ کی روشنی میں جن نتائج پر پہونچا تھا ان کے پیشِ نظر اس نے ۱۳۔ اگست ۱۹۴۸ء کو جو قرارداد منظور کی تھی وہ یہ ہے کہ

> اقوامِ متحدہ کا کمیشن برائے ہند اور پاکستان، ریاست جموں و کشمیر کی صورت حال کے متعلق ہند اور پاکستان کے نمائندوں کے زاویہ ہائے نظر پر اچھی طرح غور کرنے کے بعد اور اپنے اس خیال کی بنا پر کہ وہ ہند اور پاکستان کی حکومتوں کو اس صورت حال کے مستقل تصفیہ میں جو امداد دینا چاہتا ہے اس کی کامیابی کے لئے اس کے (کمیشن کے) فیصلوں کے نفاذ نیز بین اقوامی امن اور سلامتی کو خطرہ سے بچانے کے لئے فوری جنگ بندی اور ان مخدوش حالات

---

[1] Two Nations and Kashmir, P. 94

کی اصلاح ضروری ہے۔

(کمیشن نے) اس بات کا فیصلہ کیا ہے کہ وہ ہند اور پاکستان کی حکومتوں کو بیک وقت

(اپنی) مندرجہ ذیل تجاویز ارسال کرے:

حصّہ اول

جنگ بندی کا حکم

(الف) ہند اور پاکستان کی حکومتیں اس امر پہ اتفاق رائے کرتی ہیں کہ

دونوں حکومتوں کے (فوجی) ہائی کمانڈ بیک وقت لیکن علیحدہ علیحدہ جنگ بندی

کا حکم جاری کریں گے۔ یہ حکم ان افواج پر نافذ ہوگا جو ان کی کمان میں، ریاست

جموں اور کشمیر میں موجود ہیں (اور یہ حکم) جلد از جلد کسی ایسی قابل عمل تاریخ

کو جاری کر دیا جائے گا جو ان تجاویز کو قبول کر لینے کے بعد چار روز کے اندر دونوں

حکومتیں باہم اتفاق رائے سے طے کریں گی۔

(ب) ہند اور پاکستانی افواج کے 'ہائی کمانڈ' اس بات پہ اتفاق رائے کرتے

ہیں کہ وہ ہر ایسا قدم اٹھانے سے احتراز کریں گے جس سے ریاست جموں اور کشمیر

میں ان کی زیر کمان افواج کی فوجی قوتوں کو مزید تقویت پہنچنے کا امکان ہو۔

(ان تجاویز کے سلسلہ میں دونوں ملکوں کے 'ہائی کمانڈز' کی ماتحت افواج

میں ان تمام افواج کو بھی شامل سمجھا جائے گا جو منظم یا غیر منظم طور پر

فریقین کی طرف سے لڑائی یا اس تصادم میں حصہ لے رہی ہیں)

(ج) ہند اور پاکستان کی افواج کے سپہ سالار اعظم فوراً ایک دوسرے سے

ملیں گے۔ موجودہ فوجی ترتیب کے سلسلہ میں ایسی مقامی تبدیلیوں کے متعلق باہم مشورہ

کریں گے جنھیں جنگ بندی میں آسانیاں پیدا کرنے کے لئے ضروری سمجھا جائے گا۔

(د) کمیشن اپنی طرف سے اور جہاں بھی مناسب خیال کرے گا، فوجی مشاہدین کا تقرر کرے گا اور یہ مشاہدین کمیشن کے ماتحت رہتے ہوئے دونوں ملکوں کے فوجی ہائی کمانڈز کے اشتراکِ عمل سے جنگ بندی کے حکم پر عمل درآمد کی نگہداشت کریں گے۔

(ہ) حکومت ہند اور حکومت پاکستان اس بات پر اتفاق رائے کا اظہار کرتی ہیں کہ وہ مزید گفت و شنید کے لئے سازگار ماحول پیدا کرنے اور اسے برقرار رکھنے میں امداد دینے کے لئے اپنے اپنے شہریوں سے اپیل کریں گی۔

حصہ دوم

عارضی صلح نامہ

حصہ اول میں بیان کردہ فوری جنگ بندی کی تجاویز کو قبول کر لینے کے ساتھ ساتھ دونوں ملکوں کی حکومتیں عارضی صلح نامہ کی بنیاد کے طور پر مندرجہ ذیل اصول کو بھی منظور کرتی ہیں۔ اس عارضی صلحنامہ کی تفصیلات، دونوں ملکوں کے نمائندوں اور کمیشن کے درمیان گفت و شنید کے بعد طے کر لی جائیں گی۔

(الف)

(۱) چونکہ ریاست جموں اور کشمیر کے علاقہ میں پاکستانی افواج کی موجودگی، اس وقت کے بعد سے جب کہ حکومت ہند نے اس معاملہ کو مجلسِ تحفظ میں پیش کیا تھا، ایک بنیادی اور اہم تبدیلی کی حیثیت رکھتی ہے اس لئے پاکستان ریاست سے اپنی افواج کو واپس بلا لینے پر رضامند ہے۔

(۲) حکومت پاکستان، قبائلیوں اور پاکستان کے ان شہریوں کو جو معمولاً ریاست جموں اور کشمیر میں نہیں رہتے اور جو صرف لڑائی کے مقصد سے ریاست میں داخل

ہوئے ہیں وہاں سے واپس کرانے اور واپس بلانے کے لئے ہر ممکن کوشش کرے گی۔

(۳) معاملہ کے قطعی فیصلہ سے پہلے اُس علاقہ کا انتظام جسے پاکستانی افواج خالی کریں گی، کمیشن کی نگرانی میں مقامی حکام انجام دیں گے۔

(ب)

(۱) جب کمیشن، حکومت ہند کو اس بات کی اطلاع دے گا کہ (اس قرارداد کے، حصہ ۲۔ الف کی دفعہ ۲ میں جن قبائلیوں اور پاکستانی شہریوں کا حوالہ دیا گیا ہے وہ واپس جا چکے ہیں اور وہ صورت حال ختم ہو گئی ہے جس کی بنا پر ہندوستان نے مجلسِ تحفظ کے روبرو، ریاست جموں اور کشمیر میں ہندوستانی افواج کی موجودگی کو ضروری بتایا تھا نیز یہ کہ پاکستانی افواج نے ریاست جموں اور کشمیر سے واپسی شروع کر دی ہے تو حکومت ہند اس امر پر رضامندی کا اظہار کرتی ہے کہ وہ بھی کمیشن سے مشورہ کرنے کے بعد بتدریج اپنی بیشتر افواج جموں اور کشمیر سے واپس بلانا شروع کر دے گی۔

(۲) ریاست جموں اور کشمیر کی موجودہ صورت حال کا قطعی فیصلہ ہونے سے پہلے حکومت ہند جنگ بندی کے وقت طے ہو جانے والی لائنوں کے اندر، مقامی حکام کو نظم اور قانون بحال رکھنے میں مدد دینے کے لئے کمیشن کے اتفاق رائے سے اپنی کم سے کم فوج کو رکھ سکے گی۔ کمیشن جہاں بھی ضروری سمجھے گا اپنے مشاہدین کو متعین کرے گا۔

(۳) حکومت ہند اس بات کی یقین دہانی کی ذمہ داری لے گی کہ ریاست جموں اور کشمیر کی حکومت، عوام کے روبرو اس امر کو واضح کرنے کی غرض سے کہ امن، قانون

اور نظم و نسق کی حفاظت کی جائے گی اور تمام انسانی اور سیاسی حقوق کی ضمانت دی جائے گی ، اپنے تمام تر امکانی وسائل کو استعمال کرے گی ۔

(ج)

ایک دستخط شدہ اعلان کے ذریعے سے عارضی صلحنامہ کا پورا متن یا ایک کمیونک کے ذریعے سے وہ اصول جن پر دونوں حکومتوں اور کمیشن کے درمیان اتفاق رائے ہو چکا ہے عوام کی واقفیت کے لئے شائع کرد‎ئے جائیں گے ۔

حصہ سوم

حکومت ہند اور حکومت پاکستان (دونوں) اپنی اس خواہش کی مزید توثیق کرتی ہیں کہ ریاست جموں اور کشمیر کا مستقبل عوام (باشندگانِ کشمیر) کی مرضی کے مطابق طے کیا جائے گا اور اس مقصد کے پیشِ نظر ، عارضی صلحنامہ کو منظور کر لینے کے بعد ، دونوں حکومتیں ، ایسے خوشگوار اور سازگار حالات پیدا کرنے کی غرض سے جو آزادانہ اظہارِ خیال کی یقین دہانی کرا سکیں ، کمیشن کے ساتھ تبادلۂ خیالات کے لئے تیار ہیں ۔[1]

اس قرارداد کا تجزیہ کرنے کے بعد جو نکات واضح ہوتے ہیں وہ یہ ہیں کہ اس کے مطابق — (۱) پاکستان کی تمام افواج ، قبائیلوں اور پاکستانی شہریوں کو ریاست جموں اور کشمیر سے واپس چلا آنا چاہیئے تھا اور ہندوستان کی افواج کو مناسب تعداد میں وہاں مقیم رہنا چاہیئے تھا (۲) ہندوستانی افواج کی واپسی صرف اسی وقت شروع ہونی چاہیئے تھی جب کمیشن حکومت ہند کو اس بات کی اطلاع دیتا کہ قبائلی اور پاکستانی شہری ریاست سے جا چکے ہیں اور پاکستانی افواج کی واپسی شروع ہو گئی ہے ۔ پھر اسی قدر نہیں بلکہ ہندوستانی

1 S/995, 13.9.48, Pp. 3 5

افواج کی واپسی بتدریج اور پاکستان کے اتفاق رائے سے نہیں بلکہ کمیشن کی رضامندی سے عمل میں آتی ۔ اور (۳) ہندوستانی افواج اتنی تعداد میں وہاں ضرور رہتیں جو کمیشن کے خیال کے مطابق ریاست میں امن، قانون اور انتظام کو برقرار رکھنے کے لئے ضروری ہوتیں ۔ اور ان نکات کے پیش نظر اس کے علاوہ اور کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوسکتا کہ کمیشن نے بالواسطہ طریقہ پر اس بات کو تسلیم کرلیا تھا کہ ہندوستان کے ساتھ کشمیر کے الحاق کے بعد قانونی طور پر ہندوستان کو اس ریاست میں جو حقوق حاصل ہیں پاکستان کو وہ حقوق حاصل نہیں ہیں ۔ اس کے باوجود معاملہ کی اہمیت کے پیش نظر اس قرارداد کو منظور کرتے ہوئے ہندوستان کے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے کمیشن کو جو مراسلہ ارسال کیا تھا وہ اس قرارداد کے سلسلہ میں حکومت ہند کے زاویۂ نظر کو اچھی طرح واضح کرتا ہے ۔

یہ مراسلہ نئی دہلی سے ۲۰۔ اگست ۱۹۴۸ء کو روانہ کیا گیا تھا اور اس کا متن یہ ہے کہ

۱۷۔ اگست کو میں نے اور میرے ساتھی وزیر بے قلمدان نے آپ اور کمیشن کے دوسرے اراکین کے ساتھ جو اس وقت دہلی میں ہیں، اس قرارداد پر تبادلۂ خیالات کیا تھا جو آپ نے ۱۴۔ اگست کو ہمارے حوالہ کیا تھا۔

۱۸۔ اگست کو ہمارے درمیان دوبارہ تبادلۂ خیالات ہوا جس کے دوران میں میں نے ان شکوک اور مشکلات کو واضح کرنے کی کوشش کی تھی جو میری حکومت کے اراکین اور حکومت کشمیر کے نمایندوں نے جن کے ساتھ ہم نے مشورہ کیا تھا، کمیشن کی تجاویز کا ابتدائی لیکن بغور مطالعہ کرنے کے بعد محسوس کی ہیں۔

(۲) کمیشن جب پہلی بار دہلی آیا تھا تو اس وقت اس کے ساتھ مختلف موقعوں پر گفتگو کے دوران میں ہم نے اس کے سامنے اس بنیادی حقیقت کو پیش کیا تھا جس کی بدولت ہمارے خیال کے مطابق کشمیر کا موجودہ تصادم برپا ہوا ہے

یہ حقیقت مملکتِ ہند پر کشمیر میں پہلے تو پاکستان کا بالواسطہ اور اس کے بعد براہِ راست بلاوجہ جارحانہ حملہ ہے (اور) اگرچہ یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت تھی لیکن پاکستان کی حکومت اس سے انکار کرتی رہی۔ گذشتہ مہینوں میں باقاعدہ پاکستانی افواج کی ایک بہت بڑی تعداد پھر ہندیونین کے علاقہ کشمیر میں داخل ہوئی اور اس نے اس ہندوستانی فوج کا مقابلہ کیا جو ریاست کے دفاع کے لیے وہاں بھیجی گئی تھی اور اب ہمیں معلوم ہے کہ حکومت پاکستان نے اس کا (کشمیر میں اپنی باقاعدہ افواج کی موجودگی کا) اعتراف بھی کر لیا ہے۔ اس کے باوجود حکومت پاکستان نے، ہندوستان کی حکومت کو کسی موقع پر بھی اپنی اس جارحانہ پیش قدمی کی اطلاع نہیں دی (اور) حقیقت یہ ہے کہ اس سے ہمیشہ انکار ہی کیا جاتا رہا ہے اور حکومت کے بار بار دریافت کرتے رہنے کے باوجود پاکستان جواب دینے سے گریز کرتا رہا ہے

مجلس تحفظ کی قرارداد مورخہ ۱۷۔ جنوری ۱۹۴۸ء کے مطابق، ایسی صورت میں کہ یہ معاملہ مجلس کے زیرِ غور تھا، حکومت پاکستان کو صورتِ حال میں پیدا ہونے والی کسی اہم بنیادی تبدیلی کی اطلاع فوراً ہی مجلس تحفظ کو دینی چاہیئے تھی۔ پاکستان کی باقاعدہ افواج کا بہت بڑی تعداد میں ریاست (جموں اور کشمیر) پر جارحانہ پیش قدمی کرنا صورتِ حال میں ایک اہم بنیادی تبدیلی کی حیثیت رکھتا تھا لیکن جہاں تک ہمیں معلوم ہے اب تک بھی مجلس تحفظ کو اس کی کوئی اطلاع نہیں دی گئی۔

کمیشن اندازہ کر سکتا ہے کہ حکومت پاکستان کا یہ طرزِ عمل اخلاق کے تمام ضابطوں ہی کے منافی نہیں ہے بلکہ بین اقوامی قانون اور دستور۔

کے خلاف بھی ہے اور اس کی بدولت حالات میں بہت ہی زیادہ پیچیدگی بھی پیدا ہوگئی ہے۔ میری حکومت کی واحد مخلصانہ خواہش یہ ہے کہ تنازعہ کے امکانات کو جس قدر بھی ممکن ہو سکے مسدود اور امن کو بحال کیا جائے اور ریاست جموں اور کشمیر میں پاکستانی افواج کی اس مزید مداخلت نے جو نئی صورت حال پیدا کر دی ہے، ہماری اسی خواہش نے ہمیں اس کا مقابلہ کرنے کے لئے کوئی قدم اٹھانے سے باز رکھا ہے (اور) ہندوستان میں کمیشن کی موجودگی کی بدولت، قدرتی طور پر ہمیں یہ توقع پیدا ہوگئی ہے کہ وہ جو تدبیر بھی اختیار کرے گا وہ موجودہ صورت حال سے عہدہ برآ ہونے کے لئے مؤثر ثابت ہو سکے گی اور اس کی بدولت جارحانہ حملے کا اعادہ نہ ہو سکے گا۔

(۳) ۱۸۔ اگست کی ملاقات کے بعد، ہم نے کمیشن کی قرارداد پر پوری توجہ کے ساتھ غور کیا ہے اس کے بہت سے حصے ایسے ہیں جو اگر مختلف اور صورت حال کے بنیادی حقائق کے زیادہ مطابق اور خصوصاً ہندیونین کے علاقہ پر پاکستان کے کھلے ہوئے جارحانہ حملے کے سلسلے میں زیادہ واضح ہوتے تو بہتر ہوتا۔ پھر بھی ہم تسلیم کرتے ہیں کہ اگر مزید خونریزی کے بغیر کشمیر کے مسئلہ کو حل کرنے کی غرض سے اطمینان بخش حالات پیدا کرنے کے لئے کوئی کامیاب کوشش کی جائے تو فی الحال ہمیں چند ضروری امور پر اپنی توجہات کو مرکوز کر کے ان ہی کے متعلق تحفظات حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے اور اسی بنا پر میں نے آپ کی خدمت میں مذکورہ ذیل امور پیش کئے تھے کہ

(۱) اس قرارداد کے حصہ دوم کے پیرا الف، فقرہ ۳ کی نہ تو اس طرح وضاحت کی جائے اور نہ اس پر اس طرح عمل کیا جائے جس سے

(الف) ریاست جموں اور کشمیر کے اس حصہ پر جو پاکستانی فوجیں خالی کریں گی حکومت جموں اور کشمیر کے حق حکومت و ملکیت پر کوئی اعتراض وارد ہو سکے۔

(ب) برائے نام آزاد کشمیر کی حکومت کو تسلیم کرنے کا کوئی پہلو نکل سکے یا

(ج) عارضی صلح کے دوران میں اس علاقہ کو اس طرح مستحکم کیا جا سکے جو ریاست کے لئے نقصان رساں ثابت ہو۔

(۲) ہمارے زاویۂ نظر سے (۱ ایسے) بیرونی جارحانہ حملے سے تحفظ کی یقین دہانی جس کی بدولت ریاست پچھلے دس مہینوں میں بہت زیادہ نقصان اُٹھا چکی ہے بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہے اور داخلی امن اور قانون کو برقرار رکھنے کی ضرورت سے کسی طرح بھی کم اہمیت نہیں رکھتی اس لئے کشمیر سے ہندوستانی فوج کی واپسی اور وہاں باقی رہنے والی ہندوستانی افواج کی تعداد کے سوال کو اس اہم اور نمایاں عنصر پر مبنی ہونا چاہیئے (اور) کشمیر میں جو ہندوستانی افواج مقیم رہیں ان کی تعداد ہر وقت اتنی ہونا چاہیئے کہ وہ داخلی بدامنی کے خلاف مؤثر ضمانت ثابت ہونے کے ساتھ ہر قسم کے بیرونی حملوں کی مدافعت کی یقین دہانی کے لئے کافی ہو سکیں۔

(۳) جہاں تک حصہ سوم کا تعلق ہے اگر یہ بات طے کی جائے کہ ریاست کے مستقبل کے سوال کو استصواب رائے عامہ کے ذریعے سے طے کیا جائے گا تو پاکستان کو نہ تو استصواب رائے کی تنظیم اور رائے شماری

میں حصہ لینے کا کوئی حق ہوگا اور نہ وہ ریاست کے اندرونی انتظام میں کوئی مداخلت کرے گا۔

(۴) اگر میں آپ کے مفہوم کو غلط نہیں سمجھتا تو قرارداد کے حصہ دوم، الف کی دفعہ ۳ سے کوئی ایسی صورت حال پیدا نہیں ہوتی میں پیدا ہم نے: پہلے اس مراسلہ کے پیرا ۳ (۱) میں اعتراض کیا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ آپ نے اس بات کو واضح کر دیا ہے کہ کمیشن (پاکستانی افواج کے) خالی کئے ہوئے علاقوں پر حکومت جموں اور کشمیر کے علاوہ کسی اور کا حق حکومت تسلیم کرنے کا مجاز ہی نہیں ہے۔

جہاں تک پیراگراف ۳ (۲) کا تعلق ہے کمیشن نے تحفظ کی اشد ترین ضرورت کو تسلیم کر لیا ہے اور وہ وقت جبکہ ریاست سے ہندوستانی افواج کی واپسی شروع ہوگی وہ مدارج جن کے مطابق یہ واپسی عمل میں آئے گی اور ریاست میں مقیم رہنے والی ہندوستانی افواج کی تعداد ایسے معاملات، حکومت ہند اور کمیشن کے درمیان طے ہوں گے۔

سب سے آخر میں آپ نے اس بات سے اتفاق رائے کر لیا ہے کہ قرارداد کے حصہ سوم میں اس کی موجودہ ترتیب کے اعتبار سے کسی طرح بھی یہ بات تسلیم نہیں کی گئی ہے کہ پاکستان کو استصواب رائے عامہ میں کسی طرح کا دخل بھی حاصل ہوگا۔

(۵) اس وضاحت کے پیش نظر، میری حکومت نے امن کے مقصد کو تقویت دینے کی مخلصانہ خواہش سے متحرک ہو کر اور اس طرح اقوام متحدہ کے اصول اور وقار کی سربلندی کے لئے اس قرارداد کو منظور کر لینے کا فیصلہ کیا ہے۔[1]

---

1. The Kashmir Question, 1947- 1956, Pp. 36-38

کمیشن کے چیئرمین کی جانب سے ۲۵۔ اگست ۱۹۴۸ء کو نئی دہلی ہی سے وزیراعظم ہند کے مذکورہ بالا مراسلے کا جو جواب دیا گیا تھا وہ یہ ہے کہ

میں جناب کے اس مراسلے کی رسید بھیجتے ہوئے فخر محسوس کرتا ہوں جو جناب نے ۲۰۔ اگست ۱۹۴۸ء کو ارسال فرمایا تھا اور جو اقوامِ متحدہ کے کمیشن برائے ہند اور پاکستان کی اس قرارداد سے متعلق ہے جو ۱۴۔ اگست ۱۹۴۸ء کو آپ کی خدمت میں پیش کی گئی تھی۔ کمیشن نے مجھے اجازت دی ہے کہ میں جناب کو اس کی اس رائے سے مطلع کروں کہ آپ نے اپنے مکتوب کے پیراگراف (۴) میں قرارداد کی جو وضاحت فرمائی ہے وہ خود کمیشن کی وضاحت کے عین مطابق ہے اور یہ سمجھا جاتا ہے کہ جہاں تک نکتہ الف (ج) کا تعلق ہے، خالی کردہ علاقہ کے باشندوں کو تمام تر جائز سیاسی سرگرمیوں کی آزادی حاصل ہوگی۔ اس سلسلہ میں "خالی کردہ علاقہ" سے مراد ریاست جموں اور کشمیر کے وہ علاقے ہیں جن پر فی الحال پاکستانی ہائی کمانڈ کا مؤثر اقتدار قائم ہے۔

کمیشن کی یہ خواہش بھی ہے کہ میں اس کی طرف سے جناب کی خدمت میں اس پر اس کے مخلصانہ اطمینان کے احساس کی اطلاع پہونچا دوں کہ حکومت ہند نے اس قرارداد کو منظور کر لیا ہے اور اس نے جس جذبہ کے ماتحت یہ فیصلہ کیا ہے وہ جذبہ قابلِ تحسین ہے۔[1]

مذکورہ بالا مراسلات کے پیشِ نظر اس بات کو ثابت کرنے کے لئے کسی دلیل کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی کہ حکومت ہند نے امن اور سلامتی کو برقرار رکھنے کے جذبہ سے متاثر ہو کر اور اقوامِ متحدہ کے اصول اور وقار کو سربلند کرنے کی غرض سے ۱۳۔ اگست ۱۹۴۸ء کی قرارداد کو ان

1. The Kashmir Question 1947-1956, Pp. 38-39

مقاصد اور اقدامات کے علاوہ جو اس قرارداد میں واضح طور پر شامل تھے ان مزید شرائط اور وضاحتوں کے ساتھ منظور کیا تھا کہ —— خالی کردہ علاقوں کی مقامی انتظامیہ کسی طرح بھی جموں اور کشمیر کی حکومت کے حاکمانہ اور مالکانہ حقوق پر اثر انداز نہیں ہوگی۔ ہندوستانی افواج کی واپسی کا وقت، واپسی کے مدارج اور ریاست میں متعین رہنے والی ہندوستانی افواج کی تعداد ایسے سوالات حکومت ہند اور کمیشن کے درمیان طے ہوں گے اور ان معاملات میں پاکستان کو مطلق دخل حاصل نہ ہوگا۔ برائے نام "آزاد کشمیر" کی حکومت کو تسلیم نہیں کیا جائے گا۔ ریاست میں ہندوستانی افواج اتنی تعداد میں مقیم رہیں گی جنہیں بیرونی جارحانہ حملوں کی مدافعت کے لئے اطمینان بخش حد تک کافی سمجھا جا سکے گا اور استصواب رائے عامہ سے پاکستان کا کوئی تعلق نہ ہوگا اور کمیشن نے حکومت ہند کی ان شرائط یا وضاحتوں کو پوری طرح حق بجانب قرار دیتے ہوئے غیر مبہم الفاظ میں ان کی توثیق کر دی تھی۔

ہندوستان کے اس حقیقت پسندانہ اور مصالحانہ طرزِ عمل کے مقابلہ میں ۱۳۔اگست ۱۹۴۸ء کی قرارداد کے متعلق پاکستان کا جو رویہ رہا تھا اس پر نظر ڈالنے سے ایک مرتبہ پھر یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ وہ گفت و شنید اور مصالحت کی کوششوں کے ہر مرحلہ میں نئے نئے مسائل شامل کر کے فیصلہ کی راہ میں کس طرح رکاوٹیں پیدا کرتا رہا ہے اور اس مرحلہ پر اس کے طرزِ عمل کے متعلق مائیکل بریچر نے لکھا ہے کہ

> پاکستان نے عملاً ۱۳۔ اگست کی قرارداد کو مسترد کر دیا تھا لیکن ابتدا میں اس نے یہ کہہ کر کہ جنگ بندی کے سوال کو باقی ماندہ تمام تجاویز سے علیحدہ رکھا جانا چاہیئے (اس تجویز کے متعلق) اپنے خیالات کو محفوظ رکھا تھا۔ کمیشن نے اس خیال کے ساتھ اتفاق رائے کیا تھا کہ غیر مشروط جنگ بندی مناسب ہے اور اس بات کو ضبطِ تحریر میں لایا تھا کہ —— اس کی ابتدائی سرگرمیاں اسی مقصد پر مرکوز رہی تھیں —— لیکن اس نے اپنی تحریر میں ان جملوں کا اضافہ

بھی کیا تھا کہ — جموں اور کشمیر میں پاکستانی افواج کی موجودگی صورت حال
میں ایک بنیادی تبدیلی ہے اور یہ تبدیلی غیر مشروط جنگ بندی کے فوری اور
مؤثر نفاذ میں رکاوٹیں پیدا کر رہی ہے۔

پاکستان نے کچھ اور وضاحتیں بھی چاہی تھیں اور ۳۱۔ستمبر ۱۹۴۸ء کو
اسے اس کی مراسلت کا جواب دے دیا گیا تھا اور تین روز کے بعد اس نے ۱۳۔اگست
کی قرارداد کو منظور بھی کر لیا تھا لیکن اس طرح اور ایسی شرائط کے ساتھ جو تقریباً
اس کی نامنظوری کی مترادف تھیں، پاکستان نے جو طویل مراسلہ روانہ کیا تھا اس
کے مندرجہ ذیل نکات خصوصیت کے ساتھ توجہ کے مستحق ہیں کیوں کہ ان سے
اس سلسلہ میں پاکستان کے طرزِ عمل کے بعض خاص گوشوں پر روشنی پڑتی ہے اور
ایک مرتبہ پھر یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس تنازعہ کے قطعی فیصلہ میں کون سی
بڑی بڑی رکاوٹیں حائل رہی ہیں۔ پاکستان نے اپنے اس طویل مراسلہ میں
(الف) پاکستان اور (برائے نام) آزاد کشمیر کی حکومتوں کو ایک دوسرے سے
علیحدہ اور ممتاز ثابت کرنے کی کوشش کی تھی اور لکھا تھا کہ آزاد کشمیر کی حکومت
ایک خود مختار حکومت ہے اور فیصلہ کے سلسلہ میں ایک لازمی فریق کی حیثیت
رکھتی ہے (اس طرح پاکستان نے قرارداد کی تقریباً نامنظوری کا جواز
ثابت کیا تھا اور تنازعہ کے ایک لازمی فریق یعنی (برائے نام) آزاد کشمیر کے خیالات
پر غور کرنے سے انکار کو مسلسل جمود اور تعطل کی وجہ قرار دے کر اس جمود کا
بار کمیشن پر ڈال دیا تھا)

(ب) یہ درخواست کی گئی تھی کہ پاکستانی اور ہندوستانی افواج کی "متوازن
اور بیک وقت" واپسی کا انتظام کیا جانا چاہئے اور یہ واپسی کمیشن سے مشورہ

کے بعد دونوں فوجوں کے ہائی کمانڈر کے ماتحت عمل میں آنی چاہیئے

(ج) یہ مطالبہ کیا گیا تھا کہ (نام نہاد) آزاد کشمیر کی افواج علی حالہٖ قائم رکھی جائیں یعنی انہیں غیر مسلح یا منتشر نہ کیا جائے اور حکومت ہند نیز حکومت کشمیر فوجی یا انتظامی عملہ کو (نام نہاد) آزاد کشمیر میں داخلہ کی اجازت دینے سے انکار کر دیا تھا۔

(د) یہ بات فرض کر لی تھی کہ کمیشن کی "نگہداشت" کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ انتظامی معاملات پر اپنا کنٹرول رکھ سکے گا یا اسے ان میں مداخلت کا حق ہوگا۔

(ہ) ایک مرتبہ پھر تمام ہندوستانی افواج کی واپسی پہ زور دیا گیا تھا۔ اور آخر میں کہا تھا کہ پاکستان اس قرارداد کو ان شرائط کے ساتھ منظور کرتا ہے کہ (الف) ہندوستان، کمیشن کی ان تمام وضاحتوں کو منظور کرے جو کمیشن نے پاکستان کی درخواست پہ کی ہیں (ب) ہندوستان مجلس تحفظ کی ۲۱۔ اپریل ۱۹۴۸ء کی منظور کردہ قرارداد کو ان تشریحات کے مطابق منظور کر لے جو اس کے محرکین نے کی تھیں اور (ج) (ہندوستان) ان تشریحات کو بھی تسلیم کرے، جو کمیشن نے پاکستان کے رو برو کی ہیں حتیٰ کہ وہ ان تشریحات کے اس مفہوم کے ساتھ بھی اتفاق رائے کرے جو پاکستان سمجھتا ہے۔

کمیشن نے پاکستان کے اس جواب کو اس کی طرف سے اس قرارداد کے استرداد کے مترادف سمجھا تھا اور ۱۹ ستمبر ۱۹۴۸ء کو اس کا جواب دیتے ہوئے لکھا تھا کہ:—

پاکستان کی یہ شرائط پاکستان کے دائرۂ اختیار سے متجاوز ہیں۔ چنانچہ ان کی بدولت نہ تو فوری جنگ بندی ہی ممکن ہو سکتی ہے اور نہ دونوں حکومتوں اور کمیشن کے درمیان کوئی نتیجہ خیز گفت و شنید ہی شروع کی جا سکتی ہے۔[1]

1- The Struggle for Kashmir, Pp. 93-94

پاکستان کے اس غیر مصالحانہ رویہ کے مقابلہ میں، ہندوستان کی خواہش مصالحت کا اندازہ اس بات سے بھی کیا جا سکتا ہے کہ ۲۰۔ اگست ۱۹۴۸ء کو ہندوستان کے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے کمیشن کے نام اپنے ایک مراسلہ میں لکھا تھا کہ —— شمالی علاقہ سے پاکستانی افواج کی واپسی کے بعد اس کے نظم ونسق کے اختیارات ریاستی حکومت کو منتقل کر دیئے چاہئیں اور اس کے دفاع کا حق ہمیں حاصل ہونا چاہیئے۔ اس مراسلہ کے جواب میں ۲۵۔ اگست کو کمیشن کی طرف سے جو مراسلہ موصول ہوا تھا اس میں لکھا تھا کہ —— اس معاملہ پر اصل قرارداد پر عمل درآمد کے وقت غور کیا جائے گا —— اور اس کے بعد وزارتِ امورِ خارجہ کی طرف سے کمیشن کو اطلاع دے دی گئی تھی کہ —— ہندوستان ۱۳۔ اگست ۱۹۴۸ء کی قرارداد کی منظوری کے لئے شمالی علاقہ کے سوال کو بنیادی شرط نہیں بنانا چاہتا[1]۔

بہرحال پاکستان کے اس غیر مصالحانہ طرزِ عمل کی بدولت اس مرحلہ پر، مسئلۂ کشمیر کے تصفیہ میں جو تعطل پیدا ہو گیا تھا اس سے دل برداشتہ ہو کر ۱۹۔ ستمبر ۱۹۴۸ء کو کمیشن جنیوا واپس چلا گیا اور وہاں اس نے اپنی پہلی رپورٹ مرتب کی وہ ۲۲۔ نومبر ۱۹۴۸ء کو مجلسِ تحفظ کو بھیج دی گئی۔

اسی زمانہ میں اقوامِ متحدہ کی مجلسِ عمومی (جنرل اسمبلی) کا چوتھا اجلاس شروع ہو چکا تھا اور اس میں شرکت کی غرض سے ہند اور پاکستان کے نمایندے، اقوامِ متحدہ کے صدر مقام میں موجود تھے۔ چناں چہ ان کی وہاں موجودگی سے فائدہ اٹھا کر کمیشن نے ۱۱۔ دسمبر ۱۹۴۸ء کو ان کے روبرو اپنی نئی تجاویز پیش کیں۔ یہ تجاویز مفہوم کے اعتبار سے ۱۳۔ اگست ۱۹۴۸ء کی قرارداد کے تیسرے حصہ کا ضمیمہ تھیں اور انھیں "استصواب رائے کے بنیادی اصول" کا عنوان دیا گیا تھا۔ اور ان تجاویز پر ہند اور پاکستان کا اتفاق رائے حاصل ہو جانے کے بعد کمیشن نے ۵۔ جنوری ۱۹۴۹ء کو

---

[1] 'شمالی علاقہ' سے مراد ریاست جموں اور کشمیر کا وہ حصہ ہے، جو شمال میں پاکستان، افغانستان، سوویت یونین اور عوامی چین کی سرحدوں سے ملتا ہے۔

مندرجہ ذیل قرار داد میں اعلان کر دیا تھا کہ

اقوام متحدہ کا کمیشن برائے ہند اور پاکستان

ہند اور پاکستان کی حکومتوں کے علی الترتیب ۲۳-۲۵ دسمبر اور ۲۵ دسمبر ۱۹۴۸ء کے وہ مراسلات موصول ہونے کے بعد جن میں انھوں نے ۱۳- اگست ۱۹۴۸ء کی قرارداد کے ضمیمہ کے طور پر ان مندرجہ ذیل تجاویز کو تسلیم کیا ہے کہ

(۱) ہند یا پاکستان کے ساتھ ریاست جموں اور کشمیر کے الحاق کا سوال آزادانہ اور غیر جانبدارانہ استصواب رائے کے جمہوری طریقے سے طے کیا جائے گا۔

(۲) استصواب رائے اس وقت کرایا جائے گا جب کمیشن کو اس بات کا یقین ہو جائے گا کہ اس کی منظور کردہ ۱۳- اگست ۱۹۴۸ء کی قرارداد کے حصہ اول اور دوم میں جنگ بندی اور عارضی صلح کے لئے جن انتظامات کا ذکر کیا گیا ہے ان پر عمل درآمد کیا جا رہا ہے اور استصواب رائے کے انتظامات مکمل ہو گئے ہیں۔

(۳) (الف) اقوام متحدہ کے سکرٹری جنرل، کمیشن کے اتفاق رائے سے کسی ایسے شخص کو استصواب رائے عامہ کا ناظم مقرر کریں گے جو بین الاقوامی اعتبار سے ممتاز شخصیت کا حامل اور عمومی طور پر قابل اعتماد ہوگا اور رسمی طور پر اس منصب پر اس کا تقرر جموں اور کشمیر کی حکومت کرے گی۔

(ب) ناظم استصواب، استصواب رائے کی تنظیم اور انجام دہی اور استصواب رائے کی آزادی اور غیر جانبداری قائم رکھنے کی غرض سے اپنے لئے جن اختیارات کو ضروری سمجھے گا وہ اختیارات ریاست جموں اور کشمیر اسے دے گی۔

(ج) ناظم استصواب کو اپنی ضرورت کے مطابق اپنے عملہ، معاونین اور مشاہدین مقرر کرنے کا اختیار حاصل ہوگا۔

(۴) (الف) کمیشن کی قرارداد ۱۳- اگست ۱۹۴۸ء کے حصہ اول اور دوم پر عمل درآمد ہو جانے کے بعد اور اس وقت جب کمیشن کو اس بات کا اطمینان ہو جائے گا کہ پُرامن حالات بحال ہو گئے ہیں، کمیشن اور ناظم استصواب رائے حکومت ہند سے مشورہ کر کے ہندوستانی اور ریاستی مسلح فوج کے انخلا کے متعلق کسی آخری صورت کا فیصلہ کرے گا لیکن اس فیصلہ میں ریاست کے تحفظ اور استصواب رائے کی آزادی کا پوری طرح خیال رکھا جائے گا۔

(ب) ۱۳- اگست کی قرارداد کے حصہ دوم الف کی دفعہ ۲ میں جس علاقہ کا حوالہ دیا گیا ہے اس میں موجود مسلح افواج کے انخلا کے متعلق آخری صورت کا فیصلہ بھی کمیشن اور ناظم استصواب رائے مقامی حکام کے مشورہ سے کریں گے۔

(۵) ریاست کے تمام انتظامی اور فوجی حکام نیز بڑے بڑے سیاسی عناصر سے امید کی جاتی ہے کہ وہ استصواب رائے کی تیاریوں اور اسے انجام تک پہونچانے میں ناظم استصواب کے ساتھ اشتراک عمل کریں گے۔

(۶) (الف) ریاست کے ان تمام شہریوں کو جو فسادات کے باعث چلے گئے ہیں واپس آنے کی دعوت دی جائے گی اور انھیں آزادی کے ساتھ واپس آنے اور شہریوں کی طرح، اپنے تمام حقوق سے فائدہ اُٹھانے کا اختیار حاصل ہوگا۔ لوگوں کو ان کے وطن میں پہنچانے اور بلانے کی سہولتیں دینے کے لئے دو کمیشن مقرر کئے جائیں گے جن میں سے ایک پاکستان کے نامزد کئے ہوئے افراد پر مشتمل ہوگا اور دوسرا ہندوستان کے۔ یہ کمیشن، ناظم استصواب رائے کی زیر ہدایت اپنا کام انجام دیں گے اور ہند اور پاکستان کی حکومتیں نیز ریاست جموں اور کشمیر کے تمام حکام اس دفعہ کو بروئے کار لانے کے لئے ناظم استصواب رائے کے

ساتھ پورا پورا اتحادِ عمل کریں گے۔

(ب) تمام اشخاص (ریاست کے شہریوں کے علاوہ) جو ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو یا اس کے بعد قانونی مقاصد کے علاوہ دوسرے مقاصد سے ریاست میں داخل ہوئے ہیں انہیں ریاست سے چلا جانا ہوگا۔

(۷) ریاست جموں اور کشمیر کے تمام حکام ناظم استصواب رائے کے ساتھ اتحادِ عمل سے ان امور کی یقینی دہانی کریں گے کہ

(الف) استصواب رائے کے سلسلہ میں کسی قسم کی دھمکی نہیں دی جائے گی، ترغیب اور تحریص سے کام نہیں لیا جائے گا نیز رشوت اور غیر مناسب اثرات کا استعمال نہیں کیا جائے گا۔

(ب) پوری ریاست میں جائز سیاسی سرگرمیوں پر کوئی پابندی عائد نہیں کی جائے گی۔ ریاست کے تمام باشندے، بلا امتیاز عقیدہ، ذات یا جماعت، ہندیا پاکستان کے ساتھ الحاق کے سوال پر اپنے خیالات کا اظہار کرنے کے لئے رائے دینے میں بالکل آزاد رہیں گے اور ان کی حفاظت کی جائے گی۔ تقریر، تحریر اور اجتماع کی آزادی دی جائے گی، نیز ریاست کے اندر سفر کرنے اور قانونی طور پر ریاست سے باہر جانے اور ریاست میں داخل ہونے پر کوئی پابندی عائد نہیں کی جائے گی۔

(ج) تمام سیاسی قیدی رہا کر دئے جائیں گے۔

(د) ریاست کے ہر حصہ میں اقلیتوں کا قابلِ اطمینان تحفظ کیا جائے گا اور

(ہ) کسی کو اختلافِ رائے کی بنا پر سزا نہیں دی جائے گی۔

(۸) ناظم استصواب: ایسے تمام مسائل کو جن میں اسے امداد کی ضرورت ہوگی، اقوام متحدہ کے کمیشن برائے ہند اور پاکستان کے علم میں لا سکے گا اور کمیشن استصواب رائے

کے ناظم کو اپنی طرف سے ایسی ذمہ داریوں کو انجام دینے کی اجازت دے سکے گا جو
ناظم استصواب کو سپرد کی گئی ہیں۔

(۹) استصواب رائے عامہ کی تکمیل کے بعد، ناظم استصواب اس کے نتائج
سے کمیشن اور جموں اور کشمیر کی حکومت کو مطلع کرے گا اور اس کے بعد کمیشن
مجلس تحفظ کے روبرو اس امر کی توثیق کرے گا کہ استصواب رائے میں آزادی
اور غیر جانبداری رہی ہے یا نہیں۔

(۱۰) عارضی صلحنامہ پر دستخط ہونے کے بعد، کمیشن کی قرارداد ۱۳-اگست ۱۹۴۸ء
کے حصہ سوم میں بیان کردہ تجویز کے مطابق، باہم مشورہ کے ذریعہ سے مذکورہ
بالا تجاویز کی تفصیلات طے کر لی جائیں گی اور مشورہ میں ناظم استصواب کو پوری
طرح شامل رکھا جائے گا۔

ہند اور پاکستان کی حکومتوں سے سفارش کرتا ہے کہ کمیشن کی قرارداد ۱۳-اگست
۱۹۴۸ء کی بنا پر ان کے درمیان جو سمجھوتہ ہوا ہے اس کے مطابق وہ جنگ بندی
کا حکم دینے کے لئے فوری قدم اٹھائیں اور یہ جنگ بندی یکم جنوری ۱۹۴۹ء
کی نصف شب سے ایک منٹ قبل عمل میں آ جائے اور

طے کرتا ہے کہ اسے (کمیشن کو، اپنی ان ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے لئے جو اس
پر ۱۳-اگست ۱۹۴۸ء کی قرارداد اور مذکورہ بالا اصول کی بدولت عائد ہوتی ہیں
مستقبل قریب ہی میں، برصغیر ہند واپس چلا جانا چاہیئے۔[1]

استصواب رائے کے بنیادی اصول کو مذکورہ بالا قرارداد کی شکل دینے سے قبل جب انہیں
۱۱-دسمبر ۱۹۴۸ء کو تجاویز کی صورت میں پیش کیا گیا تھا تو ہندوستان نے ان کے متعلق بعض نکات

1. S/1196, 10.1.49. Annex. 3

کی وضاحتیں طلب کی تھیں اور ان امور پر مطمئن ہو جانے کے بعد کہ

(الف) استصواب رائے سے متعلق کمیشن کی تجویز کو منظور کرنے سے قبل پاکستان ۱۳۔ اگست ۱۹۴۸ء کی قرارداد کے حصہ اول اور دوم پر عمل در آمد کرے گا۔

(ب) ناظم استصواب رائے کے اختیارات محدود ہوں گے اور وہ محض استصواب رائے کے تنظیمی امور ہی کے ساتھ تعلق رکھے گا۔

(ج) استصواب رائے کے دوران میں "آزادی تقریر" کی اصطلاح میں پاکستان کے طرفداروں کا یہ حق شامل نہ ہوگا کہ وہ لوگوں کے مذہبی جذبات کو ابھاریں اور

(د) یہ کہ (نام نہاد) آزاد کشمیر کی افواج کو منتشر کرنے کے علاوہ انھیں بہت بڑے پیمانے پر غیر مسلح بھی کیا جائے گا۔[1]

اس طرح ہند اور پاکستان کی طرف سے ۱۱۔ دسمبر ۱۹۴۸ء کی ان تجاویز کو منظور کر لئے جانے کے بعد جنھیں کمیشن نے ۵۔ جنوری ۱۹۴۹ء کو ایک قرارداد کی شکل دے دی تھی اور جنھیں منظور کر کے دونوں حکومتوں نے ۱۳۔ اگست ۱۹۴۸ء کی قرارداد کو بھی تسلیم کر لیا تھا یکم جنوری ۱۹۴۹ء کی شب کو کشمیر میں جنگ بندی عمل میں آئی اور اس کے ساتھ ہی:-

کشمیر کے تنازعہ میں اقوام متحدہ کی مصالحانہ کوششوں کا پہلا مرحلہ ختم ہو گیا۔[2]

---

1. The Struggle for Kashmir p.۹۲

2. S/1195 ;10.1.49

دسواں باب

عارضی صلح کی کوششوں میں ناکامی

گذشتہ باب میں بتایا جا چکا ہے کہ اقوام متحدہ کے کمیشن برائے ہند اور پاکستان کی مساعی کی بدولت یکم جنوری ۱۹۴۹ء کی شب کو کشمیر میں جنگ بند ہو گئی تھی لیکن آئندہ واقعات کو اچھی طرح سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ اس مرحلہ پر ایک مرتبہ پھر گذشتہ واقعات پر ایک نظر ڈال لی جائے۔

یہ امر محتاج بیان نہیں کہ ہندوستان نے ۲۰۔ اگست ہی کو بعض اختلافات کے باوجود کمیشن کی ۱۳۔ اگست ۱۹۴۸ء کی قرارداد کو منظور کر لیا تھا اور اس منظوری کے وقت اسے کمیشن کی طرف سے ان باتوں کا یقین دلایا گیا تھا کہ — ریاست جموں اور کشمیر کا وہ حصہ جو پاکستانی افواج کے قبضہ میں ہے اصولاً ریاست ہی کا حصہ سمجھا جائے گا۔ نام نہاد آزاد کشمیر کی حکومت کو کسی حال میں بھی تسلیم نہیں کیا جائے گا اور عارضی صلح کے دوران میں اس علاقہ کو اس طرح مستحکم نہیں کیا جائے گا جس سے ریاست کو نقصان پہنچے۔ ریاست کی دفاعی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے وہاں مناسب تعداد میں ہندوستانی فوج رہے گی۔ پاکستان ریاست سے اپنی افواج اور اپنے شہریوں کو واپس بلا لے گا اور استصواب رائے نیز ریاست کے داخلی انتظام میں اسے کوئی دخل حاصل نہ ہوگا اور پاکستانی افواج ریاست کے جن علاقوں کو خالی کریں گی ان کے نظم ونسق کی ذمہ داری کمیشن کی نگرانی

میں مقامی حکام پر عائد ہوگی اور جہاں تک شمالی علاقہ کا تعلق ہے ہندوستان نے ان کے دفاع اور انتظام کے متعلق اپنے زاویۂ نظر کو واضح کر دینے کے باوجود کمیشن کی اس یقین دہانی کو تسلیم کر لیا تھا کہ اس معاملہ پر اس وقت غور کیا جائے گا جب ۱۳۔ اگست ۱۹۴۸ء کی قرارداد پر عمل درآمد کا وقت آئے گا۔ لیکن پاکستان کی جانب سے اس قرارداد کو بالواسطہ طریقہ پر مسترد کر دیا گیا تھا۔

اس مسئلہ پر مصالحت کرانے میں ناکام ہو جانے کے بعد کمیشن نے ۱۱۔ دسمبر ۱۹۴۸ء کو تجاویز پیش کی تھیں اور ان تجاویز کو بھی ہندوستان نے جن تشریحات اور یقین دہانیوں کی روشنی میں منظور کیا تھا ان کا خلاصہ یہ ہے کہ — پاکستان ۱۳۔ اگست کی قرارداد کے حصہ اول اور دوم پر عمل کرے گا۔ ناظم استصواب رائے کے اختیارات محدود ہوں گے۔ استصواب رائے کے دوران میں پاکستان کے طرفدار لوگوں کے مذہبی جذبات کو نہیں بھڑکائیں گے اور نام نہاد آزاد کشمیر کی مسلح افواج کو منتشر اور غیر مسلح کیا جائے گا۔ اس طرح حکومت کی طرف سے ۱۳۔ اگست ۱۹۴۸ء کی قرارداد کو اس کے بعد ۵۔ جنوری ۱۹۴۹ء کی اس قرارداد کو جو ۱۱۔ دسمبر ۱۹۴۸ء کی تجاویز پر مشتمل تھی ان تمام وضاحتوں کے ساتھ منظور کیا گیا تھا جو کمیشن نے دونوں قراردادوں کے سلسلے میں کی تھیں اور انھیں منظور کرتے ہوئے ہندوستان نے اپنے کسی بنیادی مطالبہ سے انحراف نہیں کیا تھا۔

اس کے برعکس پاکستان نے ۱۳۔ اگست کی قرارداد کو مسترد کر دیا تھا لیکن اس نے ۱۱۔ دسمبر ۱۹۴۸ء کی تجاویز کو جو ۱۳۔ اگست کی قرارداد کے حصہ سوم کے ایک ضمیمہ کی حیثیت رکھتی تھیں تسلیم کر لیا تھا اور اس طرح اس نے ۱۳۔ اگست کی پوری قرارداد پر اپنی منظوری کی مہر ثبت کر دی تھی۔ اس صورت حال کے پیش نظر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کے نظریہ میں یہ تبدیلی کیوں واقع ہوئی تھی؟ اور چونکہ اس سوال کا جواب بھی آئندہ واقعات کو سمجھنے کے لئے ایک ضروری عنصر کی حیثیت رکھتا ہے اس لئے یہاں اس جواب کو بھی ذہن نشین کرا دینا مناسب معلوم ہوتا ہے

مائیکل بریچر نے اس سوال کا جواب دیتے ہوئے دوسرے چند اسباب بیان کرنے کے بعد

یہ بھی لکھا ہے کہ:۔

... ایک بات جس نے بلاشبہ پاکستان کے فیصلہ پر اثر ڈالا تھا یہ تھی کہ ۱۹۴۸ء

کے موسم خزاں میں 'کشمیر میں' ہندوستان کی فوجی پوزیشن نمایاں طور پر مضبوط ہو گئی

تھی۔ ۔۔ موسم گرما کی مہم اپریل میں شروع ہوئی تھی۔ اس مہم کے دوران میں ہندوستانی

افواج نے سرعت کے ساتھ پیشقدمی کر کے 'سلام آباد' ہنڈواڑہ اور تھوال پر، جو

سرحدی شہر مظفر آباد سے صرف ۱۸ میل کے فاصلہ پر واقع ہے قبضہ کر لیا تھا۔۔۔

اکتوبر کے وسط میں پاکستانی افواج نے تھوال پر دوبارہ قبضہ کر لینے کی ناکام کوشش

کی تھی۔ نومبر میں ہندوستانی افواج نے جوابی حملہ شروع کیا اور ۱۵ کو اہم مقام دراس

کو پاکستانی فوجوں سے واپس لے لیا۔ اس طرح شمال و مشرق کی طرف سے وادی پر

حملہ کا ایک زبردست خطرہ دور ہو گیا اور لداخ پر جو دباؤ پڑ رہا تھا وہ بھی جاتا رہا

پھر چھ روز کے بعد ہندوستانی افواج نے پونچھ کے ایک سال سے زیادہ مدت کے

محاصرہ کو بھی ختم کرا دیا[1]

چناں چہ پونچھ کا محاصرہ ختم ہو جانے کے تین روز بعد پاکستان کے وزیر خارجہ سر ظفر اللہ خاں

نے مجلس تحفظ کو توجہ دلائی تھی کہ:۔

اسے اس معاملہ میں فوری قدم اٹھانا چاہیئے۔ ورنہ پاکستان اس بات پر

مجبور ہو جائے گا کہ وہ اپنے تمام وسائل سے کام لے کر پونچھ اور میرپور کے اضلاع

---

1. Twelve Months of War in Kashmir, published by P.I.B. Govt. of India, Oct. 1948

کو ہندوستان کے قبضہ میں جانے سے روکنے کے لئے جوابی حملہ شروع کر دے۔[1]

پھر جس روز مجلس تحفظ کو سر ظفر اللہ خاں کا یہ مراسلہ موصول ہوا تھا اسی روز ہندوستانی افواج نے وادیٔ لداخ کے اہم رسل و رسائل اور تجارت کے مرکز کرگل کو بھی پاکستانی افواج سے واپس لے کر ایشیا کی ان تجارتی شاہراہوں کو خطرہ سے محفوظ بنا دیا تھا جو وادیٔ لداخ سے گذرتی ہیں اور اس طرح تبت اور یارقند کے درمیان دوبارہ تجارت کو ممکن بنا دیا تھا۔ اور ہندوستانی افواج کی اس کامیابی کے تیسرے ہی روز،

سر ظفر اللہ خاں نے فوری جنگ بندی کے معاہدہ پر دستخط کرنے کے لئے اپنی آمادگی کا اظہار کر دیا تھا۔[2]

مذکورہ بالا واقعات کے پیش نظر یہ نتیجہ اخذ کرنا کوئی مشکل کام نہیں کہ ہندوستانی افواج کی یہ مسلسل اور ہمہ گیر کامیابیاں پاکستان کے سابقہ فیصلوں پر اثر انداز ہوئی تھیں۔ لیکن اس کے علاوہ دو اور ایسے اسباب بھی تھے جنہوں نے پاکستان کو ۱۱ دسمبر ۱۹۴۸ء کی تجاویز کو قبول کر لینے پر آمادہ کیا تھا اور ان میں پہلا سبب تو یہ تھا کہ اپنے اقتصادی حالات کی بدولت اس کے لئے کشمیر کی جنگ کو جاری رکھنا ممکن نہیں تھا اور دوسری وجہ یہ تھی کہ اس تمام مہلت سے فائدہ اٹھا کر اس نے نام نہاد آزاد کشمیر کی افواج کو زیادہ منظم اور مضبوط بنا دیا تھا اور اس طرح کشمیر کے مسئلہ کے تصفیہ کی راہ میں ایک نئی اور زبردست رکاوٹ پیدا کرنے کا سامان پیدا کر دیا تھا۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ۱۱ دسمبر ۱۹۴۸ء کی تجاویز اور ان کے توسط سے ۱۳ اگست ۱۹۴۸ء کی قرارداد کو منظور کرتے وقت بھی اس کے پیش نظر جو مقصد تھا وہ فیصلہ کی ان تمام کوششوں کو ناکام بنانا تھا۔

---

1. S/1087, 23.11.48
2. The Hindustan Times, 27.11.48

اس کے برعکس ہندوستان نے ۱۱؍ دسمبر ۱۹۴۸ء کی تجاویز کو اس وقت منظور کیا تھا جب ہندوستانی افواج ریاست جموں و کشمیر کی سرحدوں کے اندر کامیاب پیش قدمیوں میں مصروف تھیں اور ان پیش قدمیوں کے دوران میں ریاست کے مختلف حصوں کو برابر حملہ آوروں سے واپس لے رہی تھیں۔ لیکن چوں کہ ہندوستان کشمیر کے تنازعہ کو پُرامن اور آئینی طریقہ پر طے کرنا چاہتا تھا اس لئے اس نے اپنی اس بالادستی کے باوجود جنگ بندی کی تجویز کو قبول کر لیا تھا۔

بہرحال جنگ بندی کے بعد، خط جنگ بندی کے تعین کا سوال ۷ ماہ تک طے نہیں ہو سکا اور کمیشن نے اپنے فیصلہ کے مطابق فروری ۱۹۴۹ء کے پہلے ہفتہ میں برصغیر ہند واپس آنے کے بعد اپنی توجہات اور مساعی کو جن دو کاموں پر مرکوز رکھا وہ خط جنگ بندی کا تعین اور استصواب رائے کی تیاریوں کا میدان ہموار کرنے کی غرض سے ۱۳؍ اگست ۱۹۴۸ء کی قرارداد کے حصہ اوّل کی باقی ماندہ دفعات نیز حصہ دوم پر عمل درآمد کی صورتیں پیدا کرنا تھا۔ چناں چہ کمیشن کا پہلا مقصد ۲۷؍ جولائی ۱۹۴۹ء کو اس معاہدہ کے ذریعہ سے حاصل ہو گیا جو خط جنگ بندی کے تعین کے لئے کراچی میں ہوا تھا۔ اور جس میں فریقین کو اس امر کی اجازت دے دی گئی تھی کہ وہ خط جنگ بندی کے اندر اپنی اپنی جگہ اپنی دفاعی پوزیشن کو درست کر سکتے ہیں لیکن انھیں کشمیر میں فوجوں کے بڑھانے کی ممانعت کر دی گئی تھی اور کمیشن کو اجازت دے دی گئی تھی کہ وہ جہاں بھی چاہے اپنے مشاہدین مقرر کر سکتا ہے۔ اس طرح کمیشن جنگ کو بند کرانے اور خط جنگ بندی کے تعین میں تو کامیاب ہو گیا تھا لیکن جہاں تک عارضی صلح کا تعلق تھا کمیشن اپنی کوششوں میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔

برصغیر ہند میں دوبارہ واپس آنے کے بعد سے ستمبر ۱۹۴۹ء میں اپنی واپسی تک عارضی صلح کے سلسلہ میں کمیشن جو کوششیں کرتا رہا تھا اُن کا خلاصہ یہ ہے کہ:-

سب سے پہلے کمیشن نے کراچی، دہلی اور سری نگر میں مشورے کرنے کے بعد دونوں فریقوں کو فوجی اور انتظامی امور پر گفتگو کرنے کی غرض سے ایک مشترکہ کانفرنس

منعقد کرنے کی دعوت دی۔ یہ کانفرنس جس میں کمیشن کی "ٹروس سب کمیٹی" بھی شامل تھی ۹ مارچ کو دہلی میں منعقد ہوئی۔ اس میں پاکستان نے عارضی صلح کے لئے ایسی تجاویز پیش کیں جو ان شرائط پر مبنی تھیں جو سر ظفر اللہ خاں مختلف مواقع پر پیش کر چکے تھے (اور جنھیں ہندوستان نے کسی موقع پر بھی منظور نہیں کیا تھا) چناں چہ اس کانفرنس میں بھی ہندوستان نے انھیں مسترد کر دیا اور یہ کانفرنس ناکام ہو گئی ...... پھر ایک اور ناکام کوشش کے بعد کمیشن اس نتیجہ پر پہنچا کہ اسے خود عارضی صلح کی تجاویز مرتب کرنی چاہئیں۔ چناں چہ اس نے یہ تجاویز مرتب کر کے ۱۵ اپریل کو ہند اور پاکستان کی حکومتوں کو بھیج دیں لیکن فریقین نے انھیں بھی مسترد کر دیا۔ اس کے بعد کمیشن نے ۲۸ اپریل کو اپنی وہ ترمیم شدہ شرائط صلح ارسال کیں جن کا خلاصہ تھا کہ۔ جہاں تک شمالی علاقہ کا تعلق ہے اگر کمیشن اور یا ناظم استصواب رائے اس نتیجہ پر پہنچے کہ اس کے دفاع کے لئے ہندوستانی افواج کا وہاں رکھا جانا ضروری ہے تو ہندوستان کو ایسا کرنے کی اجازت دے دی جائے گی۔ کمیشن نے ۱۳ اگست ۱۹۴۸ء کی قرارداد کے مطابق تمام پاکستانی فوجوں نیز بیشتر ہندوستانی افواج کی واپسی کا مفصل پروگرام بھی بنایا تھا اور اس بات کا اعادہ بھی کیا تھا کہ پاکستانی افواج جس علاقہ کو خالی کریں گی اس کا انتظام مقامی حکام کمیشن کی نگرانی میں کریں گے۔ اور ۱۳ اگست ۱۹۴۸ء نیز ۵ جنوری ۱۹۴۹ء کی قراردادوں کی ان دفعات کی مزید توثیق کی تھی جن میں سیاسی قیدیوں کی رہائی، شہری حقوق کے تحفظ کی ضمانت اور امن و قانون کی بحالی کا ذکر کیا گیا تھا...... فریقین نے ان تجاویز کو بھی منظور نہیں کیا...... اور ہندوستان نے اپنے مراسلات مورخہ ۱۸ مئی نیز ۱۷ اور ۱۹ جون ۱۹۴۹ء میں غیر مبہم الفاظ میں ان پر اپنے بنیادی اعتراضات

کو واضح کر دیا۔ یہ اعتراضات ان نکات پر تھے کہ ان تجاویز میں (نام نہاد) آزاد کشمیر کی افواج کو منتشر اور غیر مسلح کرنے کا کوئی ذکر موجود نہیں اور شمالی علاقہ کے متعلق سمجھوتہ غیر اطمینان بخش ہے۔ اور پاکستان نے ۳۰ مئی کو ان تجاویز پر جو اظہار خیال کیا تھا اس کا خلاصہ یہ تھا کہ وہ شمالی علاقہ میں ہندوستانی افواج کے قیام پر سختی کے ساتھ اعتراض کرتا ہے اس علاقہ میں حکومت ہند یا حکومت کشمیر کے کسی افسر کو داخلہ کی اجازت نہ دیے جانے کا مطالبہ کیا تھا اور اپنی اس رائے کا اعادہ کیا تھا کہ ہندوستانی اور پاکستانی افواج کو بیک وقت کشمیر سے واپس ہونا چاہیئے۔

مصالحت کی جداگانہ گفت و شنید میں ناکام ہونے کے بعد کمیشن نے یہ تجویز پیش کی کہ ۲۲ اگست ۱۹۴۹ء کو سیاسی پہلو پر بات چیت کرنے کے لئے وزارتی سطح پر ایک کانفرنس منعقد کی جائے۔ دونوں نے اس کانفرنس کے انعقاد پر آمادگی کا اظہار کیا لیکن ہندوستان اس کانفرنس میں شمالی علاقہ اور (نام نہاد) آزاد کشمیر کی فوجوں کے سوالات کو بھی زیر بحث لانا چاہتا تھا۔ لیکن پاکستان انھیں حذف کر دینے پر مصر تھا۔ اس لئے یہ طریقہ بھی ناکام ہو گیا اور ۱۸ اگست کو کمیشن نے اپنی یہ تجویز واپس لے لی ۔۔۔ کمیشن نے اس تعطل کو ختم کرنے کے لئے ۳۰ اگست ۱۹۴۹ء کو آخری تجویز یہ پیش کی تھی کہ تمام متنازعہ فیہ نکات میں ثالثی فیصلہ کو قبول کر لیا جائے لیکن ہندوستان نے اس تجویز کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔[1]

ہندوستان نے کمیشن کی اس آخری تجویز کو جس بنا پر مسترد کیا تھا اس کا اندازہ "پاکستان ٹائمز" کے ان جملوں کیا جا سکتا ہے کہ:-

---

1. S/1430, Addendum 1, Dec 9, 1949 (The Third Interim Report of UNCIP to Security Council)

ہم اس بات کو سمجھنے سے قاصر نہیں رہ سکتے کہ اس تمام معاملہ کو غیر ضروری طور پر بڑی طاقتوں کی اقتدار پسندی کی کشمکش کے ساتھ وابستہ کر دیا گیا ہے۔ [1]

لیکن عارضی صلح کے سلسلہ میں کمیشن کی ان تمام ترسرگرمیوں کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ہندوستان نے اپنی شکایت کو مجلس تحفظ میں پیش کرتے وقت جن امور کو موقف بنایا تھا وہ اس تمام مدت میں پورے استقلال کے ساتھ ان کا پابند رہا تھا اور وہ کمیشن کی جن تجاویز کو مسترد کرتا رہا تھا وہ وہی تجاویز تھیں جن میں اس کے موقف کو نظر انداز کیا گیا تھا۔

بہر حال ۱۹۴۹ء کے اواخر میں کشمیر کے مسئلہ کی صورت یہ تھی کہ وہاں جنگ بند ہو جانے کے بعد خط جنگ بندی کا تعین ہو چکا تھا لیکن عارضی صلح کے سلسلہ میں جس پر استصواب رائے کا انحصار تھا کوئی فیصلہ نہیں ہو سکا تھا اور مائیکل بریچر کے الفاظ میں

متنازعہ کی اس مرحلہ پیا ور در حقیقت آئندہ چار سال کی مدت میں، عارضی صلح کے راستہ میں (نام نہاد) آزاد کشمیر کی فوجوں کو منتشر کرنے اسلح افواج کو کشمیر سے واپس بلانے اور شمالی علاقہ کی حیثیت کو متعین کرنے کے سوالات رکاوٹ بنے رہے تھے [2]

اس سلسلہ میں یہ امر ذہن نشین کر لینا ضروری ہے کہ جس طرح مجلس تحفظ کی ہدایت کے خلاف پاکستان نے خود اپنے اعتراف کے مطابق مئی ۱۹۴۸ء میں اپنی باقاعدہ افواج کو کشمیر میں بھیج دیا تھا اسی طرح اس نے مجلس تحفظ اور کمیشن کی اس ہدایت کے برعکس کہ کشمیر میں فوجی قوتوں کو مزید تقویت نہ دی جائے اس نے اگست ۱۹۴۸ء سے ۱۹۴۹ء کے موسم بہار تک (نام نہاد) آزاد کشمیر کی فوجوں کو اس درجہ قوی بنا دیا تھا کہ ان کی تعداد ۳۲ بٹالینوں تک پہنچ گئی تھی۔ چناں چہ ۱۹۵۰ء میں سردار محمد ابراہیم خاں نے اس امر کا اعتراف کیا تھا کہ:۔

---

1. The Pakistan Times 2.9.49

2. The Struggle for Kashmir P. 102

کشمیر میں جنگ بندی کے بعد نو ماہ کی مدت میں (تمام تہاد) آزاد کشمیر کی حکومت

اپنی افواج کی تنظیم کرتی رہی ہے اور اب وہ پہلے کے مقابلہ میں سو گنی بہتر ہیں [1]

اور خود کمیشن نے ان افواج کے متعلق لکھا تھا کہ

اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ اب آزاد افواج اتنی طاقت ور ہو گئی ہیں کہ

ان کی وجہ سے فوجی صورت حال بدل گئی ہے۔ اس صورت حال سے افواج خصوصاً

ہندوستانی افواج کی واپسی کا سوال اس لئے بے حد مشکل بن گیا ہے کہ اس وقت تک

تمام تجاویز میں دونوں ملکوں کی باقاعدہ افواج کی واپسی کے مقصد کو پیش نظر رکھا

گیا تھا۔ [2]

ان حالات میں کمیشن عارضی صلح کرانے میں ناکامیاب ہوکر ستمبر ۱۹۴۹ء میں برصغیر ہند سے

واپس چلا گیا اور اس نے اس سلسلہ میں اپنی جو آخری رپورٹ مرتب کی اس میں یہ سفارشات کیں کہ۔

(الف) کمیشن کی بجائے مصالحت کرانے کا کام کسی ایک فرد کے سپرد کر دیا جائے

اور اسے تمام مسائل کو حل کرنے کے لئے وسیع اختیارات دیے جائیں۔

(ب) ریاست کو غیر فوجی بنانے (افواج کے انخلا) کے سوال کو مجموعی طور پر طے

کیا جائے یعنی تمام افواج کی بیک وقت واپسی کو ضروری قرار دیا جائے۔

(ج) استصواب رائے کے سلسلے میں تمام اختلافات کو لازمی طور پر ثالث کے

ذریعہ سے طے کرایا جائے۔ [3]

اور کمیشن کی ان سفارشات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگرچہ کمیشن کی وہ قرار دادیں جو اس نے ۱۳ اگست

۱۹۴۸ء اور ۵ جنوری ۱۹۴۹ء کو منظور کی تھیں اس مسئلہ میں پیدا ہو جانے والی نئی الجھنوں کو حل کرنے

1, The Pakistan Times 11.10.49 2. S/1430

3 Uncip Report 12.9.49

کی صلاحیتوں سے محروم تھیں لیکن اس نے جو سفارشات کی تھیں وہ مذکورہ بالا قرار دادوں کے محور سے ہٹ گئی تھیں چنانچہ کمیشن کے چیک ممبر مسٹر جوزف کاربیل نے اکثریت کی رپورٹ سے اختلاف کرتے ہوئے اپنی رپورٹ میں لکھا تھا کہ :

> یہ بتادینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ کمیشن مصالحت کی جو کوششیں کرتا رہا ہے ان سے اس تمام مسئلہ کو حل کرنے میں کوئی تعمیری فائدہ نہیں پہنچا ہے

یہ امر محتاج بیان نہیں کہ کمیشن نے اس بات کا اعتراف کیا تھا کہ (نام نہاد) آزاد کشمیر کی افواج اس قدر طاقت ور ہو گئی ہیں کہ ان کی وجہ سے فوجی صورت حال بدل گئی ہے اور افواج خصوصاً ہندوستانی افواج کی واپسی کا سوال بے حد مشکل بن گیا ہے۔ لیکن اوّل تو اس نے اپنی سفارشات میں آزاد کشمیر کی فوجوں کے سوال کو بالکل نظر انداز کر دیا تھا۔ دوسرے اس نے اپنی قرار دادوں کے ان حصوں سے بھی انحراف کیا تھا جن میں پاکستانی فوج کے فوری انخلا کی یقین دہانی کی گئی تھی اور ہندوستانی افواج کے بیشتر حصہ کی واپسی کو اپنے اور ہندوستان کے باہمی مشورہ پر منحصر رکھا تھا۔ اور ان سفارشات میں دونوں ملکوں کی افواج کی بیک وقت واپسی کو ضروری قرار دے دیا تھا پھر اسی قدر نہیں بلکہ اس نے اپنی ۵ جنوری ۱۹۴۹ء کی اس قرار داد کو بھی جو استصواب رائے کے اصول پر مشتمل تھی عملاً ترک کر کے استصواب رائے سے متعلق تمام تر مسائل کو ثالث کے فیصلہ پر منحصر کر دیا تھا چنانچہ مسٹر جوزف کاربیل نے اپنی جداگانہ رپورٹ میں لکھا تھا کہ

> " ۱۳ اگست کی قرار داد کی جگہ کوئی ایسی قرار داد منظور کی جانی چاہیئے جس میں اس مدت میں رونما ہونے والی تبدیلیوں خصوصاً (نام نہاد) آزاد کشمیر کی فوج کے ایک طاقت ور فوج بن جانے کو باقاعدہ طریقہ پر مدِ نظر رکھا جا سکے "

اور یہ بات ظاہر ہے کہ ان سفارشات کے مطابق آئندہ اس مسئلہ کو حل کرنے کی جو کوششیں کی

S/1430, Addendum 3. 16.12.49 صفحہ ۱۱

جاتی رہیں وہ مذکورہ بالا ابتدائی کوششوں سے بالکل مختلف اور متضاد ہونے کے باعث کامیاب نہیں ہو سکتی تھیں۔

یہاں اس امر کو بھی ذہین نشین کر لینا چاہیئے کہ اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل نے مارچ ۱۹۴۹ء کے اواخر میں امریکن امیر البحر چیسٹر نمٹز کو ناظم استصواب رائے کے منصب کے لئے منتخب کیا تھا لیکن چوں کہ عارضی صلح کی شرائط پر کوئی سمجھوتہ نہیں ہو سکا تھا اس لئے انھوں نے باقاعدہ طور پر اپنے فرائض کی انجام دہی بھی شروع نہیں کی تھی۔ لیکن جب ستمبر ۱۹۴۹ء میں اس نے استصواب رائے سے متعلق اختلافی مسائل کو لازمی طور پر کسی ثالث کے سپرد کر دئے جانے کی سفارش کی تو اس کے ساتھ ہی اس نے ایڈمرل نمٹز کا نام بطور ثالث بھی تجویز کیا لیکن چوں کہ ثالثی کی یہ تجویز بھی قابل عمل ثابت نہیں ہوئی اس لئے وہ اپنی اس نئی حیثیت میں بھی کوئی کام نہیں کر سکے۔

بہر حال عارضی صلح کی شرائط پر سمجھوتہ کرانے کی تمام تر کوششوں میں ناکام ہو جانے کے بعد کمیشن نے اس تنازعہ کو مجلس تحفظ میں بھیج دیا اور ۷ دسمبر ۱۹۴۹ء کو مجلس تحفظ نے کمیشن کی سفارشات کی روشنی میں کناڈا کے جنرل اے۔ جی۔ ایل مک ناٹن کو جو اس وقت مجلس تحفظ کے صدر بھی تھے اپنی جانب سے غیر رسمی طور پر مصالحت کرانے والا مقرر کر کے انھیں مصالحت کی کوششیں جاری رکھنے کی ہدایت کی اور انھوں نے ۲۱ دسمبر ۱۹۴۹ء کو ریاست جموں اور کشمیر کو غیر فوجی بنانے کے لئے دونوں ملکوں کے روبرو جو تجاویز پیش کیں وہ یہ تھیں کہ

(الف) پاکستان کی باقاعدہ افواج واپس چلی جائیں اور ریاست کے دفاع نیز داخلی امن اور قانون کے تحفظ کے لئے جن ہندوستانی افواج کی ضرورت نہ ہو وہ بھی واپس چلی جائیں۔

(ب) مقامی افواج کو غیر مسلح اور منتشر کر کے کم کر دیا جائے اور ان مقامی افواج میں ریاست جموں اور کشمیر کی مسلح افواج اور ملیشیا نیز (نام نہاد) آزاد کشمیر کی افواج

کو بھی شامل سمجھا جائے۔

(ج) ریاست کو غیر فوجی بنانے کی اس تجویز میں شمالی علاقہ کو بھی شامل سمجھا جائے اور اس علاقہ میں اس وقت انتظام کا جو نظام قائم ہے اُسے اقوام متحدہ کی نگرانی میں برقرار اور بحال رکھا جائے [1]

ان تجاویز کے ساتھ ساتھ جنرل مک ناٹن نے یہ سفارش بھی کی تھی کہ ان تجاویز پر عمل درآمد کرانے کے لئے کمیشن کی بجائے کسی ایک شخص کو مقرر کر دیا جائے۔ اور جنرل مک ناٹن کی ان تجاویز کا تجزیہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں کمیشن کی آخری تجاویز کے مطابق ــــ ہند اور پاکستان کی مسلّح افواج کو بیک وقت ریاست سے واپسی کی ہدایت کی گئی تھی اور اس طرح ۱۳ اگست ۱۹۴۸ء کی قرارداد کے حصہ (ب) کی دفعہ ۱ اور ۵ جنوری ۱۹۴۹ء کی قرارداد کی دفعہ (۴) کے فقرہ (الف) کو نظر انداز کر دیا گیا تھا۔ دوسرے ریاست جموں اور کشمیر کی قانونی حکومت کی باقاعدہ افواج کو (نام نہاد) آزاد کشمیر کی ان افواج کی سطح پر لا کھڑا کیا تھا جنہیں جنگ بندی کے بعد مجلس تحفظ کی ہدایات کو نظر انداز کر کے منظم کیا گیا تھا اور اس طرح اُس خط و کتابت کو بالکل نظر انداز کر دیا تھا جو اگست ۱۹۴۸ء کے اواخر میں وزیر اعظم ہند اور کمیشن کے چیئرمین کے درمیان ہوئی تھی اور جس میں کمیشن کی جانب سے اس بات کا یقین دلایا گیا تھا کہ ۱۳ اگست ۱۹۴۸ء کی قرارداد کی نہ تو اس طرح وضاحت کی جائے گی اور نہ اس پر اس طرح عمل درآمد کیا جائے گا جس سے برائے نام آزاد کشمیر کی حکومت کو تسلیم کر لینے کا کوئی پہلو برآمد ہو سکے۔ اور سب سے آخر میں جنرل مک ناٹن نے اپنی تجاویز میں شمالی علاقہ کے انتظامی نظام کو جو اس وقت بھی پاکستان ہی کے ہاتھوں میں تھا علی حالہٖ برقرار رکھنے کی سفارش کر کے اس علاقہ کو عملاً ریاست جموں اور کشمیر سے علحدہ کر کے اس پر پاکستان کے قبضہ

1, S/1453, 2.6.50

کو بحال رکھا تھا۔ اور چوں کہ حکومتِ ہند کے لئے کسی ایسی تجویز کو منظور کرنا ممکن نہیں ہو سکتا تھا جس میں اصل قرارداد سے کھلا ہوا انحراف کیا گیا ہو اس لئے اس نے ان تجاویز میں یہ ترمیمات پیش کیں کہ۔۔۔ صرف (نام نہاد) آزاد کشمیر ہی کو منتشر کیا جانا چاہئے اور شمالی علاقہ کے دفاع اور انتظام کے حقوق علی الترتیب حکومتِ ہند اور ریاست جموّں اور کشمیر کی حکومت ہی کو حاصل ہونے چاہئیں۔

اس طرح اگرچہ جنرل مک ناٹن کی مساعی مصالحت بھی ناکام ہوگئی تھیں۔ لیکن مجلس تحفظ نے ۱۴ مارچ ۱۹۵۰ء کو برطانیہ، متحدہ امریکہ، کیوبا اور ناروے کی تحریک پر جو قرارداد منظور کی تھی وہ جنرل مک ناٹن کی مذکورہ بالا تجاویز ہی پر مبنی تھی اور اس قرارداد کا مفہوم یہ تھا کہ

> ان تجاویز کی روشنی میں ریاست سے پانچ ماہ کی مدت میں افواج کے انخلا کا منصوبہ بنایا اور اس پر عمل درآمد کیا جائے اور اگر ان تجاویز میں کوئی ترمیم مقصود ہو تو اُسے فریقین کی رضامندی سے کر لیا جائے۔ کمیشن اور جنرل مک ناٹن کی سفارشات کے مطابق مصالحت کرانے اور افواج کے انخلا کے منصوبہ پر عمل درآمد کرانے کے لئے ایک شخص کا تقرر کیا جائے اور اُسے اس بات کا اختیار دیا جائے کہ اگر وہ اس مسئلہ کو حل کرنے کے لئے کسی اور تجویز کو مناسب سمجھے تو اس سے دونوں حکومتوں یا مجلس تحفظ کو مطلع کر دے[1]

اور اس قرارداد کے محرکین نے اس کے مقاصد کی تشریح کرتے ہوئے بتایا تھا کہ۔

> ریاست کو افواج سے خالی کرانے کے پروگرام کو ایک ہی سمجھا جانا چاہئے۔ (یعنی اس کے کسی حصہ کو ترک نہیں کیا جا سکتا) اور اس پر ایک ہی وقت عمل درآمد کیا جانا چاہیئے۔ اسے ریاست میں موجود تمام افواج پر حاوی ہونا چاہیئے اور اسے ریاست کے تمام علاقوں پر نافذ کیا جانا چاہیئے[2]

---

1. S/1461, 24.2.50
2. S/P V 469 3.8.50

مجلس تحفظ کی مذکورہ بالا قرارداد پر تبصرہ کرتے ہوئے مائیکل بریچر نے لکھا ہے کہ:۔

اس قرارداد پر پاکستان کا اطمینان غیر فطری نہیں تھا کیوں کہ مک ناٹن کی تجاویز میں جن پر یہ قرارداد مبنی تھی کشمیر کے تنازعہ میں ہندوستان کے ساتھ اس کے مساوی فریق ہونے کے دعویٰ اور مطالبہ کو پہلے سے زیادہ واضح طور پر تسلیم کیا گیا تھا۔ مزید برآں کمیشن کی سابقہ قراردادوں کے برعکس ۱۴ مارچ ۱۹۵۰ء کی قرارداد میں دونوں ملکوں کی افواج کے بیک وقت اور (نام نہاد) آزاد کشمیر کی فوجوں کے ساتھ حکومت کشمیر کی فوجوں کو منتشر کرنے کی تجویز بھی کی گئی تھی [1]

اور اس قرارداد نیز اس کے محرکین کی تشریحات کے پیش نظر ہندوستان کی طرف سے اسے منظور کرلئے جانے کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی۔ چناں چہ ہندوستان کے مندوب سر بنیگل راؤ نے ۱۴ مارچ ہی کو اس بات کا اعلان کر دیا تھا کہ —— ہندوستان نے چوں کہ جنرل مک ناٹن کی تجاویز کو منظور نہیں کیا اس لئے وہ ان تجاویز پر مبنی قرارداد کو بھی منظور نہیں کرسکتا لیکن وہ کمیشن کی جگہ مصالحت کرانے کیلئے کسی ایک شخص کے تقرر کو منظور کرتا ہے اور مجلس تحفظ کی اسی قرارداد کی بنا پر ۱۲ اپریل ۱۹۵۰ء کو کمیشن کی جگہ اقوام متحدہ کی طرف سے کشمیر کے تنازعہ میں مصالحت کرانے کے لئے آسٹریلیا کے ایک جج سر اوون ڈکسن کا تقرر عمل میں آیا تھا۔

ہندوستان میں مجلس تحفظ کی مذکورہ بالا قرارداد کا جو ردعمل ظاہر ہوا تھا اس کا اندازہ ٹائمز آف انڈیا کے ان الفاظ سے بخوبی کیا جاسکتا ہے کہ

مک ناٹن کی ناکامی کا سبب یہ ہے کہ کمیشن کی طرح انھوں نے بھی اس مسئلہ کے بنیادی، اخلاقی اور قانونی پہلوؤں کو نظرانداز کر دیا تھا [2]

---

1. The Struggle for Kashmir, P.108
2. The Times of India 9.2.50

لیکن کشمیر میں اس کا ردِّ عمل باقی ماندہ ہندوستان سے کہیں زیادہ شدید اور تلخ تھا چنانچہ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے اس وقت کے نائب وزیرِ اعظم بخشی غلام محمد نے ۲۷ فروری ۱۹۵۰ء کو کہا تھا کہ :-

اقوامِ متحدہ پر ہمیں جو اعتماد تھا وہ متزلزل ہو گیا ہے ..... اور جب تک ایک کشمیری بھی زندہ ہے مک ناٹن کی تجاویز منظور نہیں کی جا سکتیں۔[1]

بہر حال اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے لئے سر آون ڈکسن ۲۷ مئی ۱۹۵۰ء کو برصغیر ہندوستان میں آئے اور تقریباً تین ماہ تک مصالحت کی جدوجہد کرتے رہنے کے بعد ۲۲ اگست کو انھیں کھلے طور پر اس بات کا اعتراف کر لینا پڑا کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ اپنی ان ہی مساعیِ مصالحت کے دوران میں موصوف نے ۲۰ جولائی ۱۹۵۰ء کو دہلی میں ہند اور پاکستان کے وزرائے اعظم کی ایک کانفرنس بھی منعقد کی تھی جس میں انھوں نے نہایت صفائی کے ساتھ کہا تھا کہ :-

اس بات کے اسباب و حالات میں اُلجھنے کے بغیر کہ کشمیر پر حملہ کیوں ہوا میرا نظریہ یہ ہے کہ جب حملہ آور عناصر نے ریاست جموں اور کشمیر کی سرحد کو عبور کیا تھا تو ان کا یہ فعل بین اقوامی قانون کے خلاف تھا... اور جب مئی ۱۹۴۸ء میں پاکستان کی باقاعدہ افواج ریاست کے علاقہ میں داخل ہوئی تھیں تو ان کا یہ عمل بھی بین اقوامی قانون کے مطابق نہیں تھا۔[2]

اس طرح اقوامِ متحدہ کے نمائندہ کی حیثیت سے سر آون ڈکسن نے ۱۹۵۰ء کے وسط میں یہ بات تسلیم کر لی تھی کہ ریاست پر قبائلیوں کا حملہ اور وہاں باقاعدہ پاکستانی افواج کا داخلہ دونوں بین اقوامی قانون کے خلاف تھے۔ اور ہندوستان کے دعویٰ کا ایک بنیادی جزو بھی یہی تھا کہ پنڈت جواہر لال

---

1. The Hindustan Times, 1.3.50

2. S/1191, 15.9.50.

نہرو نے نومبر ۱۹۴۷ء میں قبائلی حملہ پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا تھا کہ

کیا یہ حملہ بین اقوامی قانون کی خلاف ورزی نہیں ہے [1]

لیکن جس طرح مجلس تحفظ نے ۱۹۴۸ء میں ہندوستان کے دعوی کے اس بنیادی جزو کو نظر انداز کر دیا تھا اسی طرح ۱۹۵۰ء میں سر آون ڈکسن کے مذکورہ بالا اعتراف کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا اور انھوں نے ریاست جموں اور کشمیر سے افواج کے انخلا کی جو تجاویز پیش کیں ان میں بھی ہندوستان اور ریاست جموں اور کشمیر کی حکومتوں کو ان کے بعض حقوق اور مسلّمہ اختیارات سے محروم رکھا گیا تھا۔ سر آون ڈکسن نے جو تجاویز پیش کیں ان میں ریاست سے افواج کی واپسی کے متعلق کہا گیا تھا کہ:۔

چوں کہ پاکستان ابتدائی جرم کا مرتکب ہوا ہے اس لئے پہلے اسے ہی اپنی افواج کو واپس بلانا چاہیئے۔ اس کے بعد ہندوستانی افواج کی واپسی عمل میں آئے گی؛ اور (نام نہاد) آزاد کشمیر نیز حکومت کشمیر کی افواج کو غیر مسلح اور منتشر کیا جائے گا۔۔۔ شمالی علاقہ میں اقوام متحدہ کی طرف سے "پولیٹیکل ایجنٹ" مقرر کر کے انھیں نظم ونسق کے تمام تر اختیارات دے دئے جائیں۔۔۔۔ (نام نہاد) آزاد کشمیر کے علاقہ میں ہر ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے ساتھ اقوام متحدہ کا ایک افسر وابستہ رہے گا۔ اس افسر کو نگرانی کرنے کے اختیارات دئے جائیں گے اور انتظامات اکتوبر ۱۹۴۷ء سے پہلے کی انتظامی بنیاد پر کئے جائیں گے۔۔۔۔ کشمیر میں اس بات کا اطمینان حاصل کرنے کے لئے کہ وہاں کی حکومت استصواب رائے عامہ کی آزادی میں مداخلت نہیں کرے گی۔ ہر ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے ساتھ اقوام متحدہ کا ایک افسر منسلک کیا جائے گا۔ لیکن (نام نہاد) آزاد کشمیر میں مقرر کئے جانے والے ایسے افسروں کے برعکس کشمیر میں متعین کئے جانے

---

1. Independence and After P.59

والے افسروں کو نگرانی، معائنہ، احتجاج و اعتراض اور شکایت کرنے کے اختیارات بھی حاصل ہوں گے اور ان افسروں کی تحریری اجازت حاصل کئے بغیر کشمیر کی حکومت کوئی گرفتاری عمل میں نہ لا سکے گی۔[1]

ریاست جموں و کشمیر کے متعلق ابتدا ہی سے پاکستان کا جو رویہ رہا تھا اگر اس میں سے جنوری ۱۹۴۸ء سے پہلے کے واقعات کو نظر انداز بھی کر دیا جائے تو بھی ان حقائق سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس نے مئی ۱۹۴۸ء میں اقوامِ متحدہ کی ممانعت کے باوجود، خود اپنے اعتراف کے مطابق اپنی باقاعدہ افواج کو وہاں بھیج دیا تھا اور پھر جنگ بندی کے بعد ۱۳ اگست ۱۹۴۸ء نیز ۵ جنوری ۱۹۴۹ء کی قراردادوں کے الفاظ اور مفہوم کے برعکس اس نے (نام نہاد) آزاد کشمیر کی افواج کو ایک زبردست فوجی قوت بنا دیا تھا۔ حتیٰ کہ کمیشن نے بھی اس بات کا اعتراف کیا تھا کہ —اس حال میں خصوصیت کے ساتھ ہندوستانی افواج کے انخلا کا سوال بہت ہی پیچیدہ ہو گیا ہے — اس لئے جہاں تک افواج کی واپسی کا تعلق ہے ہندوستان اس مرحلہ پر اس وقت تک کسی تجویز کو منظور کرنے کے لئے تیار نہیں ہو سکتا تھا جب تک اسے اس بات کا یقین نہیں دلا دیا جاتا ہے کہ اس کی بیشتر افواج کی واپسی کے بعد پاکستان از سرِ نو ریاست پر حملہ نہیں کر دے گا اور چونکہ اس وقت تک اقوامِ متحدہ کی طرف سے پاکستان کے تمام تر جارحانہ اقدامات اور اس کی خلاف ورزیوں کو نظر انداز کیا جاتا رہا تھا اور تمام تر سابقہ یقین دہانیوں کو پسِ پشت ڈالا جاتا رہا تھا اس لئے اس نے ریاست سے افواج کے انخلا کی اس تجویز کو نا منظور کر دیا اور جہاں تک ریاست کشمیر کی افواج کو منتشر کرنے کے سوال کا تعلق تھا اس نے صاف الفاظ میں کہہ دیا کہ صرف حکومت ہی اپنی افواج کو منتشر کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ کر سکتی ہے۔

شمالی علاقہ کے متعلق حکومتِ ہند اپنے اس سابقہ فیصلہ پر قائم رہی ہے کہ اسے اس

---

[1] S 1791, 15.9.50 (Dixon Report)

علاقہ کے دفاع کے لئے اپنی افواج کو وہاں متعین رکھنے کا حق حاصل ہونا چاہیئے اور اگر اس معاملہ میں پاکستان سے مشورہ کیا جائے گا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اسے اس علاقہ میں رہنے کا حق حاصل ہے۔

نام نہاد آزاد کشمیر میں تمام تر انتظامات کو اقوام متحدہ کے افسروں کی نگرانی میں مجسٹریٹوں کے حوالہ کر دینے کا مطلب اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہو سکتا تھا کہ ہندوستان ریاست کے اس حصہ سے متعلق اپنے قانونی حق سے دست بردار ہو جائے۔ لیکن ہندوستان اس حق سے دستبردار نہیں ہو سکتا تھا۔ اور جہاں تک ریاست جموں اور کشمیر میں اقوام متحدہ کے افسروں کے تقرر اور ان کو وسیع اختیارات دینے کا تعلق تھا حکومت ہند، جموں اور کشمیر کی قانونی حکومت کے حقوق اور اختیارات میں اس کھلی ہوئی تخفیف اور مداخلت کی اجازت نہیں دے سکتی تھی۔ اس لئے سر ڈکسن کی تجویز کے اس حصہ کو بھی منظور نہیں کیا جا سکتا تھا۔

اپنی ان تجاویز کی ناکامیابی کے بعد سر آون ڈکسن نے یہ تجویز پیش کی کہ استصواب رائے کے دوران میں پوری ریاست کے لئے ایک متحدہ حکومت بنا دی جائے۔ اس تجویز میں جو تین متبادل صورتیں پیش کی گئی تھیں وہ یہ تھیں کہ

(الف) ایسی مشترکہ حکومت قائم کی جائے جس کی کابینہ میں، کشمیر کے دونوں حصوں کے نمائندے مساوی تعداد میں شامل ہوں۔ یا

(ب) ایسی غیر سیاسی حکومت قائم کی جائے جو غیر معتمد علیہ، افراد پر مشتمل ہو اس میں مسلمانوں اور ہندوؤں کو مساوی نمائندگی دی جائے۔ اور اس کا چیئرمین اقوام متحدہ کی طرف سے مقرر کیا جائے۔ یا پھر

(ج) ایسی غیر سیاسی حکومت قائم کی جائے جو تمام اقوام متحدہ کے نمائندوں ہی پر مشتمل ہو[1]۔

---

1. S/1791, 15.9.50 (Dixon Report)

لیکن ان تینوں متبادل صورتوں میں بھی ریاست جموں اور کشمیر میں ہندوستانی اور ریاست کی جائز حکومت کے حقوق اور اختیارات کو نہ صرف کم ہی کم کر دیا گیا تھا بلکہ اسے پاکستان کی سطح پر بھی لا کھڑا کیا تھا اور ہندوستان اپنے بنیادی موقف سے ہٹ کر ان میں سے کسی صورت کو بھی منظور نہیں کر سکتا تھا۔ اپنی اس کوشش میں بھی ناکامیاب ہو جانے کے بعد سر ڈکسن نے آخری تجویز یہ پیش کی تھی کہ ریاست کے جن حصوں کے باشندوں کی خواہشات واضح اور معلوم ہیں انہیں استصواب رائے کے بغیر ہندوستان اور پاکستان کے ساتھ الحاق کی اجازت دے دی جائے اور باقی ماندہ حصوں میں استصواب رائے کرا لیا جائے۔ اور چونکہ اس تجویز میں دونوں ملکوں میں سے کسی ایک ملک کے حقوق میں بھی مداخلت نہیں کی گئی تھی اور اس میں عوام کی خواہشات کو مدنظر رکھا گیا تھا اس لئے اس بات کو جانتے ہوئے بھی کہ اگر پوری ریاست میں الحاق کے سوال پر بحیثیت مجموعی استصواب رائے کیا جائے گا تو اس کا نتیجہ ہندوستان ہی کے حق میں برآمد ہوگا۔ ہندوستان اس تجویز کو منظور کرنے پر آمادہ ہو گیا تھا لیکن پاکستان نے اسے مسترد کر دیا تھا۔ اور اس طرح ۲۲ اگست ۱۹۵۰ء کو سر اوون ڈکسن یہ اعلان کرنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ کہ وہ اپنا مقصد حاصل کرنے میں بالکل ناکام ہو گئے ہیں۔

سر اوون ڈکسن کی کوششوں کی ناکامی کا پاکستان میں جو رد عمل ظاہر ہوا تھا یہاں اس کا تذکرہ کر دینا اس لئے ضروری ہے کہ اس سے ایک مرتبہ پھر کشمیر کے متعلق پاکستان کے ارباب اختیار کی حقیقی ذہنیت پر روشنی پڑتی ہے۔ اس سلسلہ میں پاکستان کے سابق گورنر جنرل اور وزیر اعظم خواجہ ناظم الدین نے ۱۸ ستمبر ۱۹۵۰ء کو گلگت میں ایک تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ:۔

> کشمیر کی آزادی کا معاملہ ہر پاکستانی کے لئے بنیادی عقیدہ کی حیثیت رکھتا ہے یہ پاکستان کی قرار داد کا ایک لاینفک جزو ہے اور جب تک پورا کشمیر آزاد نہیں ہو جائے گا پاکستان غیر مکمل رہے گا۔[1]

---

1. The Struggle for Kashmir P.111

اور ۲۷ ستمبر ۱۹۵۰ء کو صوبہ سرحد کے وزیر اعظم عبدالقیوم خاں نے اسمبلی میں اعلان کیا تھا کہ:۔

اگر ہندوستان آزادانہ استصواب رائے پر رضامند نہ ہوا تو جنگ کے علاوہ اور کوئی چارہ کار باقی نہیں رہے گا۔ اور صوبہ سرحد نیز پاکستان کی مرکزی حکومت، دونوں پاکستان کے باشندوں کی خواہشات کا احترام کریں گی [1]

اور ۵ اکتوبر ۱۹۵۰ء کو پاکستان کی مرکزی اسمبلی میں کشمیر پر بحث کے دوران میں وزیر اعظم لیاقت علی خان مرحوم نے کہا تھا کہ:۔

پاکستان کے لئے کشمیر ایک اہم ضرورت کی حیثیت رکھتا ہے [2]

اس اجلاس میں مشرقی پاکستان کی مسلم لیگ کے صدر نے کہا تھا کہ:۔

آخری دلیل تلوار ہے [3]

اور پھر تقریباً ڈیڑھ ماہ کے بعد سردار محمد ابراہیم خاں نے کہا تھا کہ اب کشمیر کے مسئلہ کا واحد حل اس بات میں پوشیدہ ہے کہ ہم جنگ آزادی کو از سر نو شروع کر دیں [4]

پاکستان کے ذمہ دار سرکاری اور غیر سرکاری افراد کے مذکورہ بالا بیانات سے ۱۹۵۰ء کے اواخر میں ایک مرتبہ پھر یہ بات واضح ہو گئی تھی کہ پاکستان کی رائے میں ریاست جموں اور کشمیر کے مسئلہ کا اس کے علاوہ اور کوئی حل نہیں ہے کہ یہ ریاست اس کے ساتھ ملحق ہو جائے اور اس نے اس وقت تک اقوام متحدہ کی جو کھلی ہوئی خلاف ورزیاں کی تھیں اور وہ اس مسئلہ کے حل کی مختلف مناسب تجاویز کو قبول کرنے یا قبول کر لینے کے بعد ان سے جو انحراف کرتا رہا تھا اس کا سبب بھی یہی تھا کہ وہ کسی دلیل اور فیصلہ کے بغیر ریاست جموں اور کشمیر کو اپنا ایک جزو لاینفک یقین کرتا تھا۔

1. The Civil & Military Gazette . 30.9.50
2. The Struggle for Kashmir P.111
3. The Dawn 6.10.50
4 The Civil & Military Gazette. 27.11.50

ڈکسن رپورٹ کے متعلق ہندوستان کا جو نظریہ رہا تھا اسے اگست ۱۹۵۰ء کے اواخر میں ہند یونین کے وزیراعظم پنڈت جواہرلال نہرو نے ان الفاظ میں واضح کیا تھا کہ:-

صرف پاکستان کی خوشنودی کے لئے، کشمیر کی موجودہ حکومت کو نکال باہر کرنے کی تجویز دراصل حملہ آور کو مطمئن کرنے اور اس کی ہمت بڑھانے کی تجویز تھی اور اس کا مطلب یہ تھا کہ آپ حملہ آور کی کامیابی کے خواہش مند ہیں... درحقیقت میرے نزدیک یہ طریق کار اس سوال کو حل کرنے کے سلسلہ میں غیر معمولی طور پر غیر منطقی ہے اور جہاں تک حکومت ہند کا تعلق ہے، خواہ نتائج کچھ ہی کیوں نہ ہوں اس کے لئے اسے منظور کرنا ناممکن ہے۔ اور یہاں یہ معاملہ ختم ہو جاتا ہے[1]

اور اس مرحلہ پر یہ بتا دینا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اقوام متحدہ کے اس غیر منطقی طریق کار کا ہندوستان پر جو ردعمل ظاہر ہوا تھا اس کے متعلق دنیا کے ہوش مند اور حقیقت پسند حلقوں کی رائے کیا تھی۔ چنانچہ اس پر اظہار خیال کرتے ہوئے مائیکل بریچر نے لکھا ہے کہ اس رپورٹ کے متعلق

پاکستان کے مقابلہ میں ہندوستان کی بے اطمینانی زیادہ واضح تھی جس کا سبب یہ تھا کہ ہندوستان کی نظر میں کوریا کا مسئلہ، کشمیر کے مسئلہ کے عین مطابق تھا۔ جس طرح شمالی کوریا کو، جمہوریہ کوریا پر جارحانہ حملہ کرنے کا ملزم گردانا گیا تھا بالکل اسی طرح ہندوستان نے بھی پاکستان کے خلاف کشمیر پر حملہ کرنے کا الزام عائد کیا تھا۔ لیکن اقوام متحدہ کے اقدام کے متعلق ہندوستان کی درخواست کے سلسلہ میں جارحانہ حملہ کے پہلو پر بہت کم توجہ دی گئی تھی۔ اس کے برعکس ہند اور پاکستان کے تعلقات کے ان دوسرے پہلوؤں پر زور دیا گیا تھا جنھیں ہندوستان، زیر بحث مسئلہ سے بالکل

---

1. The Hindustan Times 25.8.50

غیر متعلق سمجھتا تھا لیکن (دونوں ایک ہی جیسے مسائل میں اقوام متحدہ کے عمل کا تضاد یہ تھا کہ کوریا کے معاملہ میں اس نے فوری قدم اٹھایا تھا اور ۴۸ گھنٹوں کے اندر اندر فوجی کارروائی کرنے کی قرارداد منظور کر دی تھی [1]

مختصر یہ کہ اگرچہ اقوام متحدہ نے ابتدا ہی سے ہندوستان کی حقیقی شکایت کو نظر انداز کرتے رہنے کی حکمت عملی اختیار کی تھی لیکن سر آون ڈکسن نے قبائلیوں کے حملہ اور پاکستان کی باقاعدہ افواج کے ریاست میں داخلہ کو بین اقوامی قانون کی صریح خلاف ورزی قرار دے کر اس حقیقت کی تصدیق کر دی تھی کہ پاکستان، کشمیر پر جارحانہ حملہ کا مجرم ہے اور اس وقت کم از کم اقوام متحدہ سے اس امر کی توقع کی جاتی تھی کہ وہ کشمیر کے تنازعہ سے متعلق اپنی حکمت عملی پر نظر ثانی کریں گی لیکن جب ہندوستان نے دیکھا کہ خود سر آون ڈکسن کی تجاویز میں بھی جارح اور مجروح کے درمیان کوئی فرق اور امتیاز روا نہیں رکھا گیا ہے حتیٰ کہ ان تجاویز میں بعض ایسے اجزاء بھی شامل ہیں جن کی شمولیت کا مقصد پاکستان کو خوش کرنا اور جارحانہ حملہ آور کی ہمت بڑھانا ہے تو اس کے پاس انھیں مسترد کر دینے کے علاوہ کوئی چارۂ کار نہیں تھا۔

---

1. The Sruggle for Kasmir.
P.113

گیارھواں باب

گراہم مشن

گذشتہ باب میں بتایا جا چکا ہے کہ سر آون ڈکسن نے اپنی رپورٹ میں تقسیم اور استصواب رائے کے تصور پر مبنی ایک نئی تجویز بھی پیش کی تھی اور یہ کہ کشمیر میں سر ڈکسن کی مجموعی تجاویز کے خلاف شدید ردِ عمل ظاہر ہوا تھا اور گذشتہ صفحات کے مطالعہ سے یہ بات بھی واضح ہو چکی ہے کہ حکومت ہند نے مہاراجہ ہری سنگھ کی اس درخواستِ الحاق کو جسے کشمیر کے عوامی رہنماؤں اور عوام کی کامل تائید اور حمایت حاصل تھی اس شرط پر منظور کیا تھا کہ حالات کے اعتدال پر آ جانے اور ریاست میں امن اور قانون بحال ہو جانے کے بعد الحاق کا آخری فیصلہ استصواب رائے سے کرایا جائے گا اور حکومت ہند کے اس فیصلہ کا صاف مطلب یہ تھا کہ جب تک کشمیر کے باشندے خود کثرت رائے سے اس فیصلہ کو تبدیل نہیں کریں گے یہ فیصلہ اپنی جگہ مکمل سمجھا جائے گا اور اس فیصلہ کو تبدیل کر دینے یا اس پر قائم رہنے اور اسے مستحکم بنانے کے سلسلہ میں ریاست کے باشندے اپنی سرگرمیوں میں پوری طرح آزاد رہیں گے۔ اور یہاں اس امر کے اعادہ کی ضرورت بھی محسوس نہیں ہوتی کہ کشمیر کا قضیہ ۱۹۴۷ء کے اواخر میں شروع ہوا تھا اور کشمیر کے باشندوں کے لئے یہ صورتِ حال بے چینی کی موجب بنتی جا رہی تھی۔

اس صورتِ حال کے متعلق خود کشمیر کے باشندوں کے احساسات کا اندازہ اس وقت کے نائب وزیراعظم بخشی غلام محمد کے ان الفاظ سے بخوبی کیا جاسکتا ہے کہ :۔

مجلس تحفظ، الحاق کے سوال کا کوئی مناسب حل تلاش کرنے میں جو غیر ضروری تاخیر روا رکھ رہی تھی اس کی وجہ سے ریاست کی اقتصادی اور سماجی ترقی مسدود ہو کر رہ گئی تھی اور اس حال میں جب کہ باقی ماندہ ہندوستان میں عوام جمہوریت کی تعمیر کی راہ پر گامزن تھے ریاست (جموں اور کشمیر) نہ صرف شدید بحث و مباحثہ کا موضوع ہی بنی ہوئی تھی بلکہ اس کے باشندے اپنی ترقی کے راستوں کو بند بھی پاتے تھے [1]

حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان نے جب کشمیر کے سوال کو ادارہ اقوام متحدہ میں پیش کیا تھا تو نیشنل کانفرنس اور ریاست کے باشندوں کی اکثریت نے ہندوستان کے اس اقدام پر اس وجہ سے اطمینان محسوس کیا تھا کہ اس طرح انھیں ہندوستان کے ساتھ ریاست کے الحاق کی توثیق اور تصدیق کا ایک موقع مل جائے گا۔ چناں چہ اکتوبر ۱۹۴۸ء کے آغاز میں، نیشنل کانفرنس کا جو خصوصی کنونشن منعقد ہوا تھا اس میں منظور کردہ ایک قرار داد میں کہا گیا تھا کہ :۔

اس لئے ان حالات میں یہ کنونشن، ہندوستان کے، ریاست کے عارضی الحاق کی توثیق کرتا ہے۔ مزید براں اس بات کا عہد کرتا ہے کہ وہ نیا کشمیر [2] کی بنیاد پر ہندوستان کے ساتھ قطعی الحاق کی پوری طرح حمایت کرے گا ہم (کنونشن میں شریک ہونے والے)

1. Kashmir Decides its Destiny P.3

[2] آل جموں اور کشمیر نیشنل کانفرنس کا وہ منصوبہ جس میں ریاست کے دستوری، سیاسی، اقتصادی سماجی اور تعمیری نصب العین کا تعین کیا گیا ہے۔

اس منصوبہ (یا کشمیر) کی تکمیل اور تعمیل کو اپنا مقدم ترین فریضہ سمجھتے ہیں۔ اس کنونشن
کو کامل توقع ہے کہ ہندوستان کی حکومت اور عوام، کشمیر کے باشندوں کو ان کے اس
فریضہ کی تکمیل اور ان کی سیاسی اور اقتصادی آزادی کے نصب العین کے حصول میں
ہر ممکن مادی، اخلاقی اور سیاسی امداد دیں گے۔[1]

اور اس کنونشن کے فوراً بعد ہی شیخ عبداللہ نے جنھیں اس وقت کشمیری عوام کا اعتماد حاصل
تھا اور جو اس زمانہ میں باشندگان کشمیر کی صحیح نمائندگی اور رہنمائی کر رہے تھے عید سعید کے موقع
پر سری نگر میں ایک مجمع عام کو خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ :۔

ہماری نیشنل کانفرنس کے خصوصی کنونشن نے جو فیصلہ کیا ہے وہ ان شدائد
اور مصائب کا جو کشمیر کے امن پسند اور بے گناہ باشندے ایک سال سے پاکستانی
فوج کے ہاتھوں برداشت کرتے رہے ہیں منطقی نتیجہ تھا۔ میں نے پچھلے سال
پنڈت نہرو کے سامنے اس بات کا جو عہد کیا تھا کہ کشمیر ہندوستان کا ایک حصہ
ہوگا۔ میرا وہ عہد اب دائمی رشتہ میں بدل چکا ہے۔ ہم ریاست کی تاریخ کے
نازک ترین دور میں، ہندوستانی فوج اور عوام کی طرف سے ملنے والی امداد کو
کبھی بھی فراموش نہیں کر سکتے۔ ہندوستانی سپاہی، مقامی باشندوں کو بھوکوں مرنے
سے بچانے کے لئے انھیں اپنا راشن بھی دیتے رہے ہیں۔ یہ فیصلہ ایک سال
تک ہندوستان کے طرز عمل کا اچھی طرح تجربہ کرتے رہنے کے بعد کیا گیا ہے۔
اور یہ ایک ایسا فیصلہ ہے جو ریاست کی تمام تر آبادی کے مستقبل پر ہمیشہ اثر انداز
رہے گا۔ ہندوستان کے ساتھ ہمارے الحاق کا فیصلہ اس حقیقت پر مبنی ہے
کہ ہندوستان جس حکمت عملی اور لائحہ عمل پر کاربند ہے ہماری پالیسی اور رہنما

---

1. Kashmir Decides its Destiny P.3

پروگرام بھی اس کے عین مطابق ہے..... ہم اپنے اس فیصلہ پر اس لئے بھی خوش ہیں کہ یہ اسلام کے اصول کے مطابق بھی ہے [1]

بہر حال ان اقتباسات سے جہاں یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ریاست جموں اور کشمیر کی نمائندہ قومی جماعت " نیشنل کانفرنس " اپنی جگہ ایک طرف تو ہندوستان کے ساتھ ریاست کے الحاق کو قطعی اور آخری سمجھتی تھی اور دوسری طرف اس نے مجلس تحفظ میں کشمیر کے سوال کو پیش کئے جانے کا اس بناء پر خیر مقدم کیا تھا کہ اس طرح اس کے فیصلۂ الحاق پر اقوام متحدہ کی مہر تصدیق بھی ثبت ہو سکے گی۔ لیکن جب اسے یہ بات محسوس ہونے لگی کہ مجلس تحفظ اس سوال کو باشندگان کشمیر کی خواہش کے مطابق طے کرنے میں غیر معمولی تاخیر سے کام لے رہی ہے اور اس تاخیر کے باوجود اس کے منصفانہ حل کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تو اس کے صبر کا پیمانہ بھی لبریز ہو گیا چنانچہ شیخ محمد عبداللہ نے نیشنل کانفرنس کے انیسویں اجلاس کو خطاب کرتے ہوئے اس صورت حال پر ان الفاظ میں تبصرہ کیا تھا کہ:-

> اقوام متحدہ کے منشور (چارٹر) میں قوموں کی بنیادی آزادی کے اعلان کے فوراً ہی بعد، ہمارے وطن کو بلا وجہ وحشیانہ حملے کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ ہم نے اس جارحانہ حملہ کے ازالہ اور انسداد کے لئے، جس کی بدولت ریاست کے ہزارہا بے گناہ باشندوں کو ناقابل بیان مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا ہے، ادارۂ اقوام متحدہ کو توجہ دلائی تھی لیکن ہماری امداد اور اعانت کی یہ درخواست بے نتیجہ ثابت ہوئی اور ہمیں یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ جارحانہ حملہ آور کے خلاف واضح فیصلہ صادر کرنے کی بجائے، ہندوستان اور ہم سے ہمارے حقوق کے جواز کا ثبوت طلب کیا جا رہا ہے۔ منشور کے بنیادی اصول کو نافذ کرنے سے اس انکار کی بدولت ادارۂ اقوام متحدہ

1. The Hindustan Times 16.10.48

کشمیر کے مسئلہ کا کوئی پُرامن حل دریافت کرنے کی کوششوں میں بھی برابر ناکام ہوتا رہا ہے اور مجلس تحفّظ ریاست کے مستقبل کے سوال کو عوام کی خواہشات کے مطابق طے کرانے کے نام پر ایسے عجیب اور حیرت انگیز طریقے اختیار کرتی رہی ہے جنھیں الحاق کے بنیادی سوال کے ساتھ دُور کا تعلق بھی نہیں تھا۔ ہم کامل اخلاص اور ایمانداری کے ساتھ بار بار یہ کہتے رہے ہیں کہ چوں کہ ریاست کے باشندوں کے مستقبل کا سوال صرف ان ہی سے تعلق رکھتا ہے۔ اس لئے اس اہم ترین سوال پر انھیں اظہارِ خیال کا موقع دیا جائے اور اس کے لئے ہم نے تجویز کیا تھا کہ ریاست میں ایسے حالات بحال کئے جائیں جو حملہ سے پہلے موجود تھے اور اس کی موثر ضمانت دی جائے کہ آئندہ ریاست پر کوئی جارحانہ حملہ نہیں ہوگا۔ معاملہ کی حقیقی صورت یہ تھی اور مجلس تحفّظ اس بنیادی تجویز کو مان لیتی تو اس تنازعہ کا پُرامن طریقہ پر تصفیہ ہو گیا ہوتا۔ لیکن مجلسِ تحفّظ نے حملہ آور کے دعووں کو مان کر اسے اس جارحانہ حملہ کے پھل کھانے کے لئے آزاد چھوڑ دیا۔ ان حالات میں استصوابِ رائے، آزادانہ اور غیر جانبدارانہ استصوابِ رائے کا مذاق اڑانا ہی نہیں بلکہ ریاست کے تحفّظ کے لئے مزید خطرات پیدا کرنے کا موجب بھی ثابت ہوتا[1]

اور اس کے بعد موصوف نے بنگلور میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ :-

"کشمیر اقوامِ متحدہ سے انصاف حاصل کرنے کے لئے تین سال تک صبر کے ساتھ انتظار کرتا رہا لیکن یہ جماعت کشمیر کے ساتھ انصاف کرنے میں کامیاب

---

1. Kashimir Decides its Destiny Pp. 6-7

نہیں ہوئی بلکہ مفاد پسند طاقتوں کو کشمیر کے مسئلہ پر دور افتادہ اور غیر متعلق اثرات ڈالنے کا موقع دیتی رہی۔[1]

یہ ہے ان احساسات کا خلاصہ جو ۱۹۵۰ء کے وسط میں ریاست جموں اور کشمیر کے باشندوں اور ان کے نمائندوں اور رہنماؤں کے ذہنوں میں پیدا ہو رہے تھے اور جن کی شدت میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ چناں چہ ان احساسات کی فضا میں جب ۱۹۵۰ء کے وسط میں سر آون ڈکسن کی تجاویز سامنے آئیں تو ریاست کے باشندوں اور رہنماؤں کو اس بات کا یقین ہو گیا کہ مجلس تحفظ اس مسئلہ کو جس طریقہ پر طے کرنا چاہتی ہے وہ اس طریقہ پر اسے طے کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے گی۔ اور وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ اگرچہ مجلس تحفظ نے اس سوال کو طے کرنے کے لئے عوام کے خود ارادیت کے اصول کو تسلیم کر لیا ہے لیکن وہ اس پر عمل درآمد کے لئے جو طریقے اختیار کرنا چاہتی ہے ان سے نہ صرف تصادم اور بے یقینی ہی کو تقویت ملے گی بلکہ ایشیا کے اس حصہ میں مزید الجھنیں اور نزاکتیں بھی پیدا ہو جائیں گی۔

کشمیر کے باشندوں کی سیاسی نمائندہ تنظیم 'نیشنل کانفرنس' اس صورت حال کو خاموشی کے ساتھ بیٹھی ہوئی نہیں دیکھ سکتی تھی۔ وہ سمجھتی تھی کہ یہ صورت حال ریاست کی سالمیت اور خود مختاری کے لئے ایک عظیم خطرہ ہے اور وہ اس نتیجہ پر پہنچی تھی کہ مجلس تحفظ نے جارحانہ حملہ آور کے ساتھ جو مراعات روا رکھی ہیں ان کے پیش نظر مجلس کے بعض مفاد پسند اراکین سے جو اس معاملہ میں مداخلت کر کے ریاستی باشندوں پر اپنا فیصلہ نافذ کرنا چاہتے ہیں۔ انصاف اور غیر جانبداری کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ چناں چہ

نیشنل کانفرنس نے اس نظریہ کی بناء پر کہ ہندوستان کے ساتھ ریاست کا الحاق قانونی، اخلاقی اور سیاسی لحاظ سے بالکل جائز ہے اور ریاست کے باشندوں کو

---

1. The Hindu [illegible]

کو ان کی سماجی ترقی کے ان مواقع سے محروم نہیں رکھا جاسکتا جو انھیں ہندستان کے جزو لاینفک ہونے کی حیثیت سے حاصل ہونے چاہئیں۔ اس دستور ساز اسمبلی کے سوال پر سنجیدگی کے ساتھ غور کیا جانے لگا جس کا ذکر ہندوستانی آئین اور ریاست کے حکمراں کے اس اعلان مورخہ ۵ مارچ ۱۹۴۹ء میں کیا گیا تھا جس کی بناء پر اختیارات عوام کے نمائندوں کو منتقل کر دئے گئے تھے[1]

چنانچہ اکتوبر ۱۹۵۰ء میں کانفرنس کی جنرل کونسل نے مجلسِ عاملہ کو ہدایت کی تھی کہ وہ جلد از جلد ریاست کی دستور ساز اسمبلی طلب کرے۔

ایک طرف تو کشمیر کے باشندے، ہندوستان کے ساتھ اپنے الحاق کی توثیق نیز استصواب رائے عامہ کے متعلق ہندوستان کی شرط کو پورا کرنے کی تیاریوں میں معروف تھے اور دوسری طرف ابھی مجلسِ تحفظ نے اس رپورٹ پر غور بھی شروع نہیں کیا تھا جو سر ڈکسن نے پیش کی تھی لیکن یہ تعطل فروری ۱۹۵۱ء کے اواخر میں اس وقت ختم ہوا جب اس سلسلہ میں مجلسِ تحفظ کے روبرو، برطانیہ اور متحدہ امریکہ نے ایک ایسی مشترکہ قرارداد پیش کی جس کا مفہوم یہ تھا کہ:-

(الف) اقوامِ متحدہ کی طرف سے، سر ڈکسن کی بجائے مصالحت کرانے والے کسی دوسرے شخص کا تقرر کیا جائے اور اسے ۱۳ اگست ۱۹۴۸ء نیز ۵ جنوری ۱۹۴۹ء کی قراردادوں کی بنیاد پر ریاست سے افواج کے انخلاء کا اہتمام کرانے کی ہدایت کی جائے۔

(ب) اسے ہدایت کی جائے کہ وہ ڈکسن رپورٹ کی سفارشات (ریاست کی تقسیم) اور استصواب رائے کے دوران میں وہاں غیر ملکی افواج کے قیام پر بھی

---

1. Kashmir Decides its Destiny, P.9

غور کرے۔

(ج) اس قرارداد میں ہند اور پاکستان سے کہا گیا تھا کہ اگر مصالحت کرانے والا اپنی کوششوں میں ناکام ہو جائے تو انھیں ۱۳ اگست ۱۹۴۸ء اور ۵ جنوری ۱۹۴۹ء کی قراردادوں کی تشریح اور عمل درآمد کے سلسلہ میں ثالث کے فیصلوں کو تسلیم کر لینا چاہیئے۔ اور

(د) اس بات پر تنقید کی گئی تھی کہ ہندوستان نے کشمیر میں دستور ساز اسمبلی کے قیام کی اجازت دے دی ہے [1]

لیکن یہ امر محتاج تشریح نہیں کہ اس قرارداد میں کوئی ایسی بات نہیں تھی جو اس سے پہلے سامنے نہ آ چکی ہو۔ اور یہ قرارداد بھی ان ہی نظریات پر مبنی تھی جنھیں ہندوستان نے اس وقت تک بھی تسلیم نہیں کیا تھا۔ چناں چہ ہندوستان نے یکم مارچ ۱۹۵۱ء کو یہ قرارداد بھی مسترد کر دی اس موقع پر ہندوستان کی طرف اس خیال کا اظہار کیا گیا تھا کہ:۔

"ریاست آہستہ آہستہ کسی نہ کسی طرز کی منظم زندگی اختیار کرتی جا رہی ہے ایسی حالت میں اگر مجلسِ تحفظ سر ڈکسن کی سفارش پر عمل کرے گی تو اس سے بہت زیادہ نقصان پہنچے گا اس لئے اب اس معاملہ کے فیصلہ کو فریقین ہی پر چھوڑ دیا جانا چاہیئے [2]

اس کے بعد ۲۱ مارچ ۱۹۵۱ء کو مذکورہ بالا قرارداد کے محرکین نے اس میں ترمیم کر کے اسے دوبارہ مجلسِ تحفظ کے روبرو پیش کیا۔ اس ترمیم شدہ قرارداد میں سے استصواب رائے عامہ کے دوران میں ریاست میں غیر ملکی افواج کی موجودگی نیز ریاست کی تقسیم کے شوشوں کو نکال دیا گیا تھا [3]

---

1. S/2017 and S/P.V. 532, 21.2.51
2. S/P.V. 533, 1.3.51
3. S/2017/Rev.I, 21.3.51

لیکن ثالث کے فیصلوں کو تسلیم کرنے کے مشورہ کو عملی عالم بر قرار رکھا گیا تھا۔ یہ ترمیم شدہ قرارداد ۳۰ مارچ ۱۹۵۱ء کو منظور کی گئی تھی لیکن اس پر رائے شماری کے وقت، ہندوستان (جو خود بھی مجلسِ تحفظ کا رُکن تھا) سوویت یونین اور یوگوسلاویہ نے رائے نہیں دی تھی اور یوگوسلاویہ کے نمائندہ نے کہا تھا کہ:۔

یہ طریقِ کار نہ صرف ناکامیاب ہی ثابت ہوگا بلکہ اس وقت افہام و تفہیم کے جو امکانات موجود ہیں انھیں بھی کمزور کر دے گا۔ مناسب یہ ہے کہ سر ڈکسن کی سفارش کے مطابق، اس معاملہ کو طے کرنے کے لئے فریقین ہی کو کوشش کرنے کا موقع دینا چاہیئے اور مجلس تحفظ کو ان کے اختلافات کو کم سے کم کرنے میں ان کی امداد کرتے رہنا چاہیئے [1]

بہر حال پاکستان نے اس قرارداد کو منظور کر لیا تھا اور مائیکل بریچر کے الفاظ میں پاکستان کی اس منظوری کے اسباب یہ تھے کہ:۔

اس میں کشمیر کی مجوزہ دستور ساز اسمبلی کی مذمت کی گئی تھی اور اس کے اس مطالبہ پر بین الاقوامی مہر ثبت کر دی گئی تھی کہ گفت و شنید اور مصالحت کی ناکامی کی صورت میں تمام اختلافی امور کے متعلق ثالث کے فیصلوں کو تسلیم کیا جائے [2]

لیکن ہندوستان نے اس قرارداد کو منظور کرنے سے انکار کر دیا تھا اور ہندوستان کے وزیرِ اعظم نے اسے مسترد کرتے ہوئے کہا تھا کہ:۔

اصل قرارداد، حد درجہ غیر معمولی اور قابلِ اعتراض تھی اور اگرچہ اس کی آخری شکل کسی قدر ترقی یافتہ ضرور ہے لیکن اس میں بھی بعض دفعات (خصوصاً

---

1. S/P.V. 538 and 539, 29/30-3-51

2. The Struggle for Kashmir, P.118

ثالثی سے تعلق رکھنے والی دفعہ) ایسی ہیں جو قطعاً ناقابلِ قبول ہیں [1]

ان حالات میں ۳۰ مارچ ۱۹۵۱ء کی قرارداد کے مطابق اقوامِ متحدہ کے سراوین ڈکسن کی بجائے ڈاکٹر فرینک گراہم کو کشمیر کے تنازعہ کو طے کرانے کے لئے اپنا نمائندہ مقرر کیا اور انہیں یہ ہدایت کی گئی کہ وہ تین ماہ کے بعد اپنی سرگرمیوں کی رپورٹ پیش کریں لیکن ڈاکٹر گراہم ۳۰ جون ۱۹۵۱ء سے پہلے برصغیر نہیں پہنچ سکے۔ لیکن ان کے برصغیر ہند پہنچنے سے پہلے ہی ۳۰ اپریل ۱۹۵۱ء کو یوراج کرن سنگھ کی طرف سے جو اس زمانہ میں اپنے والد مہاراجہ ہری سنگھ کی عدم موجودگی میں ان کے قائم مقام اور سربراہ ریاست تھے۔ ریاست کے لئے دستور ساز اسمبلی کے قیام کا اعلان کیا جا چکا تھا۔

یہاں اس بات کو بھی ذہن نشین کر لینا چاہیئے کہ جس طرح ہندوستان کے ساتھ کشمیر کے الحاق کے وقت اس کے سلسلہ میں ہندوستان کی طرف سے کوئی تحریک نہیں کی گئی تھی اور الحاق کا فیصلہ ریاست کے حکمران نے وہاں کے عوامی رہنماؤں کی تائید اور حمایت سے رضامندانہ اور رضاکارانہ طریقہ پر کیا تھا اسی طرح دستور ساز اسمبلی کے قیام کے فیصلہ میں بھی ہندوستان کو، کوئی دخل حاصل نہیں تھا۔ حتیٰ کہ نومبر ۱۹۵۱ء میں جب مجلس تحفظ میں ڈاکٹر گراہم کی پہلی رپورٹ پر بحث کی جا رہی تھی تو ہندوستان کے وزیرِ اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنے ایک بیان میں اس معاملہ سے متعلق ہندوستان کے موقف کی وضاحت کرتے ہوئے کہا تھا کہ:۔

> ہم نے مجلسِ تحفظ کے روبرو اپنے بیان میں اس بات کو بالکل واضح کر دیا ہے کہ جہاں تک ہمارا تعلق ہے، کشمیر کی مجلس دستور ساز، مجلس تحفظ کے کسی فیصلہ کی راہ میں حائل نہیں ہو سکتی اور وہ فیصلہ اپنی جگہ برقرار رہے گا [2]

---

1. The Hindustan Times, 3.4.51

2. Two Nations and Kashmir P. 107

لیکن ہندوستان چوں کہ ابتدا ہی سے کشمیر کے باشندوں کے حق خود ارادیت کو تسلیم کرتا رہا ہے اس لئے وہ ریاستی باشندوں کی جائز سیاسی سرگرمیوں پر کسی مرحلہ میں بھی کوئی پابندی عائد نہیں کر سکتا تھا۔ بہر حال ان حالات میں کہ ہندوستان نے ۳۰ مارچ ۱۹۵۱ء کی قرار داد کو مسترد کر دیا اور کشمیر کے باشندوں نے بے یقینی اور تذبذب کی حالت سے نجات حاصل کرنے کے لئے نہ صرف مجلس دستور ساز طلب کرنے کا فیصلہ ہی کر لیا تھا بلکہ انھوں نے ستمبر ۱۹۵۱ء میں اس کے انتخابات بھی کر لئے تھے، ڈاکٹر گراہم نے برصغیر ہند پہنچنے کے بعد اکتوبر ۱۹۵۱ء میں اپنی پہلی رپورٹ پیش کی۔

ڈاکٹر گراہم نے اپنی رپورٹ میں، ریاست جموں اور کشمیر سے افواج کے انخلاء کی تجویز کو ہند اور پاکستان کے ایک معاہدہ کی صورت میں پیش کیا تھا۔ اس تجویز پر بیک وقت اور مسلسل عمل درآمد کو ضروری قرار دیا تھا اور اس کی تعمیل و تکمیل کے لئے ۹۰ دن کی مدت مقرر کی تھی۔ اس تجویز کا خلاصہ یہ تھا کہ اس مدت میں

(الف) قبائلی، ریاست میں مستقل طور پر نہ رہنے والے پاکستانی اور پاکستانی افواج کا انخلاء عمل میں آ جائے۔

(ب) (برائے نام) آزاد کشمیر کی فوجوں کو وسیع پیمانہ پر منتشر اور غیر مسلح کیا جائے۔

(ج) بیشتر ہندوستانی افواج کو واپس بلا لیا جائے۔ اور

(د) نوے دن کے بعد، ہندوستانی افواج کی مزید ایسی عمل میں آئے اور کشمیر کی ریاستی فوجوں میں تخفیف کی جائے [1]

ڈاکٹر گراہم نے ناظم استصواب کے متعلق اپنی رپورٹ میں یہ سفارش کی تھی کہ:-

1. S/2375, 15.10.51

اس کے تقرر کے متعلق ہندوستان اس امر کا یقین دلائے کہ کشمیر کی حکومت

زیادہ سے زیادہ نوے دن کے اندر اس کا رسمی تقرر کر دے گی [1]

اور ثالثی کے متعلق انھوں نے اپنی رپورٹ میں لکھا تھا کہ

ریاست سے افواج کے انخلاء سے متعلق تمام تر اختلافی مسائل میں، اقوام متحدہ

کے نمائندہ کا فیصلہ قطعی اور قابلِ تسلیم ہوگا [2]

ہندوستان اس مجوزہ معاہدہ کے پہلے یعنی افواج کے انخلاء سے تعلق رکھنے والے

جزو کو اس شرط پر منظور کرنے کے لئے تیار تھا کہ نام نہاد آزاد کشمیر کی

تمام افواج کو غیر مسلح اور منتشر کر دیا جائے اور خط جنگ بندی کے پار

مقبوضہ علاقہ میں صرف چار ہزار مسلح شہری پولیس کو جس میں (نام نہاد)

آزاد کشمیر کے دو ہزار حامی بھی شامل ہوں باقی رکھا جائے اور اس کی کمان پاکستانی

افسروں کی بجائے اقوام متحدہ کے مقرر کئے ہوئے افسروں کے ہاتھوں میں ہوگی [3]

پاکستان مجوزہ معاہدہ کے اس جزو کو جس میں (نام نہاد) آزاد کشمیر کی افواج

کو منتشر اور غیر مسلح کرنے کی تجویز کی گئی تھی اس شرط کے ساتھ قبول کرنے پر آمادہ تھا کہ:-

نوے دن کے بعد بیشتر ہندوستانی افواج ہی کو نہیں بلکہ باقی ماندہ ہندوستانی

افواج کو واپس بلا لیا جائے۔ لیکن در اصل وہ یہ بات چاہتا تھا کہ خط جنگ بندی

کی دونوں اطراف میں چار چار فوجی بٹالین مقیم رہیں لیکن اگر ان کی تعداد میں تھوڑا

بہت فرق قائم رہے تو اس پر اسے کوئی اعتراض نہ ہوگا [4]

1-2. S/2375, 15.10.51

3-4. The Struggle for Kashmir

اقوام متحدہ کے توسط سے کشمیر کے سوال کو طے کرانے کی جس قدر کوششیں ہوتی رہی تھیں، گذشتہ صفحات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان سب کی ناکامی کا بنیادی سبب یہ رہا تھا کہ ہندوستان اس تنازعہ میں پاکستان کو مساوی درجہ کا فریق تسلیم کرنے پر تیار نہیں تھا اور وہ قانونی اور اخلاقی طور پر خود کو ریاست کے دفاع اور تحفظ کا ذمہ دار سمجھتا تھا اور جہاں تک قبائلیوں کے حملہ اور ریاست میں باقاعدہ پاکستانی افواج کے داخلہ کا تعلق ہے۔ اقوام متحدہ کے نمائندہ سر اَوِن ڈکسن نے ان امور کو بین اقوامی قانون کی خلاف ورزی قرار دیا تھا جس کے بعد جارح اور مجروح کی مساوات کو تسلیم کر لینے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔ لیکن ہندوستان کے اس واضح اور غیر مبہم زاویۂ نظر کو جاننے کے باوجود ڈاکٹر گراہم کے مجوزہ معاہدہ کے پہلے جزو کو قبول کرنے کے لئے جو شرط پیش کی تھی اس سے ایک مرتبہ پھر یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ پاکستان سمجھوتہ کی کسی معقول تجویز کو منظور کرنے پر آمادہ نہیں تھا

جہاں تک دوسرے دن کے اندر ریاست جموں اور کشمیر کی طرف سے ناظم استصواب رائے کے رسمی تقرر کا تعلق تھا ہندوستان نے اس خیال کا اظہار کیا تھا کہ اس تقرر کے لئے مناسب وقت وہ ہوگا جب خط جنگ بندی کی دونوں اطراف میں حالات اس کے لئے سازگار ہو جائیں گے اس لئے ہندوستان کی خواہش تھی کہ اس جزو کو، مجوزہ معاہدہ کے مسودہ سے خارج کر دیا جائے۔ لیکن پاکستان اسے برقرار رکھنے پر مصر تھا اور اگرچہ ہندوستان، ریاست سے افواج کے انخلاء کے سلسلہ میں پیدا ہونے والے اختلافات میں اقوام متحدہ کے نمائندہ کے ثالثی فیصلوں کو تسلیم کر لینے کی تجویز کو نامنظور کر چکا تھا لیکن اس نے ڈاکٹر گراہم کی اس سفارش پر کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔ اور بعض اختلافات کے باوجود گراہم رپورٹ کے متعلق، اقوام متحدہ میں مامور ہندوستانی مندوب مسٹر بینیگل راؤ کے الفاظ میں ہندوستان کا ردِ عمل یہ تھا کہ :-

> یہ رپورٹ منصفانہ ہے۔۔۔۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فریقین کے لئے قابلِ قبول
>
> حل کا نکل آنا بعید از قیاس نہیں ہے [1]

اس کے برعکس اس رپورٹ کے متعلق، خواجہ ناظم الدین کے الفاظ میں جو مسٹر لیاقت علی خاں کے قتل کے بعد پاکستان کے وزیر اعظم مقرر ہوئے تھے پاکستان کا ردّ عمل یہ تھا کہ

> ہمیں اس رپورٹ سے بے حد افسوس ہوا ہے اور ہم محسوس کرتے ہیں کہ
>
> اس میں حالات کو بہتر بنانے کی طرف کوئی قدم نہیں اٹھایا گیا [2]

گراہم رپورٹ کی اشاعت کے تین ہفتہ بعد جب اقوام متحدہ کی مجلس عمومی (جنرل اسمبلی) کا چھٹا سالانہ اجلاس پیرس میں منعقد ہوا تو مجلسِ تحفّظ نے متحدہ امریکہ اور برطانیہ کی تحریک پر یہ قرارداد منظور کی کہ:-

> اقوامِ متحدہ کے نمائندہ کو، ریاست سے افواج کے انخلاء کے متعلق فریقین
>
> کے درمیان سمجھوتہ کرانے کی کوششوں کو جاری رکھنا اور ہر حال میں چھ ہفتہ کے
>
> اندر اندر اپنی رپورٹ مجلس تحفّظ کے پاس بھیج دینا چاہیئے [3]

چناں چہ اس قرارداد کے مطابق ڈاکٹر گراہم نے پیرس میں، دونوں ملکوں کے مندوبین سے تبادلۂ خیالات کرنے کے بعد ۱۸ دسمبر ۱۹۵۱ء کو اپنی جو رپورٹ پیش کی اس میں اس بات کا اعتراف کیا تھا کہ وہ چاروں اختلافی مسائل (افواج کے انخلاء کی مدّت، خود فوجوں کی واپسی، انخلاء کی تکمیل کے بعد ریاست میں باقی رہنے والی افواج کی تعداد اور ناظم استصواب رائے کے تقرر) میں سے کسی ایک پر بھی سمجھوتہ کرانے میں کامیاب نہیں ہوسکے۔ لیکن انھوں نے آخری

---

1. The Hindustan Times 22.10.51
2. The Pakistan Times 23.10.51
3. S/2392, S/P.V. 566, 10.11.51

وہ نکات پر زیادہ زور دیا تھا اور اپنی پہلی رپورٹ میں یہ ترمیمات تجویز کی تھیں کہ:-

(الف) ریاست سے افواج کے انخلاء کی کارروائی کو نوّے دن کی بجائے ۱۵ جولائی ۱۹۵۲ء تک مکمل ہو جانا چاہیئے۔ اور

(ب) افواج کی واپسی کی تکمیل کے بعد، ریاست میں کم سے کم فوجیں رہنی چاہئیں اور ان کی تعداد کا تعیّن، ہند اور پاکستان کی ان افواج کے تناسب سے کیا جانا چاہیئے جو یکم جنوری ۱۹۴۹ء کو جنگ بندی کے وقت وہاں موجود تھیں[1]

یہ امر محتاج بیان نہیں کہ مجلسِ تحفّظ نے ۱۳ اگست ۱۹۴۸ء اور یکم جنوری ۱۹۴۹ء کو جو قرار دادیں منظور کی تھیں، مصالحت سے متعلق ڈاکٹر گراہم کی تمام تر کوششیں ان ہی قرار دادوں پر مبنی تھیں اور ان میں غیر مبہم طریقہ پر ان امور کی یقین دہانی کی گئی تھی کہ ــــــ قبائلیوں، باقاعدہ پاکستانی فوجوں اور ان پاکستانیوں کے، ریاست سے انخلاء کے بعد جو کشمیر کے باشندے نہیں ہیں ہندوستانی افواج کا انخلاء شروع ہو گا لیکن ریاست کے دفاع اور داخلی امن اور قانون کو برقرار رکھنے کی ضرورت کے پیشِ نظر وہاں مناسب تعداد میں ہندوستانی افواج کو باقی رکھا جائے گا ــــــ لیکن ڈاکٹر گراہم نے اپنی دوسری رپورٹ میں افواج کی تعداد کے متعلق جو سفارش کی تھی اس میں مذکورہ بالا یقین دہانی کا کوئی شائبہ بھی باقی نہیں رہا تھا۔ اور ریاست سے متعلق ہندوستان کی دفاعی ذمہ داریوں کو نظر انداز کر کے اسے ریاست میں برائے نام یا پھر تقریباً پاکستان کے مساوی فوجیں رکھنے کا پابند بنانے کی کوشش کی گئی تھی۔ لیکن جیسا کہ آئندہ سطور سے واضح ہو سکے گا۔ مجلسِ تحفّظ نے اقتدار پسندانہ سیاست کے ماتحت ابتدا ہی سے کشمیر کے سوال کو طے کرنے کے لئے جو غیر حقیقت پسندانہ رویہ اختیار کیا تھا اور جس کی بدولت پاکستان خود کو اس معاملہ میں ہندوستان کا مساوی الحیثیت فریق

---

1. S/2448, 18.12.51

سمجھنے لگا تھا، اس کی بناء پر پاکستان اب اپنے مقابلہ میں، ہندوستان کی اس مساوی حیثیت کو بھی برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ چناں چہ ڈاکٹر گراہم کی دوسری رپورٹ پر اظہار خیال کرتے ہوئے پاکستان کے وزیر اعظم نے کہا تھا کہ :۔

ہم، پاکستانی، اب اس بات کا مطالبہ کرتے ہیں کہ مجلس تحفظ کو یہ معاملہ براہ راست اپنے ہاتھوں میں لے کر، ہندوستان کو اس بات کی ہدایت کرنی چاہیئے کہ وہ اپنی افواج کو ریاست سے واپس بلالے اور اس کے بعد مجلس تحفظ کو اپنی نگرانی میں آزادانہ استصواب رائے کرانا چاہیئے[1]

اس کے برعکس ڈاکٹر گراہم کی سفارشات سے متفق الرائے نہ ہونے کے باوجود، ہندوستان کے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے کلکتہ میں چار لاکھ افراد کے مجمع میں تقریر کرتے ہوئے اعلان کیا تھا کہ :۔

ہندوستان نے کشمیر میں استصواب رائے کرانے کا جو وعدہ کیا تھا وہ اس پر قائم رہے گا[2]

ڈاکٹر گراہم کی دوسری رپورٹ کی اشاعت کے ایک ماہ بعد، جنوری ۱۹۵۲ء کے وسط میں جب مجلس تحفظ نے اس پر بحث شروع کی تو ڈاکٹر گراہم نے مجلس تحفظ کو بتایا کہ وہ ابھی تک افواج کے انخلاء کی مدت کے تعین، انخلاء کے بعد ریاست میں مقیم رہنے والی افواج کی تعداد، اور ناظم استصواب رائے کے تقرر کی تاریخ پر سمجھوتہ کرانے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ لیکن جب کہ ہندوستان کے مندوب مسٹر سیتل واد نے کہا تھا۔

اگر یہ بات طے ہو جاتی کہ افواج کے انخلاء کے بعد ریاست میں باقی رہنے

---

1. The Dawn, 27.12.51

2. The National Standard 2.1.52

والی افواج کی تعداد کیا ہوگی اور کتنی افواج کی واپسی ضروری ہے نیز یہ کہ جو لائحہ عمل طے ہو جائے اس پر اطمینان بخش طریقہ سے عمل درآمد ہو جائے گا تو باقی ماندہ دونوں سوالات آسانی کے ساتھ طے ہو سکتے ہیں [1]

مسٹر سینیل واد کے مذکورہ بالا بیان سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ اس مرحلہ پر عارضی صُلح کے معاہدہ میں جو چیز حائل تھی وہ صرف یہ تھی کہ افواج کے انخلاء کے بعد کشمیر میں ہندوستان کی کتنی فوج مقیم رہنی چاہیئے۔ اس وقت تک کشمیر کے متعلق پاکستان کا جو طرزِ عمل رہا تھا، ہندوستان اسے نظر انداز نہیں کر سکتا تھا اور وہ جانتا تھا کہ مجلسِ تحفّظ کی ہدایت کے باوجود پاکستان نے ۱۹۴۸ء میں اپنی باقاعدہ افواج کشمیر میں بھیجی تھیں اور جنگ بندی کے بعد اس نے مجلسِ تحفّظ کی واضح ہدایت کے برخلاف نام نہاد آزاد کشمیر کی برائے نام افواج کو ایک زبردست فوجی قوّت میں تبدیل کر دیا تھا اس لئے ہندوستان کے اس اندیشہ کو بے جا قرار نہیں دیا جا سکتا کہ پاکستان آئندہ بھی کوئی ایسا قدم اٹھا سکتا ہے جس سے ریاست کا تحفّظ خطرہ میں پڑ جائے اور چونکہ ہندوستان پر ریاست کے تحفّظ کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے اور ۱۳ اگست ۱۹۴۸ء کی قرارداد میں بھی اس کی اس ذمہ داری کی توثیق کی جا چکی تھی اس لئے اس کے اس مطالبہ کو کسی طرح بھی غیر منصفانہ قرار نہیں دیا جا سکتا کہ اسے ریاست سے اپنی افواج واپس بلا لینے کے بعد بھی وہاں دفاعی زاویہ نظر سے فوج کی معقول اور مناسب تعداد رکھنے کی اجازت حاصل ہونی چاہیئے۔ لیکن پاکستان اس کے اس جائز مطالبہ کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ حتیٰ کہ اس نے ڈاکٹر گراہم کی اس سفارش کو بھی مسترد کر دیا تھا جو انھوں نے اپنی دوسری رپورٹ میں، اس سلسلہ میں ایک ترمیم کی شکل میں پیش کی تھی۔

ان حالات میں جب مجلسِ تحفّظ نے ڈاکٹر گراہم کی دوسری رپورٹ پر بحث شروع

---

1 S/P.V. 572, 17.1.52

کی تو، سوویت یونین کے مندوب مسٹر جیکب ملک نے پہلی مرتبہ کشمیر کے سوال پر سوویت یونین کے نظریہ کی ترجمانی کرتے ہوئے کہا تھا کہ :-

کیا وجہ ہے کہ اب تک کشمیر کا سوال طے نہیں ہوسکا اور متحدہ امریکہ نیز برطانیہ کی طرف سے اسے طے کرانے کے جتنے منصوبے بھی پیش کئے گئے وہ سب ناکام ثابت ہوئے؟ .... اس بات کو سمجھ لینا کچھ مشکل کام نہیں کہ یہ منصوبے .... سامراجی ذہنیت پر مبنی تھے اور ان کا مقصد متحدہ امریکہ اور برطانیہ کی طرف سے کشمیر کے اندرونی معاملات میں مداخلت کرنا، ہند اور پاکستان کے تنازعہ کو طول دینا اور کشمیر کو اپنا ایک زیرِ حفاظت علاقہ بنا لینا تھا۔ اور سب کے بعد ان منصوبوں کا مقصد کشمیر میں، متحدہ امریکہ اور برطانیہ کی فوجوں کو بھیج دینا ہے ..... جہاں تک مجلسِ تحفظ کی ۳۰ مارچ ۱۹۵۱ء کی قرارداد کے اس جزو کا تعلق ہے جس میں، کشمیر کی مجوزہ دستور ساز مجلس پر تنقید کی گئی ہے اس کا مقصد ریاست کے اندرونی معاملات میں مداخلت کے علاوہ اور کچھ نہیں اور یہ امر اقوامِ متحدہ کے منشور کے اصول کی کھلی ہوئی خلاف ورزی ہے .... کشمیر کا سوال کامیابی کے ساتھ اسی صورت میں حل ہوسکتا ہے کہ کشمیر کے باشندوں کو اُن کا دستوری مستقبل طے کرنے کا موقع دیا جائے اور اس معاملہ میں باہر سے کوئی مداخلت نہ کی جائے۔ یہ مقصد کشمیر کی باشندوں کی طرف سے جمہوری اصول پر منتخب کی ہوئی ایک مجلس دستور ساز کے ذریعہ سے بھی حاصل کیا جاسکتا ہے [1]

لیکن مسٹر جیکب ملک کی اس حقیقت افروز تقریر کے باوجود مجلسِ تحفظ اپنے نظریہ کو تبدیل کرنے کے لئے تیار نہیں ہوئی اور اس نے برطانوی مندوب کی تحریک پر ۳۰ جنوری ۱۹۵۲ء

1. S/P.V. 571, 30.1.52

کو یہ تجویز منظور کی کہ ڈاکٹر گراہم کو اپنی کوششیں جاری رکھنی اور دو ماہ کے اندر اپنی رپورٹ مجلس تحفظ کو بھیج دینی چاہیئے۔

اس قرارداد کے مطابق ڈاکٹر گراہم نے ۲۲ اپریل ۱۹۵۲ء کو اپنی تیسری رپورٹ پیش کی اگرچہ اس میں بھی اس بات کا اعتراف کیا گیا تھا کہ وہ افواج کے انخلاء کے سلسلہ میں سمجھوتہ کرانے سے قاصر رہے ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی انھوں نے یہ اطلاع بھی دی تھی کہ:۔

ہندوستان نے اپنی بیشتر افواج کا انخلاء شروع کر دیا ہے اور اس امر پر رضامند ہو گیا کہ وہ غیر مشروط طور پر اٹھارہ ہزار سپاہیوں پر مشتمل اپنے ایک ڈویژن کو واپس بلا لے گا اور اس طرح یکم جنوری ۱۹۴۹ء کو کشمیر میں ہندوستانی افواج کی جو تعداد تھی وہ ۵۰ فی صد سے کم رہ جائے گی۔ پھر اس نے ۱۹۵۱ء کے موسم گرما میں پاکستان کی سرحد پر جو فوجیں بھیج دی تھیں انھیں بھی واپس بلا لینے اور انھیں ان کی زمانۂ امن کی چھاؤنیوں میں رکھنے کا فیصلہ کر لیا ہے اور جہاں تک ناظم استصواب رائے کے تقرر اور کام شروع کرنے کا تعلق ہے اگر اس امر پر کوئی سمجھوتہ ہو جائے کہ افواج کے انخلاء کے بعد، خط جنگ بندی کی دونوں اطراف میں کتنی فوجیں رہیں گی تو ہندوستان اس سوال (ناظم استصواب کے تقرر) پر بھی سمجھوتہ کرنے میں کوئی دشواری محسوس نہ کرے گا[1]

ڈاکٹر گراہم نے اپنی اس رپورٹ میں یہ بھی لکھا تھا کہ پاکستان نے اطلاع دی ہے کہ کشمیر سے قبائلی اور وہ پاکستانی جو معمولاً کشمیر کے باشندے نہیں ہیں واپس چلے گئے ہیں اور یہ کہ یکم جنوری ۱۹۴۹ء کو خط جنگ بندی کے پار پاکستانی افواج کی جو تعداد موجود تھی وہ اب نصف سے کم رہ گئی ہے اور آخر میں ایک مرتبہ پھر اس بات پر زور دیا تھا کہ سمجھوتہ کی راہ

1. S/261, 22.4.52

میں سب سے بڑی رُکاوٹ یہ سوال ہے کہ افواج کے انخلاء کے بعد خطِ جنگ بندی کے دونوں طرف مقیم رہنے والی افواج کی تعداد کیا ہونی چاہیئے۔ ڈاکٹر گراہم نے یہ بھی لکھا تھا کہ اس معاملہ میں ہندوستان اپنے بنیادی نظریہ پر قائم ہے اور دونوں ملکوں سے سفارش کی تھی کہ انھیں کشمیر میں اپنی فوجی قوتوں کو بڑھانے سے پرہیز کرنا چاہیئے، اپنے اس عزم پر قائم رہنا چاہیئے کہ وہ قوت کا استعمال نہیں کریں گے اور قوت کے استعمال کا کوئی موقع نہ آنے دیں گے جنگ بندی کو برقرار رکھیں گے اور ۱۵ر جولائی ۱۹۵۲ء تک مزید افواج کو واپس بُلالیں گے اور آخر میں انھوں نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ انھیں ان کی کوششیں جاری رکھنے کی اجازت دی جائے اور اس کے ساتھ ہی اس خیال کا اظہار بھی کیا تھا کہ چوں کہ کشمیر سے، افواج کے انخلاء کا آخری مرحلہ، استصواب رائے کے مرحلہ کے ساتھ گہرا تعلق رکھتا ہے اس لیے اس مرحلہ میں انھیں استصواب رائے کے مجوزہ ناظم ایڈمرل نمٹز کے ساتھ مشورہ کرتے رہنے کی اجازت دی جائے۔

اس مرحلہ پر ہندوستان، سمجھوتہ کی راہ میں حائل مذکورہ بالا سب سے بڑی رُکاوٹ کو دُور کرنے کے لئے گفت وشنید پر رضامند تھا لیکن اسے ڈاکٹر گراہم کی اس تجویز کے ساتھ اتفاق رائے نہیں تھا کہ اس مرحلہ پر انھیں استصواب رائے کی مجوزہ ناظم ایڈمرل نمٹز کے ساتھ مشورہ کرنے کی اجازت دی جائے۔ لیکن اس موقع پر پاکستان کی طرف سے پھر یہ مطالبہ کیا جانے لگا کہ:۔

جیسا کہ مجلسِ تحفظ کی قرارداد مورخہ ۳۰ر مارچ ۱۹۵۱ء میں تجویز کیا گیا ہے تمام اختلافات کو ثالث کے سپرد کردیا جائے[1]

ڈاکٹر گراہم نے مجلسِ تحفظ کے روبرو اپنی چوتھی رپورٹ ۱۶ر ستمبر ۱۹۵۲ء کو پیش کی تھی

1. The Evening News (Bombay) 28.4.52

اور ۱۰ اکتوبر کو اپنے ایک طویل بیان میں اپنی اور اپنے پیشروؤں کی مساعی مصالحت کا احاطہ کرنے کے بعد انھوں نے اپنی ۱۶ جولائی ۱۹۵۲ء کی اس تجویز کو بے بنیاد قرار دے کر کہ پاکستان اپنی طرف تین ہزار سے چھ ہزار تک اور ہندوستان اپنی جانب بارہ ہزار سے اٹھارہ ہزار تک فوجیں رکھنے کا حقدار ہوگا یہ تجویز پیش کی کہ اس پر دونوں ملکوں کے نمائندوں کے درمیان جنیوا میں وزارتی سطح پر گفت وشنید کر لی جائے۔ ان کی اس تجویز پر عمل درآمد کیا گیا لیکن یہ تجویز بھی کامیاب نہیں ہوسکی۔ اس کے بعد انھوں نے یہ تجویز پیش کی کہ پاکستان اپنی طرف چھ ہزار افواج رکھے اور گلگت اسکاؤٹس کے نام سے تین ہزار پانچ سو افراد پر مشتمل جو بے قاعدہ فوج موجود ہے وہ اپنی جگہ باقی رہے اور ہندوستان کو اٹھارہ ہزار فوج رکھنے کی اجازت حاصل ہو اور اس میں کشمیر کے ریاستی ملیشیا کے چھ ہزار سپاہیوں کو شامل نہ سمجھا جائے لیکن ان کی یہ تجویز بھی بار آور نہ ہوسکی جس کے بعد انھوں نے کشمیر میں باقی رکھی جانے والی افواج کے لئے یہ اصول تجویز کیا کہ:-

ان کی تعداد کم سے کم ہو اور یہ تعداد امن وقانون نیز جنگ بندی کے معاہدہ کے تحفظ کے نقطۂ نظر سے مقرر کی جائے اور اس کے ساتھ ہی استصواب رائے کی آزادی کو بھی مدنظر رکھا جائے اور جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے اس کی طرف باقی رہنے والی افواج کے سلسلہ میں ریاست کے تحفظ کا بھی پوری طرح خیال رکھا جائے[1]

اسی طرح کسی قدر پیچیدہ الفاظ اور انداز ہی میں سہی لیکن ڈاکٹر گراہم نے بھی اپنی جگہ اس بات کو تسلیم کر لیا تھا کہ کشمیر کے تحفظ کی تمام تر ذمہ داری ہندوستان پر عائد ہوتی ہے اور ڈاکٹر گراہم کی چوتھی رپورٹ کا خلاصہ بھی ان ہی دستاویزات پر مبنی ہے۔

1 S/2783, 19.9.52, S/P.V. 603. 10.10.52

اسے اس ذمہ داری کو پورا کرنے کے لئے ریاست میں اپنی افواج مناسب تعداد میں رکھنے کا حق حاصل ہے لیکن جیسا کہ اس تنازعہ کی گذشتہ پوری تاریخ سے واضح ہوتا ہے پاکستان چونکہ ریاست جموں اور کشمیر کے متعلق کسی ایسے حل کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں تھا جو انصاف پر مبنی ہو اس لئے اس نے ڈاکٹر گراہم کی اس تجویز کو منظور کرنے سے نہ صرف انکار ہی کر دیا بلکہ اس پر پاکستانی اخبارات، مدبرین حتیٰ کہ ارباب حکومت کی طرف سے سخت ترین تنقیدات بھی کی گئیں۔ چناں چہ اس تجویز پر اظہار خیال کرتے ہوئے "ڈان" نے لکھا تھا کہ:-

... یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ وہ (ڈاکٹر گراہم) آزاد اور غیر جانبدار نمائندہ نہیں ہیں.... سرحدی قبائل کا گرم خون کھول رہا ہے اور پاکستان کے باشندوں کی بے اطمینانی ایک ایسے طوفان کی صورت اختیار کرتی جا رہی ہے جسے قابو میں رکھنا ممکن نہیں ہو سکتا[1]

اس سلسلہ میں، پاکستان کی برسر حکومت جماعت مسلم لیگ نے اپنی کونسل کے اجلاس میں جس میں صوبائی وزرأ اعظم اور مرکزی کابینہ کے اراکین نے شرکت کی تھی، ایک قرارداد میں، اقوام متحدہ پر سخت تنقید کرنے کے بعد حکومت پاکستان سے مطالبہ کیا تھا کہ اسے:-

ہر ممکن طریقہ سے کشمیر کے باشندوں کو آزاد کرانا چاہیئے[2]

اور اس اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے، آزاد کشمیر کے قائد ڈاکٹر محمود حسین نے اعلان کیا تھا کہ:-

اگر اقوام متحدہ کو اس تعطل کے ختم کرنے میں کامیابی حاصل نہ ہو سکی تو

---

1. The Dawn 14.9.52

The Struggle for Kashmir P.139

ہم کوئی اور قدم اٹھانے میں آزاد ہوں گے۔[1]

حتی کہ سردار عبدالرب نشتر نے جو اس زمانہ میں وزیر صنعت تھے اپنے ایک بیان میں غیر مبہم طریقہ پر یہ بات کہی تھی کہ:۔

کشمیر ہمارا ہے اور ہم اسے ہر ممکن طریقہ سے حاصل کر کے رہیں گے۔ میدانِ جنگ انتخاب میں رائے دہندگی کی جگہ نہیں ہے بلکہ اس کے (میدانِ جنگ کے لئے) بہادری اور بہادر آدمیوں کی ضرورت ہے۔[2]

پاکستان کے مذکورہ بالا ردِ عمل کے برعکس ہندوستان اس تجویز کو منظور کر لینے پر آمادہ تھا چنانچہ اس کے متعلق ہندوستان کا نظریہ یہ تھا کہ:۔

ریاست سے افواج کے انخلاء سے متعلق ۴ ستمبر ۱۹۵۲ء کی تجویز میں جو اصول تجویز کیا گیا ہے وہ صحیح بنیاد پر مبنی ہے اور اس تجویز میں سمجھوتہ کے عناصر موجود ہیں۔[3]

بہر حال حالات کے اس پس منظر میں ۵ نومبر ۱۹۵۲ء کو متحدہ امریکہ اور برطانیہ کی جانب سے مجلس تحفظ میں ایک نئی قرارداد کا جو مسودہ پیش کیا گیا اس کا مفہوم یہ تھا کہ:۔

ہند اور پاکستان کو فوراً اس سوال پر باہمی سمجھوتہ کے لئے گفت و شنید شروع شروع کر دینی چاہیئے کہ افواج کے انخلاء کے بعد خطِ جنگ بندی کی دونوں اطراف میں کتنی فوجیں رکھی جانی چاہئیں۔[4]

قرارداد کے اس مسودہ میں ڈاکٹر گراہم کی تجویز کے مطابق پاکستان کو تین ہزار سے چھ ہزار تک اور ہندوستان کو بارہ ہزار سے اٹھارہ ہزار تک افواج رکھنے کا مشورہ بھی دیا گیا اور

---

1. The Struggle for Kashmir P.139
2. The New Yorl. Times 15 10.52
3. S/P.V. 605, 10.10.52, P.37
4. S/2839; 5.11.52

گلگت اسکاؤٹس نیز کشمیر کی ریاستی فوج کو اس تعداد سے علیحدہ رکھا گیا تھا۔ ڈاکٹر گراہم کو ہدایت کی گئی تھی کہ وہ اپنی کوششوں کو جاری رکھیں اور ہند اور پاکستان سے درخواست کی گئی تھی کہ وہ اس قرارداد کی منظوری کے تیس دن کے اندر اپنی گفت و شنید کے نتیجہ سے مجلسِ تحفظ کو مطلع کر دیں۔

یہ امر محتاجِ بیان نہیں کہ ۵ نومبر ۱۹۵۲ء کی قرارداد کے مسودہ میں، افواج کے انخلاء کے بعد کشمیر میں ہند اور پاکستان کی باقی رکھی جانے والی افواج کا جو تناسب مقرر کیا گیا تھا ہندوستان ابتدا ہی سے اسے نامنظور کر چکا تھا لیکن اس قرارداد پر تقریر کرتے ہوئے، برطانوی مندوب سر گلیڈون جیب نے جن خیالات کا اظہار کیا تھا ان کی وجہ سے اس معاملہ میں مزید پیچیدگیاں پیدا ہونے کا امکان پیدا ہو گیا تھا۔ انھوں نے کہا تھا کہ:-

> اب تک مجلسِ تحفظ میں اس سوال کو طے کرنے کے لئے جن خطوط پر کوششیں کی جاتی رہی ہیں، لندن ان سے ہٹ کر اسے طے کرنے کے امکانات کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔[1]

سر گلیڈون جیب کی اس تقریر پر تبصرہ کرتے ہوئے مائیکل بریچر نے لکھا ہے کہ:-

> اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ڈکسن نے کشمیر کی تقسیم اور استصواب رائے کی جو خطوط تجویز پیش کی تھی اسے فراموش نہیں کیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ برطانوی مندوب نے فریقین کے غور کے لئے یہ تجویز بھی پیش کی تھی کہ استصواب رائے کے دوران میں کشمیر میں غیر ملکی فوجیں رکھی جائیں۔ اور اس امر کی طرف بھی اشارہ کیا تھا کہ برطانیہ اسی امر کو استصواب رائے کی آزادی کے لئے موزوں نہیں سمجھتا کہ ہندوستان کی تجویز کے مطابق خط جنگ بندی کی پاکستانی جانب صرف مسلح

---

1. S/P.V. 606, 6.11.52

شہری پولیس متعین رہے اور اسے (ہندوستان کو) اس کی طرف فوج رکھنے
کی اجازت دی جائے لہ

اور سر گلیڈون جیب کی مذکورہ بالا تقریر سے یہ اندازہ کر لینا کوئی مشکل کام نہیں رہ جاتا کہ ڈاکٹر گراہم نے اپنی ۲۴ ستمبر ۱۹۵۲ء کی تجویز میں کشمیر سے متعلق ہندوستان کی جن دفاعی اور داخلی ذمہ داریوں کو تسلیم کیا تھا برطانیہ ان کی توثیق کے لئے تیار نہیں تھا۔ اس کے برعکس وہ کشمیر کو تقسیم کرانے اور وہاں غیر ملکی فوجیں بھجوانے کی طرف مائل تھا۔ اور اس معاملہ میں پاکستان اور ہندوستان کو ایک ہی سطح پر رکھنا چاہتا تھا لیکن کیا سر گلیڈون جیب کے ان خیالات سے ان شبہات کو تقویت نہیں پہنچتی تھی جو ۱۷ جنوری ۱۹۵۲ء کو ڈاکٹر گراہم کی دوسری رپورٹ پر تقریر کرتے ہوئے سوویت یونین کے مندوب مسٹر جیکب ملک نے پیش کئے تھے؟

یہ بات ظاہر ہے کہ ہندوستان ابتدا ہی سے جس تجویز اور نظریہ کو مسترد کرتا رہا تھا وہ اس مرحلہ پر بھی اسے منظور نہیں کر سکتا تھا۔ چناں چہ اس تجویز کو مسترد کرتے ہوئے محترمہ وجے لکشمی پنڈت نے کہا تھا کہ:۔

> کشمیر میں، اس کے تحفظ کے لئے کم سے کم ۲۱ ہزار ہندوستانی افواج کا رہنا ضروری ہے بشرطیکہ (تمام تعداد) آزاد کشمیر کی تمام افواج کو غیر مسلح کر دیا جائے۔ لیکن اگر کوئی متبادل تعداد مقرر کی جائے تو اُسے صوابدیدی اور کسی کو مطمئن کرنے کے خیال پر مبنی کرنے کی بجائے تحفظ کی حقیقی ضرورت کے مطابق مقرر کیا جانا چاہیئے۔ جہاں تک کشمیر میں غیر ملکی فوجوں کے بھیجنے کی تجویز کا تعلق ہے۔ ہمارے لئے یہ امر تعجب خیز ہے کہ ہمیں ان غیر ملکی افواج کو دیا سے

I. The Struggle for Kashmir. P.140

میں بلا لینے کا مشورہ دیا جاتا ہے جن کی واپسی ہماری آزادی کا ایک اہم پہلو ہے۔ ہمارے لئے یہ بات کوئی معنی نہیں رکھتی کہ یہ تجویز کس کی طرف سے پیش کی گئی ہے اور ان افواج کو کس ڈھنگ سے ریاست میں بھیجنے کے لئے کہا جاتا ہے لیکن ہم کسی حال میں اس کی اجازت نہیں دے سکتے۔[1]

یہاں یہ بتا دینا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ متحدہ امریکہ اور برطانیہ کی اس مشترکہ قرارداد پر بحث کے دوران میں سر ظفر اللہ خاں نے یہ اعلان کیا تھا کہ :-

ہندوستان کو کشمیر میں ۲۸ ہزار فوج جس میں ریاستی فوج بھی شامل ہو رکھنے کی اجازت دے دی جائے لیکن وہ وہاں سے اپنی بکتر بند فوج اور توپ خانہ کو ہٹا لے ہم ۱۳ اگست ۱۹۴۸ء کی قرارداد کی تمام دفعات کو پورا کرنے کے لئے تیار ہیں۔ قبائلی اور پاکستانی رضاکار، ریاست سے واپس جا چکے ہیں اور پاکستان اپنی افواج کو بھی واپس بلا لے گا۔[2]

لیکن اس اعلان میں (نام نہاد) آزاد کشمیر کی فوجوں کا کوئی ذکر نہیں کیا گیا تھا اور اس کے بڑے بڑے جنگی ہتھیاروں کو بھی نظرانداز کر دیا گیا تھا جس کا صاف مطلب یہ تھا کہ اگر سر ظفر اللہ خاں کی اس پیشکش کو منظور کر لیا جاتا تو (نام نہاد) آزاد کشمیر کی افواج بدستور برقرار اور پورے سامانِ جنگ سے مسلّح رہتیں لیکن ہندوستان کو اپنے توپ خانہ اور اپنی بکتر بند فوج کو واپس بلا لینا پڑتا اور ظاہر ہے کہ ہندوستان اس تجویز کو کسی حال میں بھی منظور نہیں کر سکتا تھا۔ چناں چہ ہندوستان کے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے سر ظفر اللہ خاں کی اس تجویز پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا تھا کہ :-

---

1. S/P.V. 608, 8.12.52

2. S/P.V. 609, 16.12.52

اس کا مطلب یہ ہے کہ ایسی صورت میں جب کہ ڈاکٹر گراہم افواج کی تعداد کو گھٹانے کے سوال پہ تبادلۂ خیالات کر رہے ہیں اور انھوں نے تجویز کیا تھا کہ پاکستان چند ہزار فوج رکھ سکتا ہے۔ مسٹر ظفر اللہ کی تجویز کے مطابق پاکستان کو کشمیر میں ۲۵ ہزار سے ۳۵ ہزار تک فوجیں رکھنے کا موقع مل سکتا ہے کیوں کہ وہ ان افواج کو پاکستان کی نہیں بلکہ (نام نہاد) آزاد کشمیر کی افواج کہتے ہیں۔ درحقیقت یہ ایک انوکھی تجویز ہے اور ان ہی لوگوں کو متاثر کر سکتی ہے جو ناسمجھ اور معاملہ کی اصلیت سے ناواقف ہیں [1]

بہرحال ۲۳ دسمبر ۱۹۵۲ء کو جب کشمیر کے سوال اور اس قرارداد پہ عام مباحثہ ہوا تو اس میں حصہ لینے والے مجلس تحفظ کے چھ اراکین میں سے پانچ نے اس قرارداد کی حمایت کی لیکن سوویت یونین کے مندوب مسٹر زورین نے اس کی مخالفت کرتے ہوئے کہا کہ:۔

کشمیر کے مستقبل کے سوال کو، باشندگان کشمیر کی ایسی مجلس دستور ساز ہی کو طے کرنا چاہیئے جسے وہ خود جمہوری اصول کی بنیاد پہ منتخب کریں [2]

اس کے باوجود مجلس تحفظ نے اسی روز، متحدہ امریکہ اور برطانیہ کی مذکورہ بالا مشترکہ قرارداد کو منظور کر لیا اور اگرچہ ہندوستان نے اسے مسترد کر دیا تھا لیکن اس نے مصالحت کی بات چیت کرنے کے لئے اپنی آمادگی کا اظہار کیا۔

اس قرارداد کی منظوری کے بعد ڈاکٹر گراہم اور ہند اور پاکستان کے نمائندوں کے درمیان جو بات چیت ہوتی رہی اس کے نتیجہ میں ۲۳ جنوری ۱۹۵۳ء کو ڈاکٹر گراہم نے مجلس تحفظ کو یہ اطلاع دی کہ فریقین موجودہ تعطل کو ختم کرنے پہ رضامند ہیں۔ چناں چہ فریقین کی اس

1. The New York Times 21.12.52

2. S/P.V. 611, 23,12,52

آمادگی سے فائدہ اٹھانے کے لئے ۴ فروری سے ۱۹ فروری ۱۹۵۳ء تک جنیوا میں فریقین کے درمیان مصالحت کی جو گفت و شنید ہوتی رہی اس کے دوران میں ڈاکٹر گراہم نے یہ تجویز پیش کی کہ:-

پاکستان کی جانب چھ ہزار مسلح فوج رکھی جائے لیکن یہ فوج پاکستان کی انتظامی اور فوجی کمان کے ماتحت نہ ہو اور اس میں آہن پوش فوج اور توپ خانہ کو شامل نہ کیا جائے۔ ہندوستان ریاست میں ۲۱ ہزار فوج رکھے لیکن اس میں ریاست کی مسلح فوج کو بھی شامل سمجھا جائے اور ہندوستان بھی اپنی آہن پوش فوج اور توپ خانہ کو واپس بلا لے [1]

اور اس امر کے باوجود کہ ہندوستان ریاستی فوج کے علاوہ ریاست میں اپنی ۲۱ ہزار مسلح فوج رکھنے پر اصرار کر رہا تھا اس نے کشمیر میں ریاستی فوج کو شامل کر کے اپنی ۲۱ ہزار فوج رکھنے کی تجویز کو منظور کر لیا لیکن جہاں تک (نام نہاد) آزاد کشمیر میں چھ ہزار مسلح افواج رکھنے کی تجویز کا تعلق ہے اسے مسترد کرتے ہوئے اس نے اپنے اس مطالبہ کا اعادہ کیا کہ وہاں چار ہزار شہری مسلح پولیس رکھی جائے البتہ اس نے اس امر پر رضامندی کا اظہار کیا ہے کہ اس تعداد میں تھوڑا سا اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ہندوستان نے یہ مطالبہ بھی کیا کہ (نام نہاد) آزاد کشمیر کی حکومت کو ختم کر دیا جائے۔ پاکستان کے مقرر کئے ہوئے افسر دست بردار ہو جائیں اور (نام نہاد) آزاد کشمیر کے مقامی حکام کے ساتھ حکومت پاکستان کا کوئی تعلق باقی نہ رہے۔ لیکن پاکستان نے ان مطالبات کو منظور کرنے سے انکار کر دیا اور اس کے بعد ڈاکٹر گراہم کو بھی کم و بیش ڈھائی سال کے بعد اس مسئلہ کو حل کرنے کے سلسلہ میں اپنی مساعی کی ناکامی کا اعتراف کر کے اس سے دست بردار ہو جانا پڑا۔

---

1 S/2967, 27.3.53

مجلس تحفّظ کے روبرو کشمیر کے تنازعہ کے پیش ہونے کے وقت سے ڈاکٹر گراہم کی مساعی مصالحت کی ناکامی کے وقت تک، کمیشن، جنرل مک ناٹن، سر اون ڈکسن اور خود ڈاکٹر گراہم کی طرف سے اس مسئلہ کو طے کرانے کے لئے جو تجاویز پیش کی جاتی رہی تھیں اور جو جو اقدامات کئے گئے تھے ان پر تبصرہ کرتے ہوئے مائیکل بریچر نے جو کچھ لکھا ہے یہاں اس کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے:-

ڈاکٹر گراہم کی مصالحت سے جو مرکزی حقیقت واضح ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ ریاست سے افواج کے انخلاء کا سوال اس بات پر مبنی ہو کر رہ گیا ہے کہ افواج کے انخلاء کے بعد خط جنگ بندی کی دونوں جانب باقی رہنے والی افواج کی تعداد اور نوعیت کیا ہونی چاہیئے۔ لیکن جیسا کہ خود ڈاکٹر گراہم نے اعتراف کیا ہے یہ ہی سوال اختلاف کی گہرائیوں کا مظہر بھی ہے۔ یہ سوال دونوں حکومتوں کے درمیان (۱) کشمیر کی حیثیت (۲) خط جنگ بندی کی دونوں جانب متعلقہ حکومتوں کی ذمہ داری کی نوعیت اور (۳) ۱۳ اگست ۱۹۴۸ء نیز ۵ جنوری ۱۹۴۹ء کی متفقہ قرارداد کے سلسلہ میں ان کے فرائض کے متعلّق متضاد تصوّرات کی بدولت پیدا ہوا ہے۔

اقوام متحدہ کے روبرو، اس تمام مدّت میں ان ہی امور پر زور دیا جاتا رہا ہے اور مجلس تحفّظ کی قراردادوں، مصالحت کرانے کے لئے کمیشن کی کوششوں، جنرل مک ناٹن اور سر اوُن ڈکسن کی تجاویز اور سب کے بعد ڈاکٹر گراہم کی مساعی کا جو ردّ عمل ظاہر ہوتا رہا ہے وہ بھی ان ہی تصوّرات کے مطابق تھا۔ پانچ سال سے زیادہ مدّت تک ہندوستان اپنے اس دعوی پر قائم چلا آرہا ہے کہ ہندوستان کے ساتھ کشمیر کا الحاق قانوناً جائز ہے۔ پاکستان نے

قبائلیوں کو کشمیر پر حملہ کرنے میں مدد دے کر اپنے ہمسایہ ملک کے خلاف جارحانہ قدم اٹھایا ہے۔ اس لئے اسے استصواب رائے عامہ سے متعلق کسی فیصلہ میں کوئی دخل حاصل نہیں ہونا چاہیئے لیکن پاکستان الحاق کو غیر قانونی قرار دیتا رہا ہے۔ وہ قبائلیوں کے حملہ کو جارحانہ اقدام تسلیم کرنے سے انکار کرتا رہا ہے اور کشمیر کے سلسلہ میں خود کو ہندوستان کا مساوی فریق قرار دے کر یہ دعوی کرتا رہا ہے کہ کشمیر سے فوجوں کے انخلاء کے ہر منصوبہ میں دونوں ملکوں کی مساوات کو مد نظر رکھا جانا چاہیئے۔

جہاں تک، ریاست سے فوجوں کے انخلاء کے بعد، وہاں باقی رکھی جانے والی فوجوں کی تعداد اور ان کی نوعیت کا تعلّق ہے اگرچہ یہ سوال ٹیکنیکل حیثیت رکھتا ہے لیکن درحقیقت یہی سوال سب سے زیادہ اہم بھی ہے۔ ہندوستان کشمیر میں ۲۸ ہزار افواج رکھے یا ڈاکٹر گراہم کی تجویز کے مطابق اسے وہاں ۲۱ ہزار فوج رکھنے کا حق دیا جائے یا پاکستان کو ریاست میں ۵ ہزار سے ۶ ہزار تک فوج رکھنے کی اجازت دی جائے یا پھر ہند اور پاکستان دونوں ہی چار چار ہزار کی تعداد میں اپنی افواج کو وہاں رکھیں، یہ سوالات ایسے نہیں ہیں جنھیں حل نہ کیا جا سکے اور یہ استصواب رائے کے فیصلہ پر عمل درآمد کرنے میں بنیادی رکاوٹ کی حیثیت بھی نہیں رکھتے۔

کشمیر کے تنازعہ میں اصل اختلاف ان حسابی اختلافات سے کہیں سے زیادہ گہرا ہے اور یہ اختلافات، اس بنیادی اختلاف پر مبنی ہیں جو ہند اور پاکستان کے درمیان، کشمیر کے تنازعہ کے ابتدائی اسباب، اس کے ارتقاء اور مفہوم نیز اس سلسلہ میں اقوام متحدہ کے طرز عمل کے متعلق چلا آرہا ہے

یہ اختلاف جیسا کہ جنوری ۱۹۴۸ء میں موجود تھا جوں ۱۹۵۳ء میں بھی موجود ہے اور اگرچہ فریقین، عموماً افواج کے انخلاء اور استصواب رائے عامہ پر اتفاق رائے کا اظہار کرتے رہے ہیں لیکن ان کے درمیان کبھی بھی اقوام متحدہ کے نظریے کے مطابق فوجوں کے انخلاء اور استصواب رائے پر اتفاق رائے نہیں ہو سکا اور اس وقت اس تنازعہ کا فیصلہ نہ ہو سکنے کی وجہ بھی ان ہی اختلافات میں پوشیدہ ہے ..... اس لئے اگر اس خطرناک بین اقوامی تنازعہ کا کوئی حقیقی اور مناسب حل دریافت کیا جاسکتا ہے تو اقوام متحدہ کو ان اختلافات کو سمجھنے اور دور کرنے کی طرف متوجہ ہونا چاہیئے جو کشمیر کے معاملہ میں ہند اور پاکستان کے درمیان چلے آ رہے ہیں اور جب تک یہ نہیں کیا جائے گا یہ تنازعہ اپنی جگہ قائم رہے گا۔

ان حالات میں اقوامِ متحدہ کو ان بڑے بڑے بنیادی سوالات پر غور کرنا چاہیئے کہ — (الف) کیا ہندوستان کے ساتھ کشمیر کا الحاق قانوناً جائز تھا اور اگر جائز تھا تو کشمیر سے افواج کے انخلاء اور وہاں استصواب رائے کرانے کے سلسلہ میں ہند اور پاکستان کی حیثیتیں کیا ہونی چاہئیں (ب) کیا پاکستان کشمیر یا ہندوستان کے خلاف جارحانہ حملہ کا مرتکب ہوا ہے؟ اگر ہوا ہے تو اقوامِ متحدہ کو بجا طور پر اس کے اس اقدام کی مذمت کرنی چاہیئے اور اسی حقیقت کے پیش نظر ریاست سے افواج کے انخلاء استصواب رائے اور اس میں پاکستان کے کردار سے متعلق اپنی حکمت عملی پر نظر ثانی کرنی چاہیئے لیکن اگر پاکستان جارحانہ حملہ کا مرتکب نہیں ہوا تو مجلسِ تحفظ کو علی الاعلان، پاکستان کے خلاف ہندوستان کے اس سب سے اہم الزام کو مسترد کر کے یہ اعلان کر دینا چاہیئے کہ چوں کہ فریقین میں سے

کوئی بھی جارحانہ حملہ کا مرتکب نہیں ہوا اور دونوں ملک جغرافیائی لحاظ سے کشمیر کے ساتھ ملتے ہیں اس لئے، اقوام متحدہ کی طرف سے استصواب رائے کے لئے جو منصوبہ بھی بنایا جائے گا اس میں دونوں ملکوں سے مشورہ کیا جائے گا (ج) کیا ریاست میں کوئی جائز آئینی حکومت موجود ہے۔ اگر ہندوستانی کشمیر کی حکومت جائز آئینی حکومت ہے تو کیا استصواب رائے سے پہلے اسے پوری ریاست کو اپنے زیر انتظام لے آنے کا حق حاصل ہے؟ اور (د) جیسا کہ ہندوستان کا دعویٰ ہے کیا (نام نہاد) آزاد کشمیر کی فوج پاکستان کی تخلیق ہے یا پاکستان کے قول کے مطابق وہ ایک ایسی خود مختار فوج ہے جسے ان کشمیریوں نے منظم اور مسلح کیا ہے جنھوں نے مہاراجہ کے خلاف بغاوت برپا کی تھی؟ اور میرا خیال ہے کہ کشمیر کے تنازعہ کا حل ان ہی سوالات کے جواب میں پوشیدہ ہے[1]

مسٹر مائیکل بریچر نے ۱۹۵۳ء کے وسط تک، کشمیر کے تنازعہ کے مختلف مراحل اور اقوام متحدہ کی مساعی مصالحت پر جو تبصرہ کیا ہے وہ کسی مزید تشریح اور تبصرہ کا محتاج نہیں اور اس سے جو دو بنیادی حقیقتیں واضح ہوتی ہیں وہ یہ ہیں کہ اوّل تو اقوام متحدہ نے اس معاملہ کو طے کرنے کے لئے صحیح طریقۂ کار اختیار نہیں کیا تھا اور دوسرے ہندوستان نے ابتدا میں جو موقف طے کیا تھا وہ اس پر قائم رہا تھا اور اس موقف کے دائرہ میں رہتے ہوئے وہ ہمیشہ اس تنازعہ کو طے کرنے کے لئے نہ صرف تیار ہی رہا تھا بلکہ ہر ممکن کوشش بھی کرتا رہا تھا۔

---

1. The Struggle for Kashmir Pp.142-145

بارھواں باب

چار سال کی مدّت

کشمیر کے تنازعہ میں ڈاکٹر گراہم کی مساعی مصالحت ۱۹۵۳ء کے آغاز میں ناکامی پر ختم ہوئی تھیں اور اس ناکامی کے چار سال بعد ۲۱۔ فروری ۱۹۵۷ء کو مجلس تحفّظ نے اپنی ایک قرارداد کی رُو سے سویڈن کے نمائندہ مسٹر گنر یارنگ کو جو اس وقت مجلس تحفّظ کے صدر بھی تھے ایک مرتبہ پھر اس تنازعہ کے تصفیہ کے امکانات دریافت کرنے پر مامور کیا تھا۔

ڈاکٹر گراہم کے مشن کی ناکامی اور اس تنازعہ کے فیصلہ کے امکانات دریافت کرنے کے لئے مسٹر گنر یارنگ کے تقرر کے درمیان تقریباً چار سال کی جو مدّت گذری تھی اس میں ایک جانب تو ہند اور پاکستان کی حکومتوں کے درمیان اس تنازعہ کے تصفیہ کے لئے گفت وشنید ہوتی رہی تھی، دوسری جانب خود کشمیر کے حالات میں چند ایسی تبدیلیاں رونما ہوئی تھیں جنھیں ہندوستان کے ساتھ اس ریاست کے الحاق کے فیصلہ کے سلسلہ میں بے حد اہمیت حاصل ہے اور جنھیں نظر انداز کر دینا ممکن نہیں ہو سکتا اور تیسری جانب بین اقوامی سیاست میں بھی بعض ایسے تغیرات واقع ہوئے تھے جو کشمیر کے تنازعہ پر اثر انداز ہوئے بغیر

نہیں رہ سکتے تھے۔

ڈاکٹر گراہم کا مشن مارچ ۱۹۵۳ء میں ناکامی پر ختم ہوا تھا لیکن ان کی آخری سفارش کے مطابق ہند اور پاکستان کی حکومتوں نے باہمی گفت وشنید پر آمادگی کا اظہار کیا تھا چنانچہ جون ۱۹۵۳ء میں جب لندن میں دولتِ مشترکہ کے وزراء اعظم کی کانفرنس منعقد ہوئی تو ہند اور پاکستان کے وزراء اعظم پنڈت جواہر لال نہرو اور مسٹر محمد علی کے درمیان کشمیر کے سوال پر بھی تبادلہ خیالات ہوا اور یہ بات قرار پائی کہ اس معاملہ پر مزید بات چیت کراچی میں کی جائے گی۔

اس قرارداد کے مطابق ۲۵ سے ۲۷۔جولائی ۱۹۵۳ء تک ہر دو وزراء اعظم کے درمیان کراچی میں جو مذاکرات ہوئے ان کے نتیجہ میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ انھیں انجام کو پہونچانے کے لئے پاکستان کے وزیر اعظم کو دہلی آنا چاہیئے۔ لیکن ابھی یہ مذاکرات اسی مرحلہ پر تھے کہ ۹۔ اگست ۱۹۵۳ء کو کشمیر نیشنل کانفرنس کے رہنما اور ریاست کے وزیر اعظم شیخ محمد عبداللہ کی اس عہدہ سے برخواستگی اور نظربندی کی اطلاع موصول ہوگئی اور اگرچہ دفعتہً تبدیل ہو جانے والے ان حالات میں، کشمیر کے سوال پر دونوں ملکوں کی حکومتوں کے درمیان مزید گفت وشنید کو کچھ مدت کے لئے ملتوی کر دینا ہی مناسب معلوم ہوتا تھا اس کے باوجود وزیر اعظم پاکستان کے اصرار پر حکومت ہند مزید تبادلہ خیالات پر رضامند ہوگئی اور اس طرح ۱۶۔اگست ۱۹۵۳ء کو وزیر اعظم پاکستان، مسٹر محمد علی کے دہلی آنے کے بعد دونوں ملکوں کے وزرأ اعظم کے درمیان جو تبادلہ خیالات ہوا اس کے دوران میں ہندوستان کی طرف سے ایک مرتبہ پھر اس بات کی توثیق کی گئی کہ:۔

یہ سوال ریاست کے باشندوں کی خواہشات کے مطابق ہی طے کیا جانا چاہیئے[1]

---

1. Two Nations & Kashmir, P.116

اور وزراء اعظم کی اس کانفرنس میں پہلی بار یہ بھی طے ہوا تھا کہ استصواب رائے کے ناظم کو اپریل ۱۹۵۴ء سے پہلے آجانا چاہیئے۔ اور جو مسائل اس وقت تک طے نہیں ہو سکے ہیں انہیں ماہرین کی کمیٹیوں کے سپرد کر دیا جانا چاہیئے۔

ہند اور پاکستان کے وزراء اعظم کی مذکورہ بالا کانفرنس کے بعد حکومت ہند کی جانب سے جو قرطاس ابیض (وائٹ پیپر) شائع کیا گیا تھا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جہاں تک استصواب رائے کا تعلق تھا یہ بات طے کی گئی تھی کہ تقریباً سر آون ڈکسن کے تصور کے مطابق استصواب رائے علاقہ وار کرایا جائے گا اور ایڈمرل نمٹز کی بجائے کسی ایسے ملک کے نمائندہ کو استصواب رائے کا ناظم مقرر کیا جائے گا جسے اقتدار پسند ملکوں کے دونوں گروہوں سے علیحدہ اور بے تعلق کہا جا سکے۔

اس فیصلہ پر اظہار خیال کرتے ہوئے لارڈ برڈ ووڈ نے لکھا ہے کہ:

بلاشبہ مسٹر نہرو کی دونوں باتیں عقلمندی پر مبنی تھیں۔ بیرونی مبصرین ہمیشہ صرف وادی میں استصواب رائے کرائے جانے کو لازمی سمجھتے رہے ہیں لیکن علاقہ وار استصواب رائے اور صرف وادی میں استصواب رائے کرانے کی تجاویز میں فرق صرف یہ تھا کہ علاقہ وار استصواب رائے کے ذریعہ سے ان علاقوں کے باشندوں کی رائے کی توثیق ہو سکتی تھی جن کے باشندوں کی رائے پہلے ہی سے معلوم تھی اور اس طرح عملی طور پر علاقائی استصواب رائے کے ذریعہ سے صرف وادی کے باشندوں ہی کی رائے معلوم ہو سکتی تھی۔۔۔ اسی طرح (پنڈت جواہر لال نہرو کی) یہ بات بھی درست تھی کہ جو ممالک اقتدار پسندی کے تصور کے ماتحت گروہوں میں منقسم ہیں انہیں کشمیر کے تنازعہ سے علیحدہ رکھنا چاہیئے کیونکہ جہاں جہاں اقوام متحدہ کو امن برقرار

رکھنے کی جو صورت تجویز کی گئی ہے اس میں اسی اصول کو مدنظر رکھا گیا ہے[1]

لیکن ابھی ہند اور پاکستان کے وزراء اعظم کے مذکورہ بالا فیصلہ کی سیاہی بھی خشک نہ ہونے پائی تھی کہ ایک طرف تو پاکستانی اخبارات اور رہنماؤں نے نہ صرف اس فیصلہ کی مخالفت ہی شروع کردی بلکہ پاکستان میں ہندوستان کے خلاف جنگ اور جہاد کے نعرے بھی بلند ہونے لگے اور دوسری جانب پاکستان کی جانب سے مذکورہ بالا فیصلہ کے نفاذ کے سلسلہ میں چند ایسے مطالبات بھی کئے جانے لگے جو ہندوستان کے بنیادی موقف کے خلاف تھے اور جنھیں ہندوستان ابتداہی سے نامنظور اور مسترد کرتا رہا تھا مثلاً دہلی کی کانفرنس کے بعد دونوں وزراء اعظم کے درمیان جو خط وکتابت ہوئی اس میں پاکستان کی طرف سے کہا گیا تھا کہ :-

> استصواب رائے کی غیر جانبداری کو برقرار رکھنے کی غرض سے ریاستی انتظامیہ (حکومت کشمیر) کی نگرانی ضروری ہے اور اس کام کے لئے یا تو کسی غیر جانبدار (ناظر ؟) کا تقرر ہونا چاہیئے یا ہند اور پاکستان کا ایک مشترکہ کمیشن مقرر کیا جانا چاہیئے[2]

لیکن بات ظاہر ہے کہ حکومت ہند اول تو ابتدا ہی سے ریاستی انتظامیہ کے کاموں میں مداخلت کی مخالف رہی تھی اور دوسرے اس نے کسی مرحلہ پر بھی پاکستان کو ایک فریق کی حیثیت نہیں دی تھی اس لئے ہندوستان کے وزیراعظم پنڈت جواہرلال نہرو نے اپنے مکتوب مورخہ ۳ ستمبر ۱۹۵۳ء میں اس مطالبہ اور تجویز کو منظور کرنے سے انکار کر دیا۔

سطور بالا میں یہ بات بتائی جا چکی ہے کہ ہند اور پاکستان کے وزراء اعظم کی مذکورہ کانفرنس کے بعد حکومت ہند نے جو قرطاس ابیض (وہائٹ پیپر) شائع کیا تھا اس میں

---

1. Two Nations and Kashmir P.117
2. 〃 〃 〃 P.118

بنا یا گیا تھا کہ دونوں وزراء اعظم کے درمیان علاقہ وار استصواب رائے کرانے اور ایڈمرل نمٹز کی بجائے کسی غیر جانبدار ملک کے نمائندہ کو استصواب رائے کا ناظم مقرر کرنے پر اتفاق رائے ہو چکا ہے لیکن پاکستان کے وزیر اعظم کے مکتوب مورخہ ۳۱-اکتوبر سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان فیصلوں سے بھی پوری طرح متفق الرائے نہیں تھے۔ انھوں نے اپنے مکتوب میں لکھا تھا کہ :-

علاقہ وار استصواب رائے کے متعلق میرا تصور پنڈت نہرو کے تصور سے بہت زیادہ مختلف ہے اس لئے میں اس پر مزید غور کرنا نہیں چاہتا۔ اسی طرح میں ایڈمرل نمٹز کے بجائے کسی اور کے ناظم استصواب رائے مقرر کئے جانے کو بھی پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھتا ..... [1]

دہلی کانفرنس کے بعد استصواب رائے کے سلسلے میں مسٹر محمد علی نے ایک اور سوال بھی اٹھایا تھا۔ انھوں نے وزیر اعظم ہند کے نام اپنے مکتوب مورخہ ۲۷-اگست میں لکھا تھا کہ کشمیر کے پناہ گزینوں کو بھی ان کے علاقوں میں رائے دینے کی اجازت دی جائے لیکن جب پنڈت جواہر لال نہرو نے اس تجویز کو عملی دشواریوں کے پیش نظر اسے مسترد کر دیا تو مسٹر محمد علی نے اپنے مکتوب مورخہ ۳۱-اکتوبر ۱۹۵۳ء میں اپنی اسی تجویز کو دہراتے ہوئے لکھا تھا کہ :-

ہم دہلی میں اس بات پر متفق الرائے ہو گئے تھے کہ استصواب رائے کے لئے کشمیری پناہ گزینوں کی نو آبادکاری کے انتظار کی ضرورت نہیں ہے لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں اور نہ یہ ہونا ہی چاہیئے کہ ان پناہ گزین (ریاستی) شہریوں کو استصواب رائے کے موقع پر رائے دینے کے حق سے محروم کر دیا جائے۔ [2]

1-2. Two Nations and Kashmir P.119

حتیٰ کہ مسٹر محمد علی کے اس طرزِ عمل پر لارڈ برڈ ووڈ کو بھی یہ لکھنا پڑا تھا کہ :-

ہمیں اس بات پر تعجب ہے کہ اس سوال کو دہلی میں کیوں نہیں اُٹھایا گیا تھا۔[1]

مذکورہ بالا حوالوں سے اول تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ پاکستان علاقہ وار استصواب رائے اور ایڈمرل نمٹز کی جگہ کسی دوسرے شخص کے تقرر کے بنیادی فیصلہ پر بھی قائم نہیں رہنا چاہتا تھا اور دوسرے وہ ان ریاستی باشندوں کے حق رائے دہندگی کے سوال اُٹھا کر جو پناہ گزین کہلاتے تھے ان فیصلوں سے انحراف کی ایک نئی راہ پیدا کرنا چاہتا تھا حالانکہ خود مسٹر محمد علی کے اعتراف کے مطابق دہلی میں اس بات پر اتفاق رائے ہو چکا تھا کہ ان پناہ گزینوں کی نو آبادکاری کو استصواب رائے کے راستہ میں رکاوٹ نہیں بنایا جائے گا۔

پھر یہی نہیں بلکہ چند ہی روز بعد مسٹر محمد علی علاقائی استصواب رائے کے فیصلہ سے بھی دست کش ہو گئے تھے اور جہاں تک دہلی کے فیصلہ کے مطابق ایڈمرل نمٹز کی جگہ کسی دوسرے شخص کو ناظم استصواب رائے مقرر کرنے کا تعلق تھا، لارڈ برڈ ووڈ کے الفاظ میں

یہ اطلاع موصول ہوئی تھی کہ مسٹر محمد علی نے اپنی پریس کانفرنس میں کہا ہے کہ پاکستان ایڈمرل نمٹز کی بجائے کسی دوسرے شخص کے تقرر کو منظور نہیں کر سکتا۔ بلاشبہ مسٹر محمد علی کا یہ بیان ان کے سابقہ فیصلہ کی کھلی ہوئی خلاف ورزی کی حیثیت رکھتا تھا۔ مسٹر نہرو نے اپنے ہائی کمشنر مقیم کراچی مسٹر موہن سنہا مہتہ کی معرفت اس بیان کے خلاف احتجاج کیا۔ وہ مسٹر محمد علی سے ملے لیکن مسٹر محمد علی نے یہ کہہ کر بات کو ٹال دیا کہ اخبارات نے میری صحیح ترجمانی نہیں کی ہے۔[2]

اور یہ بات ظاہر ہے کہ ان حالات میں ہندوستان تنہا دہلی کانفرنس کے فیصلوں کو عملی جامہ نہیں پہنا سکتا تھا۔

---

1. Two Nations and Kashmir P.118
2. " " " P.122

پاکستان کی طرف سے دہلی کانفرنس کے فیصلوں کو ناکام بنانے کی جو مسلسل کوششیں کی گئی تھیں اور آخر میں مسٹر محمد علی نے ان تمام فیصلوں سے جس طرح انحراف کیا تھا اس کے پیشِ نظر اگر ہندوستان آئندہ کشمیر کے سوال پر پاکستان کے ساتھ گفت و شنید سے انکار کر دیتا تو بھی اس پر کسی قسم کا اعتراض نہیں کیا جا سکتا تھا لیکن دہلی کانفرنس کے فیصلوں سے پاکستان کے انحراف کے علاوہ کچھ اور ایسے حالات بھی رونما ہوئے تھے جنھیں حکومت ہند کے لئے نظر انداز کر دینا ممکن نہیں ہو سکتا تھا۔ ان نئے حالات کی بدولت کشمیر کے سوال کی نوعیت بالکل ہی بدل گئی تھی۔

سطور بالا میں بتایا جا چکا ہے کہ دہلی کانفرنس میں یہ بات بھی طے کی گئی تھی کہ جن مسائل کا ابھی تک کوئی فیصلہ نہیں ہو سکا ہے انھیں ماہرین کی کمیٹیوں کے سپرد کر دیا جائے۔ اور اگرچہ اس فیصلہ کے بعد کے واقعات سے یہ بات واضح ہو گئی تھی کہ پاکستان دہلی کانفرنس کے تمام فیصلوں سے انحراف کر رہا ہے اس کے باوجود جب دسمبر ۱۹۵۳ء کے شروع میں پاکستان کی طرف سے اس کمیٹی کے تقرر کی تحریک کی گئی تو ہندوستان نے اسے منظور کر لیا اور مسٹر محمد علی کے مکتوب مورخہ یکم دسمبر ۱۹۵۳ء کے مطابق اس کمیٹی کو

۱۔ (الف) ریاست جموں اور کشمیر کو افواج سے خالی کرانے

(ب) ناظم استصواب رائے کے باقاعدہ تقرر کے سلسلہ میں پیش آنے والے مسائل کو طے کرنے اور

۲۔ ۲۰۔ اگست ۱۹۵۳ء کے مشترکہ اعلانیہ (دہلی کانفرنس کے فیصلوں) کو عمل میں لانے کے لئے دفعہ (۱) کے سلسلہ میں دوسرے ضروری اقدامات کرنے[1] کا کام سپرد کیا گیا اور اس کا اجلاس دہلی میں منعقد ہوا۔

---

1. Two Nations and Kashmir P.123

ابھی ریاست جموں اور کشمیر کے سوال کو طے کرنے کی یہ کوششیں جاری ہی تھیں کہ پاکستان اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے درمیان فوجی امداد کے معاہدہ کی بات چیت شروع ہو گئی اور اگرچہ اس معاہدہ کی تکمیل مئی ۱۹۵۴ء کے تیسرے ہفتہ میں ہوئی تھی لیکن کشمیر کے سوال پر اس معاہدے کا جو اثر پڑ سکتا تھا اس کا اندازہ گفت و شنید کے آغاز ہی میں کر لیا گیا تھا چنانچہ ہندوستان کے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنے مکتوب مورخہ ۲۱۔ دسمبر ۱۹۵۳ء میں مسٹر محمد علی کو معاہدہ کی اس بات چیت کی نوعیت واضح کرنے کے لئے لکھا تھا گو انھوں نے اس کے جواب میں یہ کہہ کر معاملہ کو وقتی طور پر گذشت کرنے کی کوشش کی تھی کہ فوجی امداد لینے اور باقاعدہ فوجی معاہدہ کرنے میں بہت زیادہ فرق ہے لیکن ظاہر ہے کہ یہ جواب ہندوستان کو مطمئن نہیں کر سکتا تھا۔

بہر حال اس ماحول میں جب دہلی کانفرنس کے فیصلہ کے مطابق دسمبر ۱۹۵۳ء کے اواخر میں ریاست کو افواج سے خالی کرانے اور ناظم استصواب رائے کے باقاعدہ تقرر کے سلسلہ میں پیش آنے والے سوالات کو طے کرنے کی غرض سے دہلی میں ہند اور پاکستان کی طرف سے مقرر کی ہوئی مشترکہ کمیٹیوں کا اجلاس شروع ہوا تو ان میں امریکی امداد کا سوال بھی زیر بحث آیا اور مسٹر محمد علی نے اپنے خط مورخہ ۱۴۔ جنوری ۱۹۵۴ء کو اس معاملہ کو زیر بحث لانے پر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے لکھا کہ

اس معاملہ پر بحث کرنا کمیٹیوں کی حدود اختیارات سے باہر ہے۔[1]

لیکن جیسا کہ آئندہ سطور سے واضح ہو جائے گا ہندوستان اس نئی صورت حال کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا اور پاکستان اس صورت حال کے سلسلہ میں کوئی اطمینان بخش جواب دینے کے لئے تیار نہیں تھا اس لئے ان کمیٹیوں کا کام جاری نہیں رہ سکتا تھا چنانچہ

1. Two Nations and Kashmir P.123

جنوری ۱۹۵۴ء کے وسط میں ان کمیٹیوں کے کام کو غیر معین مدت کے لئے ملتوی کر دیا گیا۔

باہمی گفت وشنید کے اس مرحلہ پر بھی ہندوستان تصفیہ سے متعلق اپنے تمام تر سابقہ فیصلوں اور پاکستان کے ساتھ کئے ہوئے تمام تر سمجھوتوں پر عمل درآمد کرنے کے لئے تیار تھا چناں چہ فروری ۱۹۵۴ء کے آغاز میں جب ریاست جموں اور کشمیر کے وزیر اعظم بخشی غلام محمد نے دہلی میں ایک بیان دیتے ہوئے اس توقع کا اظہار کیا کہ کشمیر کی مجلس آئین ساز ہندوستان کے ساتھ ریاست کے الحاق کی تصدیق کر دے گی تو اخبار ڈیلی آبزرور، لندن کے نامہ نگار مسٹر فلپس ڈیا نے لکھا تھا کہ

> جیسا کہ مجھے تفصیل کے ساتھ بتایا گیا ہے ہندوستان کا زاویۂ نظر یہ ہے کہ مسٹر نہرو اب تک اپنے ۲۴-جولائی ۱۹۵۲ء والے بیان پر عمل درآمد کرنے کے لئے تیار ہیں ...... بشرطیکہ اس بیان پر عمل درآمد کے سلسلہ میں ابتدائی باتوں کے متعلق بات چیت سے کوئی فیصلہ ہو جائے لیکن اب یہ بات چیت اس وقت تک ممکن نہیں ہو سکتی جب تک ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی طرف سے پاکستان کو ملنے والی امداد اور اس سلسلہ میں ان دونوں ملکوں کے درمیان ہونے والے معاہدہ کی تفصیلات معلوم نہ ہو جائیں۔[1]

اور مسٹر ڈیا نے کے مذکورہ بالا بیان کی تصدیق ہندوستان کے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو کے ان بیانات سے بھی ہوتی ہے جو انھوں نے ۱۹ اور ۲۲ فروری ۱۹۵۴ء کو پارلیمنٹ میں دئے تھے اور جس میں انھوں نے کہا تھا کہ کشمیر سے متعلق

> ہندوستان نے جو وعدے کئے ہیں وہ ان پر قائم ہے لیکن ان وعدوں کو رونما ہونے والے دوسرے واقعات کی روشنی میں ضروری تبدیلیوں کے ساتھ پورا کیا جائے گا۔[2]

1-2. Two Nations Kashmir P.124

پھر اسی قدر نہیں بلکہ ۲۴-فروری ۱۹۵۴ء کو جب مسٹر محمد علی نے اپنے ایک مکتوب میں وزیراعظم کشمیر بخشی غلام محمد کے بعض بیانات اور ریاست کی مجلس دستور ساز کی طرف سے ہندوستان کے ساتھ ریاست کے الحاق کے فیصلہ کی تصدیق پر اعتراض کرتے ہوئے لکھا کہ یہ باتیں اس سمجھوتہ کے خلاف ہیں جو دہلی میں ہمارے درمیان ہوا تھا تو وزیراعظم ہند پنڈت جواہرلال نے ۵-مارچ ۱۹۵۴ء کو اس خط کا جواب دیتے ہوئے لکھا:

..... کشمیر کی آئین ساز اسمبلی کے سلسلہ میں ہماری پوزیشن بالکل صاف رہی ہے اور ہم مجلس تحفظ کے روبرو اور دوسرے مواقع پر اپنی اس پوزیشن کو واضح کرتے رہے ہیں۔ اس وقت (کشمیر کی آئین ساز اسمبلی کے قیام کے وقت) ہم نے کہا تھا کہ دستور ساز اسمبلی ریاست کے الحاق اور دوسرے معاملات سے متعلق فیصلہ کرنے میں بالکل آزاد ہے لیکن جہاں تک ہمارا تعلق ہے۔ ہم نے بین اقوامی طور پر جو وعدے کئے ہیں ہم ان پر قائم رہیں گے۔ ہمارے لئے ریاست کی آئین ساز اسمبلی کے فیصلوں کی تردید کرنے کا کبھی وقت بھی کوئی سوال پیدا نہیں ہو سکتا اور ہمیں ایسا کرنے کا حق بھی نہیں پہونچتا۔ اس منتخبہ اسمبلی کو جس طرح وہ چاہے اپنی خواہشات کے اظہار کا حق حاصل ہے۔ ہمارے نقطۂ نظر سے ہندوستان کے ساتھ ریاست کے الحاق کا اکتوبر ۱۹۴۷ء والا فیصلہ قانونی اور دستوری اعتبار سے بالکل مکمل ہے اور اب اس کی تصدیق و توثیق کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ ان باتوں کے باوجود ہم نے کہا تھا کہ کشمیر کے باشندوں کو اپنی مرضی کے مطابق اپنا مستقبل طے کرنے کے لئے موقع دیا جانا چاہیئے اور ہم مناسب حالات میں استصواب لئے کرانے پر رضامند ہو گئے تھے۔ ہم اس تمام مدت میں اس شرط کے ساتھ اپنی بات پر قائم رہے ہیں کہ وہ مناسب حالات پیدا ہو جائیں جن میں ایسا ندازانہ

اور پُر امن استصواب رائے کرایا جا سکے اور چوں کہ ان شرائط پر اتفاق رائے
نہیں ہو سکا اس لئے اس (استصواب رائے) میں دیر ہوتی رہی۔[1]

وزیراعظم کے مکتوب مورخہ ۵ - مارچ ۱۹۵۴ء کے مذکورہ بالا اقتباس سے یہ چند باتیں بالکل صاف ہو جاتی ہیں کہ تصفیہ کی راہ میں پاکستان کی طرف سے مسلسل رکاوٹیں ڈالے جانے کے باوجود ہندوستان برابر اپنے وعدوں پر قائم رہا تھا - ریاست کے الحاق کے فیصلہ کو قانونی اور دستوری طور پر صحیح اور آخری سمجھنے کے باوجود ہندوستان نے اپنی طرف سے مناسب حالات اور سازگار ماحول میں ریاست کے مستقبل کے متعلق عوام کی خواہشات معلوم کرنے کی جو پیش کش کی تھی ریاست کی مجلس آئین ساز کی جانب سے الحاق کی تصدیق کی شکل میں ان خواہشات کے اظہار کے بعد بھی اس نے اپنی اس پیشکش کو واپس نہیں لیا تھا اور یہ کہ ہندوستان کی مذکورہ بالا پیش کش جن شرائط کے ساتھ مشروط تھی وہ نہ صرف پوری ہی نہیں ہو سکی تھیں بلکہ ریاستہائے متحدہ امریکہ کی طرف سے پاکستان کو فوجی امداد دینے کی جو بات چیت ہو رہی تھی اس نے ماحول کو اور بھی ناساز گار بنا دیا تھا اور ان حالات میں ہندوستان کے اس فیصلہ کو کسی زاویۂ نظر سے بھی غیر مناسب قرار نہیں دیا جا سکتا کہ جب تک اسے پاکستان کو امریکہ کی طرف سے ملنے والی امداد کی تفصیلات معلوم نہ ہو جائیں مزید بات چیت کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہو سکے گا لیکن سوال یہ ہے کہ کشمیر کے سلسلہ میں ہندوستان کی طرف سے ریاست ہائے متحدہ امریکہ اور پاکستان کے درمیان فوجی امداد کی اس بات چیت کو جو بعد میں باقاعدہ معاہدہ کی شکل اختیار کر گئی تھی اس درجہ اہمیت کیوں دی گئی تھی ؟

اس بات کو تفصیل کے ساتھ دہرانے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی کہ اس وقت تک کشمیر کے تنازعہ کو حل کرنے کے راستے میں واحد رکاوٹ یہ رہی تھی کہ ہندوستان ریاست کے

1. Two Nations and Kashmir P.125

تحفظ کی ان ذمہ داریوں کو نظر انداز نہیں کرنا چاہتا تھا جو اکتوبر ۱۹۴۷ء میں ریاست کے الحاق کے بعد اس پر عائد ہو گئی تھیں اور وہ ابتدا ہی سے اپنی ان ذمہ داریوں کو محسوس کرتا اور مجلس تحفظ کی اس طرف توجہ دلاتا رہا تھا اور اب جبکہ پاکستان ہے کشمیر کے معاملہ میں غیر آئینی طور پر ایک فریق بنا دیا گیا تھا اور جو ہر حال میں ریاست جموں اور کشمیر کا ایک حصہ ہتیا لینے پر تلا ہوا تھا، دنیا کے ایک عظیم ملک سے فوجی امداد لینے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ کیا ریاست جموں اور کشمیر کے تحفظ کے سلسلہ میں ہندوستان کی ذمہ داریاں پہلے سے کہیں زیادہ نہیں ہو گئی تھیں اور اس نے اس نئی صورتِ حال کے رونما ہونے سے پہلے پاکستان کے ساتھ تصفیہ کی جو بات چیت شروع کی تھی کیا ان نئے حالات میں اس بات چیت کو پرانی بنیادوں پر جاری رکھ سکتا تھا؟ خصوصاً اس حال میں تو بات چیت کو جاری رکھنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا تھا جب کہ ہندوستان گفت و شنید کے ہر مرحلہ پر اس امر کو واضح کرتا رہا تھا کہ وہ فیصلہ کے سلسلہ میں ان نئے حالات کو نظر انداز نہیں کرے گا جو رونما ہوں گے اور ان نئے حالات کے مطابق وہ ضروری تبدیلیوں کے ساتھ اپنے وعدوں کو پورا کرے گا۔

ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی طرف سے پاکستان کو ملنے والی فوجی امداد کی وجہ سے ہندوستان کو جو خطرہ لاحق ہو سکتا تھا، لارڈ برڈ وڈ جیسے پاکستان کے حامی نے اس کا اعتراف ان الفاظ میں کیا:-

> میں کسی گذشتہ باب میں پاکستان کی اس فوجی برتری کی طرف اشارہ کر چکا ہوں جو ۱۹۴۸ء کی مختصر سی فوجی مہم میں ان حالات کی بدولت اسے حاصل ہو گئی تھی جن حالات میں ہندوستان، جموں کے مغرب کی طرف سے گذرنے والے ناقابل استعمال اور ایسے راستہ سے جس پر آسانی کے ساتھ حملہ کیا جا سکتا تھا، محاذِ جنگ تک اپنی فوج بھیجنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ اس کے برعکس پاکستان

اپنی افواج کو بہت دُور لے جائے بغیر متعدد متبادل مقامات میں سے کسی مقام کو
بھی حملہ کے لئے منتخب کر سکتا تھا۔ اس صورتِ حال میں پاکستان نے امریکہ سے
جو فوجی امداد لی تھی اس کے متعلق (پنڈت) نہرو کے اندیشوں کو ایک حد تک بجا
کہا جا سکتا ہے۔ بلاشبہ (پنڈت جی کے) فوجی مشیروں نے اس صورتِ حال کی طرف
ان کی توجہ مبذول کرائی تھی اور اس میں شک نہیں کہ اگر وہ ایسا نہ کرتے اور
اس مسئلہ کو اپنے تحفظ کے نقطۂ نظر سے نہ دیکھتے تو وہ اپنے فرض کو نظر انداز
کر دینے کے جرم کے مرتکب ہوتے۔[1]

لارڈ برڈوڈ کی طرف سے ہندوستان کے اندیشوں کی اس تصدیق کے بعد یہ کہنے کی کوئی گنجائش
باقی نہیں رہ جاتی کہ پاکستان کو امریکہ سے فوجی امداد ملنے کے بعد ہندوستان نے تصفیہ کی
بات چیت کو ملتوی کر کے اپنے کسی اصول یا وعدہ سے انحراف کیا تھا۔

ریاست ہائے متحدہ امریکہ اور پاکستان کے درمیان مذکورہ بالا فوجی امداد کی بات چیت
سے قبل اور اس کے بعد کشمیر کے تنازعہ کو طے کرنے کے سلسلہ میں ہندوستان کا نقطۂ نظر اور
طرزِ عمل کیا رہا تھا؟ ہندوستان کے وزیرِ اعظم نے اپنے ایک بیان میں اس مضمون پر ان الفاظ میں
روشنی ڈالی ہے:

> ایوان کو یہ بات فراموش نہ ہوسکی ہوگی کہ ہم گذشتہ تین سال سے پاکستان کو یہ
> پیشکش کرتے رہے ہیں کہ ہمیں ایک دوسرے سے جنگ نہ کرنے کا ایک اعلان
> کر دینا چاہیئے ۔۔۔۔ ہم برابر یہ پیشکش کرتے رہے اور اسباب خواہ کچھ
> بھی کیوں نہ ہوں پاکستان برابر ہماری اس پیش کش کو نامنظور کرتا رہا ہے۔ اگر
> جنگ نہ کرنے کا یہ اعلان یا ایک دوسرے پر حملہ نہ کرنے کا یہ معاہدہ ہو گیا ہوتا

---

1. Two Nations and Kashmir, P.134

تو ظاہر ہے کہ اس سے دونوں ملکوں اور گرد و پیش کے علاقوں میں کشیدگی کم ہو جاتی اور دونوں ملکوں میں سلامتی کا احساس بڑھ جاتا۔ اب پاکستان کی طرف سے ہماری اس تجویز (جنگ نہ کرنے کے اعلان کی پیشکش) کی نامنظوری کے پس منظر میں ہمیں اس امداد کا جائزہ لینا چاہیئے جو ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی طرف سے پاکستان کو دی جا رہی ہے۔ میں یہ کہنے کی جرأت کر رہا ہوں کہ آج کے حالات میں اس بات کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ چین یا ہندوستان کی طرف سے پاکستان پر حملہ کیا جائے گا۔

پھر امریکہ سے فوجی امداد لینے کے سلسلہ میں پاکستان حملہ کے اندیشے کا جو عذر پیش کر رہا ہے اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ...... جہاں تک میرا تعلق ہے میں عام حالات میں پاکستان کے اقتصادی اور فوجی استحکام کا استقبال کروں گا اور اگر پاکستان اپنی تعمیر کرتا ہے تو مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا لیکن موجودہ صورت حال عام اور معمولی نہیں بلکہ غیر معمولی ہے۔ اس کی بدولت معمولی حالات میں انتشار پیدا ہو گیا ہے اور اسی لئے یہ صورت حال امن کی راہ سے انحراف ہے۔

ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے صدر نے کہا ہے کہ اگر پاکستان نے امریکہ کی دی ہوئی امداد کو غلط طریقے سے استعمال کیا اور اس امداد سے دوسرے ملک پر جارحانہ حملہ کیا تو وہ اس حملہ کو ناکام بنانے کی ذمہ داری قبول کرتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ امریکہ کے صدر جارحانہ حملوں کے مخالف ہیں۔ لیکن ماضی کے تجربہ نے ہمیں بتایا ہے کہ جارحانہ حملے ہو جاتے ہیں اور انھیں ناکام بنانے کے لئے کوئی قدم نہیں اُٹھایا جاتا۔ چناں چہ آج سے ساڑھے چھ سال پہلے

کشمیر پر بھی جارحانہ حملہ ہو چکا ہے اور اس کے نتائج بے حد نقصان رساں برآمد ہوئے ہیں۔ لیکن اس وقت ریاست ہائے متحدہ امریکہ نے نہ صرف اس کی مذمت کرنے ہی سے گریز کیا ہے بلکہ امن کے نام پر ہم سے کہا جا رہا ہے کہ ہمیں پاکستان کی مذمت کے سوال پر زور نہیں دینا چاہیئے۔ آئندہ بھی جارحانہ حملہ ہو سکتا ہے اور جب تک اس کا پوشیدہ رکھنا ناممکن نہ ہو جائے ماضی کی طرح اس جارحانہ حملہ سے بھی انکار کیا جا سکتا ہے۔ اگر جارحانہ حملہ کے لئے مناسب حالات پیدا کر دئے جائیں تو ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی اس خواہش کے باوجود کہ جارحانہ حملہ نہ ہو یہ حملہ ہو کر رہے گا۔ اس کے بعد اس بات پر بھی بحث کی جاتی رہے گی کہ یہ حملہ جارحانہ حملہ تھا یا نہیں اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی طرف سے پاکستان کو جو فوجی امداد دی گئی ہے اس سے ایسے حالات پیدا ہو سکتے ہیں جن سے جارحانہ حملہ میں سہولتیں پیدا ہوں اور اس کی ہمت افزائی ہو سکے۔

جیسا کہ میں بار بار کہتا رہا ہوں ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی طرف سے پاکستان کو دی جانے والی اس فوجی امداد نے ہندوستان میں ہمارے ہی لئے نہیں بلکہ پورے ایشیا کے لئے ایک خطرناک صورت حال پیدا کر دی ہے۔ اس کی وجہ سے ہماری کشیدگیاں بڑھ گئی ہیں اور اس کی بدولت ان سوالات کو حل کرنا اور بھی دشوار ہو گیا ہے جو ہند اور پاکستان کو درپیش ہیں۔ ہند اور پاکستان دونوں کے لئے ان سوالات کو حل کرنا اور ان دوستانہ تعلقات اور اس اشتراکِ عمل کو ترقی دینا بے حد ضروری ہے جو دو ہمسایہ ملکوں کی جغرافیائی پوزیشن اور مشترک تاریخ کے تقاضوں پر مبنی ہیں۔ ان سوالوں کو خود دونوں ملک ہی طے کر سکتے ہیں انہیں دوسروں کی مداخلت کے ذریعہ سے طے نہیں کیا

جا سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ ماضی میں دوسرے ملکوں کی اس مداخلت کے باعث اب تک یہ سوالات طے نہیں ہو سکتے۔ حال ہی میں ہند اور پاکستان کے درمیان ایک نیا دوستانہ ماحول پیدا ہو گیا تھا اور دونوں ملکوں کے وزراء اعظم کی براہِ راست گفت و شنید کی بدولت ان مسائل کو حل کرنے کے سلسلہ میں پیش رفت ہو رہی تھی۔ لیکن اب یہ پیش رفت رک گئی ہے اور نئی دشواریاں پیدا ہو گئی ہیں ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی طرف سے پاکستان کو جو فوجی امداد دی جا رہی ہے (ہند اور پاکستان کے) ان مسائل میں ایک قسم کی مداخلت ہے اور اس کی بدولت سابقہ اقسام کی مداخلتوں کے مقابلے میں زیادہ دُور رس نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔ پاکستان کے وزیر اعظم نے کہا ہے کہ ...... یہ فوجی امداد کشمیر کے سوال کو حل کرنے میں مدد دے گی۔ اس (بیان) سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ ان کا ذہن کس سمت میں کام کر رہا ہے اور وہ اس فوجی امداد کو کس طرح کام میں لانے کی بات سوچ رہے ہیں۔ فوجی امداد صرف جنگ کے لئے یا جنگ کی دھمکی دینے ہی کے لئے استعمال کی جا سکتی ہے۔

کشمیر کے متعلق ایک بات اور بھی ہے۔ ایوان کو اس تنازعہ کی طویل تاریخ یاد ہو گی اور یہ بات بھی فراموش نہ ہوئی ہو گی کہ پچھلے دو سال سے جن سوالات پر بات چیت ہوتی رہی ہے ان میں یہ سوال بھی شامل رہا ہے کہ استصواب رائے کرانے سے پہلے کشمیر میں رکھی جانے والی اور وہاں سے واپس بلائی جانے والی افواج کی تعداد کیا ہونی چاہیئے۔ اس سوال پر اب تک کوئی سمجھوتہ نہیں ہو سکا۔ اب جبکہ سرحد کے پار، خطِ جنگ بندی کی دوسری جانب، فوجوں کی ایک بہت بڑی تعداد باہر سے پاکستان میں بھیجی جا رہی ہے۔ اور ان فوجی

کو پاکستان کی مرضی پر چھوڑا جا رہا ہے۔ اس تمام سوال کو ایک بالکل مختلف
زاویۂ نظر سے دیکھا جانا چاہیئے۔ اس نئی صورت حال نے معاملہ کی نوعیت
میں بہت بڑا فرق پیدا کر دیا ہے۔[1]

کشمیر کے سلسلہ میں ہند اور پاکستان کی گفت و شنید کو ریاست ہائے متحدہ امریکہ
اور پاکستان کے درمیان فوجی امداد کی مذکورہ بالا بات چیت اور اس کی بنیاد پر ہونے والے معاہدے
ہی نے متاثر نہیں کیا تھا بلکہ اس تنازعہ کے شروع ہونے کے بعد سے بین اقوامی حالات میں جو عظیم
تبدیلیاں رونما ہوتی رہی تھیں تصفیہ کی کسی بات چیت میں انہیں بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔
مثلاً ۱۹۴۹ء میں ناٹو (نارتھ اٹلانٹک ٹریٹی آرگنائزیشن)[2] کا قیام عمل میں آیا تھا اور اس میں
ان تمام بڑی طاقتوں کے علاوہ جن کی بدولت اس وقت تک کشمیر کا سوال حل نہیں ہو سکا تھا،
ترکی بھی شامل تھا۔ پھر جب ۱۹۵۴ء میں ناٹو کی طرح جنوب مشرقی ایشیا کے ملکوں کی ایک تنظیم سیاٹو
(ساؤتھ ایسٹ ایشیا ٹریٹی آرگنائزیشن)[3] کے نام سے قائم کی گئی تو اس میں ریاست ہائے متحدہ
امریکہ اور برطانیہ کے ساتھ پاکستان بھی شامل ہو گیا اور جب ۱۹۵۵ء میں مغربی ایشیا کے
ملکوں کی تیسری فوجی تنظیم بغداد پیکٹ[4] کے نام سے عالم وجود میں آئی تو یہ محض پاکستان، ایران،
ترکی اور عراق پر مشتمل تھی اور اس طرح پاکستان ایک طرف تو براہ راست سیاٹو کا رکن بن چکا تھا دوسری

۱۔ وزیراعظم کے اس بیان کا اقتباس جو انھوں نے یکم مارچ ۱۹۵۷ء کو پارلیمنٹ میں دیا تھا۔

2. North Atlantic Treaty Organization

3. South Eaat Asia Treaty Organization

4. Baghdad Pact

(نوٹ: اس تنظیم کا نام سنٹرل ٹریٹی آرگنائزیشن (Central Treaty Organization) کر دیا گیا ہے۔ لیکن عراق اس میں شامل نہیں رہا۔)

طرف ترکی، برطانیہ اور امریکہ کی وساطت سے ناٹو کے ساتھ بھی اس کا تعلق قائم ہو گیا تھا اور تیسری طرف بغداد پیکٹ پر مبنی تنظیم میں اُسے ایک ممتاز حیثیت حاصل تھی اور ان تمام باتوں نے اس فوجی امداد کو خصوصیت کے ساتھ قابلِ توجہ بنا دیا تھا جو اسے ریاست ہائے متحدہ امریکہ سے مل رہی تھی اور ہندوستان کے لئے جو ابتدا ہی سے فوجی معاہدوں اور فوجی گروہ بندیوں کا مخالف رہا ہے کشمیر کے تنازعہ کے سلسلہ میں ان اہم واقعات کو نظر انداز کر دینا ممکن نہیں ہو سکتا تھا۔

باب کے آغاز میں اس بات کی طرف اشارا کیا جا چکا ہے کہ گراہم مشن کی ناکامی کے بعد خود کشمیر کے حالات میں بھی بعض ایسی تبدیلیاں رونما ہوئی تھیں جنھیں ہندوستان کے ساتھ اس ریاست کے فیصلہ کے سلسلہ میں بے حد اہمیت حاصل تھی اور جنھیں نظر انداز کر دینا ممکن نہیں ہو سکتا تھا اور اس باب کو ختم کرنے سے پہلے اختصار کے ساتھ ان تبدیلیوں کا تذکرہ کر دینا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے۔

گزشتہ اوراق میں اس بات کو وضاحت کے ساتھ بیان کیا جا چکا ہے کہ اکتوبر ۱۹۴۷ء میں ریاست جموں اور کشمیر پر جارحانہ حملہ کے بعد ریاست کی سب سے بڑی عوامی سیاسی تنظیم نیشنل کانفرنس کی حمایت سے ریاست کے حکمران مہاراجہ ہری سنگھ نے اپنے ان اختیارات سے کام لے کر جو ہندوستانی ریاستوں کے حکمرانوں کو ۱۹۴۷ء کے انڈین انڈیپنڈنس ایکٹ کے ماتحت دئے گئے تھے، ریاست جموں اور کشمیر کا الحاق ہندوستان کے ساتھ کیا تھا اور اس کے بعد یہ ریاست ہندوستان کا ایک لاینفک حصہ بن گئی تھی۔ اس صورت میں ہندوستان اپنی فوجی طاقت کو کام میں لا کر حملہ آوروں کو ریاست سے نکال سکتا تھا لیکن اس نے اپنی فوجی طاقت کے استعمال کو صرف دفاعی اور حفاظتی حدود تک ہی محدود رکھا تھا اور اس امر کے پیشِ نظر کہ اقوامِ متحدہ کی اخلاقی مداخلت کی بدولت ایک جانب تو دو ہمسایہ ملکوں

— ہند اور پاکستان — کے تعلقات زیادہ خوش گوار پائدار اور محفوظ ہو سکیں گے اور دوسرے کشمیر کے مستقبل پر بین اقوامی تصدیق کی مہر ثبت ہو سکے گی۔ کشمیر کے سوال کو مجلسِ تحفظ میں پیش کر دیا تھا لیکن مجلسِ تحفظ میں اس سوال کو جس طرح بین اقوامی سیاست اور اختلافات کے ساتھ وابستہ کر دیا گیا تھا اس کی بدولت یہ سوال طے ہونے کی بجائے پیچیدہ تر ہوتا جا رہا تھا اور یہ بڑھتی ہوئی پیچیدگیاں خود ریاست کے باشندوں کے مستقبل کو نقصان پہونچا رہی تھیں۔

ریاست جموں اور کشمیر کے باشندے ابتداء ہی سے اس صورت حال اور اس کے نتائج کو محسوس کر رہے تھے۔ انھیں بجا طور پر اس بات کا احساس تھا کہ مجلسِ تحفظ کشمیر کے الحاق کے متعلق کسی مناسب فیصلہ پر پہونچنے میں جو ناواجب تاخیر کر رہی ہے اس کی بدولت ریاست کی سماجی اور اقتصادی ترقیاں رک گئی ہیں اور وہ اپنی آنکھوں سے یہ بات دیکھ رہے تھے کہ ہندوستان کی دوسری ریاستیں جمہوری ترقیوں کے تمام میدانوں میں آگے بڑھتی چلی جا رہی ہیں۔ ہندوستان کی طرف سے جب کشمیر کے سوال کو مجلسِ تحفظ میں پیش کیا گیا تھا تو نیشنل کانفرنس اور ریاست کے باشندوں کی اکثریت کو اس بات کا یقین تھا کہ ہندوستان کے اس اقدام کی بدولت انھیں اپنے مستقبل کے متعلق اپنے سابقہ فیصلہ (ہندوستان کے ساتھ الحاق کے فیصلہ) کی توثیق کا موقع مل سکے گا۔ چنانچہ اس الحاق کے پورے ایک سال بعد اکتوبر ۱۹۴۸ء میں انھوں نے نیشنل کانفرنس کے ایک اسپیشل کنونشن میں جو قرارداد منظور کی تھی اس میں کہا تھا کہ:

..... اس لئے ان حالات میں یہ کنونشن ہندوستان کے ساتھ عارضی الحاق کی تصدیق کرتا ہے اور اس بات کا عہد کرتا ہے کہ 'نیا کشمیر'ع کی بنیاد پر جس کا

ع کشمیر کی تعمیر اور ترقی کا وہ خلاصہ جسے نیشنل کانفرنس نے ۱۹۴۴ء میں اپنا نصب العین قرار دیا تھا

نفاذ اور تکمیل ہمارا سب سے پہلا کام ہو گیا ۔ ہم ہندوستان کے ساتھ ریاست کے قطعی الحاق کی حمایت کریں گے ۔ یہ کنونشن مد لیقین تک اس امر کی امید کرتا ہے کہ ہندوستان کی حکومت اور عوام کی جانب سے کشمیر کے باشندوں کو ان کی اقتصادی تعمیر کا نصب العین اور سیاسی آزادی کا مقصد حاصل کرنے میں تمام تر مادی ، اخلاقی اور سیاسی امداد دی جائے گی ۔"[1]

اور کنونشن کے مذکورہ بالا فیصلہ پر اظہار خیال کرتے ہوئے ، نیشنل کانفرنس کے سابق رہنما شیخ محمد عبداللہ نے کہا تھا :

جموں اور کشمیر نیشنل کانفرنس کے بلائے ہوئے اسپیشل کنونشن نے ملک کے لیے ایک واضح راہ کھول دی ہے ۔ ایک سال تک سخت مصیبتوں میں مبتلا رہنے ، تلخ تجربات کرنے اور غور و فکر کرتے رہنے کے بعد انجام کار ہم نے ایک ایسا فیصلہ کر لیا ہے جو ریاستی باشندوں کی آنے والی نسلوں پر بھی اثر انداز ہوگا ہم اپنے اس فیصلے پر خوش ہیں کیونکہ ہمارا یہ فیصلہ اسلام کے اصول کے بھی مطابق ہے ۔"[2]

پھر انھوں نے نیشنل کانفرنس کے اسی فیصلہ کی اصابت پر زور دیتے ہوئے دہلی میں ایک اخباری نمائندہ سے کہا تھا کہ :

ہم جموں اور کشمیر کے باشندوں نے ہندوستانیوں کے ساتھ اپنے مقدر کو جذبات کی رو میں بہہ کر یا پھر مایوسی کی حالت میں وابستہ نہیں کیا بلکہ ہم نے جو کچھ کیا ہے پوری طرح سوچ سمجھ کر کیا ہے ۔ ہمارے عوام کا یہ اتحاد ہمارے نظریات کی یکسانیت اور آزادی کے حصول کی جدوجہد میں ایک دوسرے

1. Kashmir Decides its Destiny, P.3
2. " " " " P.4

کے دوش بدوش بہتیں جھیلنے کا نتیجہ ہے۔ ہندوستان نے غیر مذہبی جمہوریت کے قیام کا عہد کیا ہے اور ہمارا مقصد بھی یہی ہے[1]

جموں اور کشمیر نیشنل کانفرنس ہندوستان کے ساتھ ریاست کے الحاق کے متعلق جو رائے رکھتی تھی اس کے پیشِ نظر قدرتی طور پر اس کی خواہش یہی ہو سکتی تھی کہ ریاست کے باشندوں کو جلد از جلد ان کے فیصلۂ الحاق کی توثیق کا موقع دیا جائے اور اس طرح ہندوستان کے ساتھ ریاست جموں اور کشمیر کے الحاق پر اقوامِ متحدہ کی مہرِ تصدیق بھی ثبت ہو جائے۔ لیکن جب انھوں نے محسوس کیا کہ مجلسِ تحفظ میں کچھ ایسے طاقت ور عوامل کام کر رہے ہیں جن کی بدولت ریاستی عوام کی خواہشات کے مطابق اس سوال کو طے کرنے میں غیر ضروری تاخیر کی جا رہی ہے اور جب انھیں اس بات کا یقین ہو گیا کہ جب تک مجلسِ تحفظ کے اراکین کے ذہن اور دماغ بین اقوامی کش مکش کے اثرات سے پاک نہ ہوں گے مجلسِ تحفظ عوام کی خواہشات کے مطابق کشمیر کے سوال کا کوئی اطمینان بخش حل دریافت نہ کر سکے گی تو انھوں نے بے یقینی کی اس حالت کو ختم کرنے کا ارادہ کر لیا۔

شیخ محمد عبداللہ نے جو اس وقت ریاست کے باشندوں کی صحیح ترجمانی کر رہے تھے نیشنل کانفرنس کے انیسویں اجلاس میں اسی صورتِ حال کا احاطہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ:

> اقوامِ متحدہ کے منشور میں، قوموں کی بنیادی آزادیوں کے اعلان کے بعد ہی ہمارے ملک کو کسی اشتعال کے بغیر وحشیانہ حملہ کا نشانہ بنایا گیا تھا ہم نے اس جارحانہ حملہ کو جس کے نتیجہ میں ریاست کے ہزارہا باشندوں کو ناقابلِ بیان مصیبتوں کا شکار ہونا پڑا ہے، ختم کرانے کے لئے ادارہ اقوامِ متحدہ کی توجہ دلائی لیکن کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ ہمارے لئے یہ بات بے حد

1. National Herald, June 19, 1948

تعجب انگیز ہے کہ حملہ آور کے جرم کے متعلق کوئی واضح فیصلہ صادر کرنے کی بجائے
ہمارے حق الحاق، اور ہندوستان کی نیک نیتی کا ثبوت طلب کیا جا رہا ہے
اور منشور کے ان ہی بنیادی اصولوں کو نافذ کرنے سے انکار کرنے کی بدولت
ادارۂ اقوام متحدہ کشمیر کے سوال کو پرامن طریقہ پر طے کرنے کے سلسلہ میں اپنی
تمام کوششوں میں برابر ناکام ہو رہا ہے۔ ریاست کے مستقبل کے سوال کو ریاستی
عوام کی خواہش کے مطابق طے کرانے کے پردہ میں مجلس تحفظ ایسے ایسے
عجیب و غریب طریقے اختیار کرتی رہی ہے جن کا الحاق کے سوال کے ساتھ کوئی
دور کا تعلق بھی نہیں تھا۔ ہم نہایت خلوص اور ایمان داری کے ساتھ بار بار
یہ تجویز پیش کرتے رہے ہیں کہ چوں کہ ریاست کے باشندوں کے مستقبل کا سوال
خود ان ہی سے تعلق رکھتا ہے اس لئے اس اہم سوال پر انھیں ان کی رائے
ظاہر کرنے کا موقع دیا جائے اور اس کے لئے ہمارا مطالبہ یہ رہا ہے کہ ریاست
میں حملہ سے پہلے جیسے حالات پیدا کئے جائیں اور اس بات کی ضمانت دی جائے
کہ آئندہ کوئی حملہ نہیں ہوگا۔ اس تمام مسئلہ کا نچوڑ یہ ہی ہے کہ اگر مجلس تحفظ
ہماری اس بنیادی تجویز کو مان لیتی تو اس کی بدولت اس سوال کا پُرامن حل
دریافت ہو سکتا تھا، لیکن مجلس تحفظ نے حملہ آور کے دعووں کو تسلیم کر کے
اسے اس حملہ سے فائدہ اُٹھانے کا موقع دیا ہے۔[1]

اور انھوں نے بنگلور میں منعقدہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس کو خطاب کرتے ہوئے
کہا تھا کہ

کشمیر اقوام متحدہ سے انصاف حاصل کرنے کے لئے تین سال تک نہایت

---

1. Kashmir Decides its Destiny P.6

صبر کے ساتھ انتظار کرتا رہا ہے لیکن یہ جماعت کشمیر کے ساتھ انصاف کرنے
میں ناکامیاب ثابت ہوئی ہے اور مفاد پرست طاقتوں کو کشمیر کے سوال
کے حل پر پوری قوت کے ساتھ اثر انداز ہونے کا موقع دیتی رہی ہے۔[1]

حالات کے اس پس منظر میں نیشنل کانفرنس اس نتیجہ پر پہونچی تھی کہ اول تو ہندوستان کے ساتھ ریاست جموں اور کشمیر کا الحاق 'قانونی' اخلاقی اور سیاسی طور سے بالکل درست ہے اور دوسرے ہندیونین کا ایک حصہ ہونے کے باعث ریاست کی ترقی کو زیادہ مدت تک مسدود نہیں رکھا جا سکتا۔ اس لئے اگر مجلسِ تحفظ کشمیر کے باشندوں کو ان کی خواہشات کے اظہار کا کوئی مؤثر طریقہ اختیار کرنا چاہیئے۔ چنانچہ اس نظریہ کی وضاحت کرتے ہوئے شیخ محمد عبداللہ نے امریکہ کے رسالہ 'لک' کے نمائندہ سے کہا تھا کہ:-

اگر مجلسِ تحفظ مستقبل قریب میں کسی فیصلہ پر پہونچنے میں کامیاب نہیں ہو سکتی تو پھر یہ عوام کا کام ہے کہ وہ تذبذب اور بے یقینی کی موجودہ صورت حال کو ختم کرنے کے سلسلہ میں اپنی رائے کے اظہار کی غرض سے خود کوئی طریقۂ کار اختیار کریں۔ اس حال میں وہ مجلسِ آئین ساز طلب کریں گے۔ یہ دستور ساز اسمبلی ان کے موقف کا فیصلہ کرے گی اور دوسرے سوالات کے ساتھ ریاست کے الحاق کے سوال کو بھی طے کرے گی۔[2]

ان حالات میں نیشنل کانفرنس کی جنرل کونسل نے اکتوبر ۱۹۵۰ء میں ایک قرارداد منظور کر کے کانفرنس کو ہدایت کی تھی کہ وہ بے یقینی کی موجودہ صورت حال کو ختم کرنے کی غرض سے، ریاست سے متعلق تمام تر اہم سوالات کو طے کرنے کے لئے دستور ساز اسمبلی طلب کرے۔
اسی طرح ستمبر ۱۹۵۱ء میں انتخابات کے بعد جموں اور کشمیر کی مجلس دستور ساز عالمِ وجود

1. The Hindu, July 5. 1951 (Look)
2. Kashmir Decides its Destiny Pp.9,10

میں آئی تھی اور اس کا پہلا اجلاس ۳۱۔ اکتوبر ۱۹۵۱ء کو سری نگر میں منعقد ہوا۔ اس دستور ساز اسمبلی کا مقصد جہاں ریاست اور اس کے باشندوں کے مستقبل کو آخری طور پر متعین کر دینا تھا وہاں اسے ریاست کا آئین مرتب کرنے کا کام بھی سپرد کیا گیا تھا۔

کشمیر کی یہ آئین ساز اسمبلی ابھی اپنے فرائض کی ادائیگی میں مصروف ہی تھی کہ جولائی ۱۹۵۲ء میں حکومت ہند اور اس اسمبلی کے درمیان "معاہدۂ دہلی" کے نام سے ایک سمجھوتہ عمل میں آیا جس کی رو سے (۱) کشمیر کی حکومت کے داخلی اختیارات (۲) شہریت کی شرائط (۳) بنیادی حقوق (۴) ریاست جموں اور کشمیر پر سپریم کورٹ آف انڈیا کے اختیارات (۵) نیشنل فلیگ (۶) صدر جمہوریۂ ہند (۷) ریاست کے صدر (۸) مالی الحاق (۹) ہنگامی صورت حال سے متعلق قانونی اختیارات اور ہند پارلیمنٹ کے دونوں ایوانات میں ریاست کی نمائندگی جیسے امور کا فیصلہ کیا گیا۔ اس سمجھوتے کے متعلق شیخ محمد عبداللہ نے جو کشمیر کی طرف سے سمجھوتہ کرنے والے وفد کے سربراہ تھے، دہلی سے واپس آنے کے بعد جموں کے ایک عام جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ

> یہ معاہدہ صرف کاغذی معاہدہ نہیں بلکہ دلوں کا ایک ایسا اتحاد ہے جسے دنیا کی کوئی طاقت بھی کمزور نہیں کر سکتی ۔[1]

اس طرح ایک جانب تو مجلس تحفظ کے غیر حقیقت پسندانہ طرز عمل اور پاکستان کے غیر صلح پسندانہ رویہ کی بدولت ڈاکٹر گراہم کا مشن ناکامیابی کی منزل تک پہونچتا جا رہا تھا اور دوسری طرف خود کشمیر کے باشندے آہستہ آہستہ اپنے مستقبل کے تعین اور تعمیر کے راستہ پر چل رہے تھے اور گراہم مشن کی ناکامیابی کے بعد جب انھیں اس بات کا کامل یقین ہو گیا کہ ادارۂ اقوام متحدہ ان کے مسئلہ کو طے نہیں کر سکتا تو انھوں نے ۶ فروری ۱۹۵۴ء کو اپنی

---

1. Two Nations and Kashmir P.169

مجلسِ دستور ساز کے توسط سے ہندوستان کے ساتھ ریاست کے الحاق کے اس فیصلہ کی
تصدیق کردی جو اکتوبر ۱۹۴۷ء میں کیا گیا تھا۔

اسی قدر نہیں بلکہ، ریاست جموں اور کشمیر کی دستور ساز مجلس کی طرف سے الحاق
کی تصدیق سے پہلے ہی اس الحاق کے متعلق کشمیر کے باشندوں کے جو احساسات تھے ان
کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ "ٹائمز آف انڈیا" کی ایک رپورٹ کے مطابق، ریاست
کے وزیرِ اعظم بخشی غلام محمد نے بارہ مولا میں ایک تقریر کرتے ہوئے ۲۔ستمبر ۱۹۵۳ء کو کہا تھا کہ

> استصوابِ رائے ہو یا نہ ہو، کشمیر میں عام احساس یہ ہے کہ ہم ہندوستان کے
> ساتھ رہ کر بالکل محفوظ ہیں۔ اقتصادی، کلچرل اور سماجی حالات نے ہماری
> تقدیر کو ہندوستان کے ساتھ وابستہ کر دیا ہے اور اب کوئی طاقت بھی اس
> رشتہ کو نہیں توڑ سکتی۔[1]

اور "ٹریبون" مورخہ ۳۰۔ستمبر ۱۹۵۳ء کی ایک رپورٹ کے مطابق انھوں نے کنگن میں ایک
تقریر کے دوران میں ان احساسات کا اظہار ان الفاظ میں کیا تھا کہ :

> پاکستان کشمیریوں کی لاشوں پر سے گزر کر ہی کشمیر پر قبضہ کر سکتا ہے اور ہندوستان
> کے ساتھ ہمارے الحاق کا فیصلہ ناقابلِ شکست ہے۔

اس طرح ۱۹۵۴ء کے آغاز میں کشمیر کے سوال کی نوعیت یہ ہوگئی تھی کہ اوّل تو پاکستان کی
طرف سے دونوں ملکوں کے وزراء اعظم کے اس معاہدہ کی پابندی نہیں کی گئی تھی جو انھوں نے
دہلی میں کیا تھا، دوسرے امریکہ کی طرف سے پاکستان کو دی جانے والی فوجی امداد نے کشمیر
کی صورتِ حال کو بالکل بدل دیا تھا اور تیسری جانب خود کشمیر کے باشندوں نے اپنی منتخب
دستور ساز اسمبلی کے توسط سے نہ صرف ہندوستان کے ساتھ ریاست کے الحاق کی تصدیق

1. Two Nations and Kashmir Pp. 120-121

ہی کر دی تھی بلکہ وہ کسی حال میں بھی اپنے اس فیصلہ کو بدل لینے کے لئے تیار نہیں تھے اور

ان حالات میں خود ہندوستان کے لئے بھی یہ بات ممکن نہیں ہو سکتی تھی کہ ریاست کے

باشندوں نے اس پر جو اعتماد کیا تھا وہ ان کے اس اعتماد کو برقرار رکھے لیکن

جیسا کہ ہندوستان کی جانب سے بار بار اعلان کیا جا رہا تھا وہ اس وقت بھی ان تبدیل شدہ

حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے کشمیر کے سوال پر بات چیت کرنے اور کسی قابلِ عمل فیصلہ پر پہونچنے

کے لئے تیار تھا۔

ان حالات میں مئی ۱۹۵۵ء میں ایک مرتبہ پھر مسٹر محمد علی اور پنڈت جواہر لال نہرو

کے درمیان دہلی میں ملاقات اور گفت وشنید ہوئی اور اس ملاقات کے بعد دونوں

وزراء اعظم کی طرف سے جو مشترکہ بیان شائع کیا گیا تھا وہ بجائے خود اس بات کا ثبوت

ہے کہ ہندوستان نے اس مرحلہ پر بھی کشمیر کے سوال پر بات چیت کرنے اور کسی سمجھوتہ پر

پہونچنے سے انکار نہیں کیا تھا۔ چناں چہ اس مشترکہ اعلان میں کہا گیا تھا کہ

> گفت وشنید کے دوران میں کشمیر کے سوال کے تمام پہلوؤں پر پوری طرح
> غور کیا گیا اور یہ بات طے ہوئی کہ اس گفت وشنید کے دوران میں جو نکات
> زیر بحث آئے تھے دونوں ملکوں کی حکومتوں کو ان پر اچھی طرح غور کرلینے کے بعد
> کسی دوسرے موقع پر پھر گفت وشنید کرنی چاہیئے[1]

لیکن دونوں ملکوں کے وزرائے اعظم کی اس ملاقات اور بات چیت کے سلسلہ میں لارڈ برڈوڈ نے اپنے

جس انداز ہ کو قلم بند کیا ہے یہاں اسے نقل کر دینا اس لئے خصوصیت کے ساتھ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ

اس سے ہندوستان کے موقف پر روشنی پڑتی ہے۔ لارڈ برڈوڈ نے لکھا ہے کہ

... یہ بات بالکل واضح ہے کہ استصواب رائے کے بنیادی منصوبہ میں کسی

---

1. Two Nations and Kashmir P. 201

تعین کے معاملہ پر بحث کی گئی تھی۔[1]

اور ۱۸۔مئی ۱۹۵۵ء کو ٹائمز (لندن) کے نامہ نگار مقیم نئی دہلی نے اپنے اخبار کو جو اطلاع بھیجی تھی اس میں لکھا تھا کہ:

ایک حقیقت واضح ہو گئی ہے اور وہ یہ ہے کہ کشمیر کے باشندوں کو ان کی خواہش کے اظہار کے لئے استصواب رائے کی جو تجویز تھی وہ بھی ماضی کی دوسری تجاویز کی طرح مردہ ہو چکی ہے اور اب یہ بات طے ہوئی ہے کہ اگرچہ ریاست کا مستقبل اس کے باشندوں ہی کے فیصلہ پر منحصر ہے لیکن اب اس معاملہ میں ان کی خواہشات معلوم کرنے کے لئے کوئی اور طریقہ اختیار کرنا چاہیئے۔[2]

اور مندرجہ بالا حوالوں سے یہ بات سمجھنے میں کوئی دشواری باقی نہیں رہتی کہ ہندوستان کشمیر کے تنازعہ کو طے کرنا چاہتا تھا اسے طے کرتے ہوئے وہ بین اقوامی صورت حال اور کشمیری عوام کی خواہشات اور اقدامات کو نظر انداز نہیں کرنا چاہتا تھا اور اس معاملے میں اس کا نقطۂ نظر اس درجہ صاف اور واضح تھا کہ لارڈ برڈ ووڈ جیسے پاکستان کے دوست کے اعتراف کے مطابق مئی ۱۹۵۵ء میں پاکستان کے وزیر اعظم مسٹر محمد علی کو بھی ہندوستان کے زاویۂ نظر کی اصابت کو تسلیم کرنا پڑا تھا لیکن خود لارڈ برڈ ووڈ کے الفاظ میں:

یہ معلوم ہوتا تھا کہ مسٹر محمد علی نے مئی ۱۹۵۵ء میں جو روش اختیار کی تھی وہ ان کی کابینہ کی نمائندگی نہیں کرتی تھی۔[3]

اور لارڈ برڈ ووڈ ہی نے مئی ۱۹۵۵ء کی گفت و شنید کے متعلق قیاس آرائی اور اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

---

1. Two Nations & Kashmir P. 202-203
2. " " " P.202
3. " " " P. 204

یہ بات صاف تھی کہ استصواب رائے کے بنیادی منصوبہ میں کسی تبدیلی کے سوال پر ضرور تبادلۂ خیالات کیا گیا ہے۔ اس تبدیلی کی تجویز کے ساتھ (مسٹر) محمد علی نے اتفاق رائے کیا تھا یا نہیں؟ اس کے متعلق کچھ کہنا ممکن نہیں ہو سکتا لیکن اس معاملہ میں (کوئی صاف بات کہنے سے) وزیر اعظم پاکستان کا گریز دیکھنے والوں کے لئے تعجب خیز ضرور تھا۔ ممکن ہے کہ اس وقت ان کی کابینہ اس نتیجہ پر پہونچی ہو کہ یہ وقت کشمیر کے معاملہ میں کوئی جرأت مندانہ مؤقف اختیار کرنے کے لئے موزوں نہیں ہے۔ اس وقت پاکستان میں دستوری بحران اپنے نقطۂ عروج پر پہونچا ہوا تھا اور خود ریاست کے وجود کو عدالتوں میں چیلنج کیا جا رہا تھا اس لئے اس امر کا اندیشہ ہو سکتا تھا کہ اگر کشمیر کے معاملہ پر دہلی میں کوئی جرأت مندانہ مؤقف اختیار کیا گیا تو یہ نہ کہا جائے کہ پاکستان کی حکومت کشمیر سے متعلق ذمہ داریوں کو قبول کرنے کی اہل نہیں ہے۔[1]

اور اس کے بعد لارڈ برڈ وڈ نے اس رائے کا اظہار بھی کیا ہے کہ

پاکستانیوں کے ہاتھ سے جو میدان نکل گیا تھا ایسا معلوم ہوتا ہے وہ اسے دوبارہ حاصل کرنے کے خواہش مند ہیں۔[2]

مذکورہ بالا اقتباسات سے جو نتائج برآمد ہوتے ہیں وہ یہ کہ مئی ۱۹۵۵ء کے مذاکرات میں یہ بات زیر بحث آئی تھی کہ استصواب رائے کے بنیادی منصوبہ میں تبدیلی کی جائے اور چونکہ ان مذاکرات کے بعد مسٹر محمد علی اس مخصوص معاملہ سے متعلق سوالات کا کوئی صاف جواب دینے سے گریز کرتے رہے تھے اس لئے یہ سمجھ لینا بے جا نہ ہوگا کہ وہ تبدیلی کی اس تجویز کے ساتھ متفق الرائے تھے۔ ان کی کابینہ ان کے اس موقف کے ساتھ اتفاق رائے نہیں رکھتی تھی یا

1. Two Nations and Kashmir Pp. 202-203
2. " " " P. 203

پھر وہ خود اور ان کی کابینہ پاکستان کے دستوری بحران کے پیش نظر اس وقت کشمیر کے معاملہ میں کوئی جرأت مندانہ موقف اختیار کرنے کے لئے تیار نہیں تھے لیکن وہ دہلی میں جو فیصلہ کر گئے تھے اس پر قائم بھی نہیں رہنا چاہتے تھے اور اس سے فرار کے لئے مناسب وقت کے منتظر تھے۔

یہ بات ظاہر ہے کہ اگر پاکستان کے وزیر اعظم اور ان کی کابینہ کے درمیان اس مؤقف کے متعلق جو مسٹر محمد علی نے دہلی میں اختیار کیا تھا کوئی اختلاف رائے موجود تھا تو اس کی ذمہ داری ہندوستان پر عاید نہیں ہو سکتی تھی۔ یا اگر مسٹر محمد علی اور ان کی کابینہ نے داخلی حالات سے مجبور ہو کر یہ مؤقف اختیار کیا تھا اور وہ اس پر قائم نہیں رہنا چاہتے تھے تو اس کے لئے بھی ہندوستان کو موردِ الزام نہیں قرار دیا جا سکتا۔ لیکن اس مؤقف سے پاکستان کا گریز اس امر کا ایک تازہ ثبوت ضرور تھا کہ اس کے ارباب اختیار کشمیر کے سوال کو طے کرنا نہیں چاہتے تھے۔

بہر حال جولائی ۱۹۵۵ء میں جب ہند یونین کے وزیر داخلہ پنڈت گووند بلبھ پنت نے ایک پریس کانفرنس میں، کشمیر کے سوال پر ہندوستان کے مؤقف کی وضاحت کرتے ہوئے یہ بات کہی کہ

> ہندوستان کے ساتھ کشمیر کے الحاق کے وقت حکومت ہند نے چند بیانات دئے تھے اور یہ بات کہی تھی کہ ریاست کا مستقبل استصواب رائے کے ذریعہ سے طے کیا جائے گا۔ لیکن اس وقت کے حالات مختلف تھے اور اس وقت سے اب تک بہت سے دُنیائے) واقعات رونما ہو چکے ہیں[1]

تو پاکستان نے اس بیان کو دہلی کے فیصلہ سے انحراف کا ایک عذر بنا کر یہ مطالبہ کیا کہ

1. Report of the Times Correspondent 10.7.55

اس بیان کی تردید کی جائے اور ہندوستان غیر مبہم الفاظ میں اس بات

کی توثیق کرے کہ وہ کشمیر سے متعلق اپنی بین اقوامی ذمہ داریوں کو جن میں

استصواب رائے عامہ بھی شامل ہے پورا کرے گا۔[1]

لیکن یہ بات ظاہر ہے کہ ہند یونین کے وزیر داخلہ نے کشمیر کے متعلق اپنے بیان میں کوئی ایسی بات نہیں کہی تھی جسے ہندوستان کے مُوقف کے خلاف کہا جا سکے لیکن جیسا کہ لارڈ برڈ ووڈ نے اعتراف کیا ہے پاکستان چونکہ خود اپنے مُوقف پر قائم رہنا نہیں چاہتا تھا اس لئے اس نے اس بیان کو اپنے انحراف کے لئے عُذر بنا لیا لیکن ظاہر ہے کہ اُسے 'عذر لنگ' سے زیادہ اہمیت نہیں دی جا سکتی تھی۔

گزشتہ سطور میں گراہم مشن کی ناکامی کے بعد سے ستمبر ۱۹۵۶ء کے اواخر تک رونما ہونے والے جن حالات پر روشنی ڈالی گئی ہے ان سے یہ باتیں بالکل صاف ہو جاتی ہیں کہ اکتوبر ۱۹۴۸ء میں نیشنل کانفرنس کے ایک اسپیشل کنونشن نے، ہندوستان کے ساتھ ریاست جموں اور کشمیر کے الحاق کے فیصلہ کی تصدیق کر دی تھی۔ پھر اکتوبر ۱۹۵۰ء میں نیشنل کانفرنس کی جنرل کونسل نے اپنی ایک قرارداد میں نیشنل کانفرنس کو اس بات کی ہدایت کی تھی کہ وہ ریاست سے متعلق تمام تر اہم معاملات کو طے کرنے اور ریاست کا آئین بنانے کے لئے دستور ساز اسمبلی طلب کرے۔ جنرل کونسل کی اس واضح ہدایت کے مطابق عام انتخابات کے بعد ۳۰ ستمبر ۱۹۵۱ء کو ریاست کی مجلس دستور ساز عالم وجود میں آئی تھی۔ ۳۱ اکتوبر ۱۹۵۱ء کو اس مجلس کا پہلا اجلاس منعقد ہوا تھا اور ۶ فروری ۱۹۵۴ء کو اس مجلس نے ہندوستان کے ساتھ ریاست جموں اور کشمیر کے الحاق کی تصدیق اور توثیق کر دی تھی۔

پھر ان سطور کے مطالعہ سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ پنڈت جواہر لال نہرو اور مسٹر محمد علی

---

1. Two Nations and Kashmir Pp. 203-204

کی ملاقات مئی ۱۹۵۵ء میں اس وقت ہوئی تھی جب ریاست جموں اور کشمیر کی مجلسِ دستور ساز کو قائم ہوئے چار سال سے زیادہ اور اس کی طرف سے الحاق کے فیصلہ کی توثیق پر ایک سال سے زیادہ مدت گذر چکی تھی اور اس سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ پاکستان ان مقاصد سے بے خبر نہیں تھا جن کے حصول اور تکمیل کے لئے کشمیر کی مجلسِ دستور ساز کا قیام عمل میں آیا تھا اور مئی ۱۹۵۵ء کی نہرو، محمد علی ملاقات اور گفت و شنید کی تفصیلات میں ایسی کوئی بات نہیں ملتی جس سے یہ اندازہ لگایا جا سکے کہ پاکستان ریاست کی مجلسِ آئین ساز کے کاموں کی نوعیت سے بے خبر تھا۔ اس کے باوجود جیسا کہ مختلف شہادتوں سے ثابت ہو چکا ہے وہ استصواب رائے کے پرانے منصوبہ کو بدلنے پر بھی رضامند ہو گیا تھا لیکن وہ اپنے اس فیصلہ پر بھی قائم نہیں رہا تھا اور اس نے جولائی ۱۹۵۵ء میں ہندیونین کے وزیر داخلہ پنڈت پنت کی ایک تقریر کے بعض جملوں کو بہانہ بنا کر جن کا مطلب اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہ —— ہندوستان، پاکستان کے ساتھ کشمیر کے سوال پر بات چیت کرتے ہوئے اپنے قدیم موقف کے مطابق ان حالات کو نظر انداز نہیں کر سکتا جو اب تک رونما ہوتے رہے ہیں —— اس سمجھوتے کو بھی توڑ دیا تھا جو مئی ۱۹۵۵ء میں دونوں ملکوں کے وزراء اعظم کے درمیان ہوا تھا۔

اس کتاب میں کشمیر کے سوال کے پیدا ہونے اور طے نہ ہو سکنے کی جو تاریخ بیان کی گئی ہے اس کی روشنی میں پاکستان کی طرف سے مئی ۱۹۵۵ء کے سمجھوتہ کو توڑ دیا جانا کوئی اتفاقی بات نہیں کہی جا سکتی بلکہ ۱۹۵۶ء میں پاکستان کی حکومت اور اس کے رہنماؤں کی سرگرمیاں اس بات کو ثابت کرتی ہیں کہ پاکستان نے مئی ۱۹۵۵ء میں ہندوستان کے ساتھ جو سمجھوتہ کیا تھا وہ بھی پہلے تمام سمجھوتوں کی طرح توڑنے ہی کے لئے کیا گیا تھا۔ چناں چہ جولائی ۱۹۵۵ء میں مئی ۱۹۵۵ء کے سمجھوتہ کو توڑ دیئے گئے بعد صدر اسکندر مرزا، وزیر اعظم مسٹر محمد علی، پاکستانی پارلیمنٹ میں حزب اختلاف (اپوزیشن) کے رہنما مسٹر سہروردی اور دوسرے پاکستانی

رہنما کشمیر کے سوال پر جن خیالات کا اظہار کرتے رہے ان سے یہ حقیقت بے نقاب ہو جاتی ہے کہ وہ کسی ایسے سمجھوتے کے لئے تیار نہیں تھے جس کی بدولت ریاست جموں اور کشمیر ان کے قبضہ میں نہ آسکے۔ چنانچہ ۳۱-مارچ ۱۹۵۶ء کو پاکستانی پارلیمنٹ میں وزیر اعظم مسٹر محمد علی نے جو تقریر کی تھی اس میں کہا تھا کہ

کشمیر کے سوال کو بات چیت کے ذریعے سے طے کرانے کے تمام دروازے بند ہو گئے ہیں۔[1]

اور حزب اختلاف کے رہنما مسٹر سہروردی نے کشمیر کے سوال کو "قومی سوال" قرار دے کر مسٹر محمد علی کے خیالات کی پوری پوری تائید کی تھی۔[2]

۲-اپریل ۱۹۵۶ء کو صدر اسکندر مرزا نے لاہور میں ایک تقریر کرتے ہوئے حاضرین کو یقین دلایا تھا کہ

کشمیریوں کا مفاد ہمارا مفاد ہے ہم کسی حال میں بھی اسے نظر انداز نہیں کریں گے۔[3]

مسٹر محمد علی نے ۲۰-اپریل ۱۹۵۶ء کو کراچی میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ اگر اقوام متحدہ کشمیر کے سوال کو طے کرانے میں کامیاب نہ ہو سکی تو

کشمیر میں بغاوت برپا ہو جائے گی۔[4]

لیکن پاکستان کی حکومت اور رہنماؤں نے ان خیالات کے اظہار ہی کو کافی نہیں سمجھا تھا بلکہ ۱۹۵۶ء کے آغاز میں ایک جانب تو پاکستان کی طرف سے کشمیر کی سرحد پر مسلح جھڑپیں شروع ہو گئی تھیں اور دوسری طرف پاکستان کی حکومت نے مسٹر سہروردی کو مغربی ملکوں میں ہندوستان کے خلاف پروپیگنڈا کے لئے بھیج کر باہمی بات چیت کے ذریعے سے اس سوال کو طے کرنے کا دروازہ بند کر دیا تھا۔ اور یورپ کے اس دورے میں مسٹر سہروردی نے

1-2. Times of Karachi 1.4.56
3. 〃 〃 3.4.56
4. 〃 〃 26.4.56

یوگوسلاویہ، اسپین، پرتگال، فرانس، جرمنی، سوئٹزرلینڈ، اٹلی اور برطانیہ کے رہنماؤں اور حکومت کے ارکان سے مل کر کشمیر کے معاملہ میں انھیں اپنا ہم خیال بنانے کی کوشش کی تھی۔[1]

اور یہ بات ظاہر ہے کہ پاکستان کی حکومت اور اس کے رہنماؤں کی یہ تمام ترسرگرمیاں اس بنا پر تھیں کہ وہ ہندوستان کے ساتھ براہِ راست بات چیت کا دروازہ بند کر کے کشمیر کے سوال کو ایک مرتبہ پھر اقوامِ متحدہ میں پیش کرنا چاہتے تھے۔

جون ۱۹۵۶ء میں جب لندن میں وزراء اعظم دولتِ مشترکہ کی کانفرنس منعقد ہوئی تو پنڈت نہرو اور مسٹر محمد علی کے درمیان غیر رسمی طریقہ سے کشمیر کے سوال پر بھی بات چیت ہوئی۔ لیکن چونکہ پاکستان اس سوال کو ایک مرتبہ پھر اقوامِ متحدہ میں لے جانے کا فیصلہ کر چکا تھا اس لئے اس بات چیت کا بھی کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہو سکا۔ چناں چہ انھوں نے نہ صرف اس سوال کو ازسرِنو اقوامِ متحدہ میں پیش کرنے کے فیصلہ کا اعلان نہیں کر دیا بلکہ اقوامِ متحدہ پر دباؤ ڈالنے کے لئے یہ اعلان بھی کیا کہ،

آئندہ پاکستان کی خارجہ پالیسی کشمیر کے سوال پر مبنی رہے گی۔[2]

اور ۱۴۔ اگست ۱۹۵۶ء کو انھوں نے پاکستان کے نویں یومِ آزادی کے موقع پر ایک عام جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ

میں کشمیر کے سوال کو اقوامِ متحدہ میں لے جانے ہی پر اکتفا نہیں کروں گا بلکہ اس سلسلہ میں میں نے جو وعدے کئے ہیں انھیں پورا کرنے کے لئے خواہ کوئی راستہ بھی کیوں نہ اختیار کرنا پڑے میں اسے ضرور اختیار کروں گا۔ اگر ضرورت پیش آئے گی

---

1. Dawn, Karachi 12.5.56
2. Times of Karachi, Karachi 14.7.56

تو میں اس مقصد کے لئے اپنی جان بھی قربان کر دوں گا اور وقت آنے پر

آپ مجھے صفِ اول میں کھڑا ہوا پائیں گے۔[1]

اسی تقریر میں انھوں نے یہ بھی کہا تھا کہ

ہم محسوس کرتے ہیں کہ کشمیر کے بغیر پاکستان کی آزادی مکمل نہیں ہو سکتی۔[2]

اگست ۱۹۵۶ء کے انتخابات کی بدولت پاکستان میں مسلم لیگ کی حکومت کی بجائے عوامی لیگ کی حکومت قائم ہو گئی تھی اور مسٹر محمد علی کی جگہ مسٹر حسن شہید سہروردی پاکستان کے وزیر اعظم مقرر ہوئے تھے اور انھوں نے اکتوبر میں لاہور میں ایک تقریر کرتے ہوئے پاکستان کے باشندوں کو دعوت دی تھی کہ

انھیں کشمیر کو آزاد کرانے کے لئے ہر وقت تیار رہنا چاہیئے۔[3]

اور ٹائمز آف کراچی کی ایک اطلاع کے مطابق جب مسٹر سہروردی اکتوبر ۱۹۵۶ء میں کشمیر کے متعلق تمام سیاسی پارٹیوں کو ایک زاویۂ نظر پر متفق الرائے بنانے کے لئے کوشش کر رہے تھے تو یہ بات طے سمجھی گئی تھی کہ

ہندوستان کے ساتھ براہ راست بات چیت کا کوئی امکان باقی نہیں رہا ہے۔[4]

پھر اسی قدر نہیں بلکہ اس زمانہ میں کشمیر کے متعلق، پاکستان نے ہندوستان کے خلاف جو رویہ اختیار کیا تھا اس کا اندازہ اس بات سے اچھی طرح لگایا جا سکتا ہے کہ پاکستان کے وزیر خارجہ مسٹر فیروز خان نون نے کشمیر کے سلسلہ میں ایک بیان دیتے ہوئے کہا تھا کہ

ہندوستان فرانس کے ساتھ کشمیر اور الجیریا کے سلسلہ میں سودا بازی کرنے کی

---

1. Civil & Military Gazette, Lahore 15.8.50
2. Times of Karachi, Karachi, 16.8.50
3. Indian Express, Delhi 6.10.56
4. Times of Karachi 10.10.56

کوشش میں کر رہا ہے۔[1]

ان کے اس بیان کا مطلب یہ تھا کہ ہندوستان الجیریا میں فرانس کی حکمتِ عملی کی تائید کے لئے تیار ہے بشرطیکہ فرانس کشمیر کے سوال پر ہندوستان کے موُقف کی تائید پر تیار ہو جائے اور مسٹر نون کے اس بیان سے یہ بات بالکل ہی واضح ہو جاتی ہے کہ پاکستان اس سلسلہ میں ہندوستان کے ساتھ نہ تو کوئی بات چیت کرنا چاہتا تھا اور نہ وہ کوئی باعزت سمجھوتہ کرنے ہی کے لئے تیار تھا اور جیسا کہ آیندہ واقعات سے معلوم ہو سکے گا اس مرحلہ پر پاکستان کا منصوبہ یہ تھا کہ کشمیر کے سوال کو از سرِ نو مجلسِ تحفظ میں پیش کر کے جس طرح بھی ہو سکے اقوامِ متحدّہ کی فوج کے لئے کشمیر میں داخلہ کی راہ ہموار کر لے۔

ایک طرف تو پاکستان کسی ایسے سمجھوتہ کے لئے تیار نہیں تھا جس کی رو سے اُسے ریاست جموّں اور کشمیر پر قبضہ کرنے کا موقع نہ مل سکے اور دوسری طرف اس مسئلہ کے متعلق اقوامِ متحدہ کی روش نے ریاست کے باشندوں کی اس توقع کو مایوسی میں بدل دیا تھا کہ وہ اقوامِ متحدّہ کے توسط سے ہندوستان کے ساتھ ریاست کے الحاق کی تصدیق کر سکیں گے اس لئے انھوں نے جو مجلس آئین ساز منتخب کی تھی اس نے ۱۷۔ نومبر ۱۹۵۶ء کو ریاست کے لئے اس آئین کی منظوری کا اعلان کر دیا جس کی ترتیب کے لئے اس کا انتخاب کیا گیا تھا اور اس طرح اس بات کی تصدیق مزید کر دی کہ

> اکتوبر ۱۹۴۷ء میں ہندوستان کے ساتھ ریاست جموّں اور کشمیر کا جو الحاق کیا گیا تھا وہ جائز اور ریاست جموّں اور کشمیر ہندیونین کا ایک لائینفک حصہ ہے۔[2]

---

1. Tribune, Ambla Cantt. 22.11.56

2. آئین جموّں و کشمیر (اردو ترجمہ) صفحہ ۱ د شائع کردہ ڈائریکٹ آف انفارمیشن جموّں و کشمیر

یہ حالات تھے جو ۱۹۵۵ء کے وسط سے شروع ہو کر ۱۹۵۶ء کے اواخر تک قائم رہے تھے۔ ان کے مطالعہ سے یہ اندازہ کر لینا کچھ مشکل نہیں کہ اس زمانہ میں بھی پاکستان کا رویہ غیر مصالحانہ ہی نہیں بلکہ معاندانہ بھی رہا تھا اور ان ہی حالات کی بنا پر ۱۹۵۷ء کے آغاز میں پاکستان کی تحریک پر ایک مرتبہ پھر کشمیر کا سوال مجلسِ تحفظ میں زیرِ بحث آیا تھا۔

تیرھواں باب

ہندوستان کے مؤقف کی تصدیق اور استصواب رائے کا سوال

گزشتہ باب میں یہ بات تفصیل کے ساتھ بتائی جا چکی ہے کہ دسمبر ۱۹۵۲ء میں کشمیر کے سوال پر مجلس تحفظ میں بحث ہونے کے بعد سے ۱۹۵۶ء کے اواخر تک ایک طرف تو پاکستان، باہمی بات چیت کے ذریعہ سے اس سوال کو طے کرنے کے سلسلے میں برابر گریز کرتا اور اپنے تمام وعدوں اور سمجھوتوں کو توڑتا رہا تھا، دوسری طرف خود کشمیر کے باشندے اپنی تعمیر اور ترقی کے لئے بے چین تھے اور وہ الحاق کے متعلق اقوام متحدہ کے فیصلہ کے انتظار میں تعمیر اور ترقی کے راستہ پر آگے بڑھنے کو ملتوی رکھنا نہیں چاہتے تھے اور تیسری جانب نو سال کی اس مدت میں بین اقوامی طاقتوں کے توازن میں زبردست تبدیلیاں رونما ہوئی تھیں اور چونکہ ہندوستان ابتداء ہی سے اس بات کا اعلان کرتا رہا تھا کہ وہ کشمیر کے متعلق کوئی بات چیت کرتے ہوئے ان نئے واقعات اور حالات کو نظر انداز نہیں کر سکتا اس لئے وہ ۱۹۵۶ء کے اواخر میں بھی اپنے اسی موقف پر قائم تھا۔

ان حالات میں جب جنوری ۱۹۵۷ء میں یہ سوال از سر نو مجلس تحفظ میں پیش کیا گیا تو پاکستان کے اس وقت کے وزیر خارجہ مسٹر فیروز خان نون نے کشمیر کے سوال کے طے نہ ہونے

کا تمام تر الزام ہندوستان پر عائد کرتے ہوئے اس بات کا مطالبہ کیا کہ کشمیر کے مستقبل کے فیصلہ کے لئے وہاں استصواب رائے کرایا جائے۔

اس بحث کے دوران میں ہندوستانی وفد کے قائد مسٹر کرشنا مینن نے جو طویل تاریخی تقریر کی تھی وہ کشمیر کے مسئلہ پر آخری اور مستند دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے لیکن جن بین اقوامی رجحانات کی بدولت مجلس تحفظ پچھلے ۱۰ سال تک اس سوال کو طے کرنے سے قاصر رہی تھی ان ہی رجحانات کے ماتحت اس نے ۲۴ جنوری ۱۹۵۷ء کو اپنی وہ قرارداد بھی منظور کی تھی جو " فرینہ ریزولیوشن اون کشمیر" کے نام سے موسوم ہے۔ یہ قرارداد امریکہ، برطانیہ، آسٹریلیا، کولمبیا اور کیوبا نے متفقہ طور پر پیش کی تھی اور سوویت یونین کی عدم موجودگی میں عراق، فرانس، نیشنلسٹ چین، فلپائن اور سویڈن کے اتفاق رائے سے منظور ہوئی تھی لیکن ہندوستان نے اسے قبول نہیں کیا تھا۔ اس قرارداد کا متن یہ ہے کہ مجلس تحفظ

> کشمیر کے تنازعہ پر ہند اور پاکستان کے مندوبین کے بیانات سننے کے بعد متعلقہ حکومتوں اور حکام کو وہ اصول یاد دلاتے ہوئے جو اس نے (مجلس تحفظ نے) اپنی ۲۱۔ اپریل ۱۹۴۸ء، ۲ جون ۱۹۴۸ء، ۱۴ مارچ ۱۹۵۰ء اور ۳۰ مارچ ۱۹۵۰ء کی قراردادوں میں منضبط کئے تھے۔ نیز اقوام متحدہ کے کمیشن برائے ہند اور پاکستان کی ان قراردادوں کو یاد دلاتے ہوئے جو اس نے ۱۳۔ اگست ۱۹۴۸ء اور ۵ جنوری ۱۹۴۹ء کو منظور کی تھیں اور جن کا مفہوم یہ تھا کہ ریاست جموں اور کشمیر کا آخری فیصلہ عوام کی رائے سے ایسے آزادانہ اور غیر جانبدارانہ استصواب رائے کے ذریعہ سے ہوگا جو ادارۂ اقوام متحدہ کی نگرانی میں کرایا جائے گا، اپنی اس توثیق

کی مزید تصدیق کرتی ہے جو اس نے اپنی ۳۰۔ مارچ ۱۹۵۱ء کی قرارداد میں کی تھی اور اعلان کرتی ہے کہ — آل جموں و کشمیر نیشنل کانفرنس کی سفارش پر مجلس دستور ساز کی طلبی اور اس کا کوئی اپنا اقدام جو اس نے پوری ریاست یا اس کے کسی حصہ کے مستقبل کی تشکیل اور وابستگی کے لئے کیا ہو یا آئندہ کرنے کی کوشش کرے یا متعلقہ فریقین میں سے کسی فریق کی طرف سے اس مجلس آئین ساز کے ایسے اقدام کی تائید میں کیا ہوا اقدام مذکورہ بالا اصول کے مطابق ریاست کے متعلق آخری فیصلہ نہیں سمجھا جائے گا[1]

اور اسی مرتبہ بحث کے خاتمہ پر مجلس تحفظ نے ۲۰۔ فروری ۱۹۵۷ء کو یہ قرارداد بھی منظور کی تھی کہ وہ

ہند اور پاکستان کے درمیان کشمیر کے سوال پر اپنی ۲۴ جنوری ۱۹۵۷ء کی قرارداد اپنی سابقہ قراردادوں اور اقوام متحدہ کے کمیشن برائے ہند اور پاکستان کی قراردادوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے (۱) مجلس کے صدر، سویڈن کے مندوب سے درخواست کرتی ہے کہ وہ مجلس تحفظ اور اقوام متحدہ کے کمیشن برائے ہند اور پاکستان کی قراردادوں کا لحاظ رکھتے ہوئے ہند اور پاکستان کی حکومتوں کے ساتھ مل کر ایسی تجاویز پر غور کریں جو اس تنازعہ کو طے کرانے میں مدد دے سکتی ہوں۔ وہ اس مقصد کے لئے برصغیر ہند جائیں اور زیادہ سے زیادہ ۱۵۔ اپریل ۱۹۵۷ء تک مجلس کو صورت حال سے مطلع کریں (۲) مجلس تحفظ ہند اور پاکستان کی حکومتوں کو دعوت دیتی ہے کہ وہ اس سلسلہ میں ان کے ساتھ تعاون کریں اور (۳) سیکرٹری جنرل نیز اقوام متحدہ کے لئے مامور

---

[1] جدید سیاسی معلومات۔ جلد سوم ص ۴۷-۴۸

ہند اور پاکستان کی حکومتوں سے درخواست کرتی ہے کہ وہ انہیں پیش آنے والی ضرورتوں میں ہر ممکن مدد دیں۔[1]

ہندوستان نے مجلس تحفظ کی اس قرارداد کو کبھی منظور نہیں کیا تھا لیکن اس نے مجلس تحفظ کے نمایندہ مسٹر گنر یارنگ کو ان کے کام میں ہر ممکن مدد دی تھی اور انھوں نے برصغیر ہند آنے اور حالات کا جائزہ لینے کے بعد اپنی رپورٹ میں ہندوستان کے اس مؤقف کی تائید کی تھی کہ ۱۹۴۷ء کے مقابلہ میں ۱۹۵۷ء کے حالات بہت زیادہ بدل چکے ہیں اور یہ کہ کشمیر کے سوال کے کسی فیصلہ میں بھی ان نئے حالات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا لیکن مسٹر گنر یارنگ کی رپورٹ کو پیش کرنے سے پہلے اس بات پر غور کر لینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ۱۹۵۷ء کے آغاز میں مسٹر فیروز خاں نون نے کشمیر کے مسئلہ کو جس انداز میں مجلس تحفظ کے روبرو پیش کیا تھا کیا وہ حقائق پر مبنی تھا اور مجلس تحفظ نے کشمیر سے متعلق ۲۴ جنوری ۱۹۵۷ء کو جو قرارداد منظور کی تھی کیا وہ کشمیر کی صورت حالات کی صحیح نمائندگی کرتی تھی۔

پاکستان، کشمیر میں استصواب رائے کا جو مطالبہ کرتا رہا ہے وہ اسے اقوام متحدہ کے کمیشن برائے ہند اور پاکستان کی ان دو قراردادوں پر مبنی قرار دیتا ہے جو اس کمیشن نے ۱۳۔ اگست ۱۹۴۸ء اور ۵۔ جنوری ۱۹۴۹ء کو منظور کی تھیں۔ ان قراردادوں میں سے ۱۳۔ اگست ۱۹۴۸ء کی قرارداد کے حصہ (الف) کی دفعہ (۱) میں یہ غیر مبہم الفاظ موجود ہیں کہ:۔

پاکستان کی حکومت ، ریاست سے اپنی افواج کو واپس بلا لینے پر رضامند ہے۔

اور اسی قرارداد کے حصہ (ب) میں یہ تشریحات موجود ہیں کہ

(۱) جب اس بات کا اطمینان ہو جائے گا کہ قرارداد کے حصہ (الف) کی تکمیل ہو چکی ہے اور پاکستانی افواج ریاست سے واپس جا رہی ہیں تو حکومت ہند

---

1 Two Nations and Kashmir Pp.218-221

بھی اپنی بیشتر افواج کو ریاست سے واپس بلالے گی اور افواج کی یہ تدریجی واپسی
کمیشن کے اتفاق رائے سے عمل میں آئے گی۔ اور

(۲) جب تک کشمیر کے سوال کو طے کرنے کی آخری شرطیں منظور نہیں کر لی جائیں گی
اس وقت تک حکومت (ہند) خط جنگ بندی کے اندر کمیشن کے اتفاق رائے
سے نظم و نسق برقرار رکھنے کی غرض سے مقامی حکام کو مدد دینے کے لئے اپنی
کم سے کم افواج ریاست میں رکھے گی۔[1]

پھر اقوام متحدہ کے کمیشن برائے ہند اور پاکستان نے ۵۔ جنوری ۱۹۴۹ء کو جو قرارداد منظور کی تھی اور جسے ۱۳۔ اگست ۱۹۴۸ء کی قرارداد کے ضمیمہ کی حیثیت دی گئی تھی اس کی دفعہ (۲) میں صاف طور پر کہا تھا کہ

استصواب رائے اس وقت کرایا جائے گا جب کمیشن کو اس بات کا اطمینان
ہو جائے گا کہ اس کی منظور کی ہوئی ۱۳۔ اگست ۱۹۴۸ء کی قرارداد کے حصّہ اول
اور دوم میں جنگ بندی اور عارضی صلح کے لئے جو تجاویز طے کی گئی ہیں ان پر عملدرآمد
ہو چکا ہے۔[2]

اسی قرارداد کی دفعہ ۳۔ (الف) اور (ب) میں یہ جملے بھی موجود ہیں کہ

اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل، کمیشن کے اتفاق رائے سے ناظم استصواب رائے
کو نامزد کریں گے لیکن اس کا رسمی تقرر جموں اور کشمیر کی حکومت کی طرف سے کیا
جائے گا اور ناظم استصواب رائے کو اس کے فرائض کی انجام دہی کے لئے جن
اختیارات کی ضرورت محسوس ہو گی وہ اختیارات بھی اسے ' ریاست جموں و کشمیر

1-2. Two Nations and Kashmir
Pp.218.221

بھی دے گی۔[1]

مذکورہ بالا قراردادوں کے علاوہ، ڈاکٹر گراہم نے ستمبر ۱۹۵۱ء میں جو تجاویز مرتب کی تھیں ان میں سے ساتویں تجویز کا خلاصہ یہ ہے کہ

قبائلی اور وہ پاکستانی جو ریاست جموں اور کشمیر کے باشندے نہیں ہیں اور صرف لڑائی کی غرض سے وہاں آئے ہیں واپس چلے جائیں گے۔ پاکستانی افواج کو ریاست سے واپس بلا لیا جائے گا (برائے نام) آزاد کشمیر کی فوجوں کو وسیع پیمانہ پر غیر مسلح اور منتشر کر دیا جائے گا اور ہندوستان اپنی بیشتر افواج کو واپس بلالے گا۔[2]

اس میں شک نہیں کہ ہندوستان نے، اقوامِ متحدہ کے کمیشن برائے ہند اور پاکستان کی ۱۳۔ اگست ۱۹۴۸ء اور ۵۔ جنوری ۱۹۴۹ء کو منظور کی ہوئی قراردادوں کو منظور کر لیا تھا۔ لیکن انھیں منظور کرتے ہوئے اس نے کمیشن پر یہ بات واضح کر دی تھی کہ ہندوستان کی طرف سے ان کی منظوری، ان کی درست توضیح اور تشریح پر منحصر ہے اور انھیں منظور کرتے ہوئے اس نے یہ شرائط پیش کی تھیں کہ

(۱) کشمیر کا جو علاقہ پاکستان کے قبضہ میں ہے اس پر ریاست جموں اور کشمیر (کی حکومت) کی بالادستی کو تسلیم کیا جائے گا اور اس علاقہ کو خالی کر دیا جائے گا۔

(۲) ہندوستانی افواج کو جن مرحلوں پر ریاست سے واپس بلایا جائے گا وہ مرحلے حکومتِ ہند اور کمیشن کے باہمی مشورہ سے طے کئے جائیں گے اور اس معاملہ سے پاکستان کا کوئی تعلق نہ ہوگا۔

(۳) پوری ریاست (مقبوضہ اور غیر مقبوضہ کشمیر) کو تمام بیرونی حملوں سے محفوظ اور اس کے داخلی امن کو برقرار رکھنے کی تمام تر ذمہ داری خود ریاست جموں

1-2 Two Nations and Kashmir Pp. 218-221

اور کشمیر پر عائد ہوگی۔

(۴) استصواب رائے کا سوال، حکومت ہند اور استصواب رائے کے حکام آپس میں طے کریں گے اور اس معاملہ میں پاکستان کی رائے کو کوئی دخل حاصل نہ ہوگا اور

(۵) استصواب رائے کرانے کے لئے پاکستان کو پُرامن فضا قائم رکھنی پڑے گی۔[1]

اقوامِ متحدہ کے کمیشن برائے ہند اور پاکستان کی ۱۳۔ اگست ۱۹۴۸ء اور ۵۔ جنوری ۱۹۴۹ء کی قراردادوں اور ان دونوں قراردادوں کو تسلیم کرنے کے لئے ہندوستان کی طرف سے پیش کی ہوئی واضح شرائط اور ڈاکٹر گراہم کی تجاویز کی روشنی میں مسٹر فیروز خاں نون کی تقریر کا جائزہ لینے کے بعد اس کے علاوہ اور کوئی نتیجہ برآمد نہیں کیا جا سکتا کہ انھوں نے اپنی تقریر کے ذریعہ سے مجلسِ تحفّظ کو غلط فہمی میں مبتلا کرنے کی کوشش کی تھی۔ ورنہ جہاں تک حقائق کا تعلق ہے وہ یہ ہیں کہ اقوامِ متحدہ کے کمیشن برائے ہند اور پاکستان نے اپنی ۱۳۔ اگست ۱۹۴۸ء اور ۵۔ جنوری ۱۹۴۹ء کی قراردادوں میں پاکستان کو اس بات کی ہدایت کی تھی کہ وہ ریاست جمّوں اور کشمیر سے اپنی افواج کو واپس بُلالے اور (برائے نام) آزاد کشمیر کی افواج کو بڑے پیمانہ پر غیر مسلح اور منتشر کر دیا جائے۔ اس نے ہندوستانی فوج کی ایک مناسب تعداد کو ریاست میں مقیم رکھنے کے حق کو تسلیم کیا تھا اور ناظم استصواب رائے کے رسمی تقرر تک اسے تفویضِ اختیارات کا حق ریاست یعنی ریاستی حکومت کو دے کر ریاست جمّوں اور کشمیر کی قانونی حیثیت پر بھی تصدیق کی مہر لگا دی تھی۔ پھر کمیشن نے ہندوستان کی پیش کی ہوئی شرائط کو منظور کر کے اس امر کی مزید تصدیق بھی کر دی تھی کہ (برائے نام) آزاد کشمیر ریاست جمّوں اور کشمیر کا ایک لاینفک حصّہ ہے۔ استصواب رائے سے پہلے اس کا انخلا

1. National Herald, Lucknow 9.3.57

ضروری ہے اور ریاست کے داخلی نظم ونسق تحفظ کے معاملہ اور استصواب رائے کے سلسلہ میں پاکستان کو مداخلت کا کوئی حق نہ ہوگا۔ اب ہمیں دیکھنا چاہئے کہ خود پاکستان نے اپنی ان بین اقوامی ذمہ داریوں کو کس حد تک پورا کیا تھا۔

اس میں شک نہیں کہ جنگ بندی کے بعد قبائلی حملہ آور واپس چلے گئے تھے لیکن یہ بات ظاہر ہے کہ جنگ بندی کے بعد یہ حملہ آور کسی طرح بھی ریاست جموں اور کشمیر میں مقیم نہیں رہ سکتے تھے اور خود پاکستان انھیں اپنے علاقوں میں مقیم رہنے کی اجازت دے کر اپنے اقتصادی وسائل کو زیر بار نہیں کر سکتا تھا۔ اسی طرح پاکستانی افواج بھی جنگ بندی کے بعد ریاست جموں اور کشمیر سے واپسی پر مجبور تھیں لیکن جہاں تک (برائے نام) آزاد کشمیر کا تعلق تھا۔ پاکستان نے اسے خالی نہیں کیا تھا بلکہ اسے ایک الگ حصہ بنا لیا تھا۔ اس کی افواج میں برابر اضافہ کیا جاتا رہا تھا اور استصواب رائے کے لئے پُرامن فضا قائم رکھنے کی بجائے پاکستان اس تمام مدت میں کشمیر کے سوال پر جہاد اور جنگ کے رجحانات کو بھی تقویت دیتا رہا تھا اور اس طرح وہ خود اقوام متحدہ کے کمیشن برائے ہند اور پاکستان کی منظور کردہ قراردادوں کی خلاف ورزی اور اپنی بین اقوامی ذمہ داریوں کو پورا کرنے سے گریز کرتا رہا تھا۔ اور اس نے اپنی ان ہی خلاف ورزیوں اور بین اقوامی ذمہ داریوں کو پورا کرنے سے اپنے اسی گریز پر پردہ ڈالنے کے لئے کشمیر کے معاملہ میں اقوام متحدہ کو براہ راست مداخلت کرنے کی دعوت دی تھی۔

جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے وہ اس وقت تک بھی کشمیر سے متعلق اپنی بین اقوامی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے لئے تیار تھا لیکن جس طرح وہ پہلے نو سال میں برابر اپنے ابتدائی موقف پر قائم رہا تھا اسی طرح وہ اس وقت بھی اپنے اس موقف کو ترک کر دینے کے لئے تیار نہیں ہو سکتا تھا۔ اس نے اس تنازعہ کے کسی مرحلہ میں بھی پاکستان کو اس تنازعہ کا ایک

مساوی فریق تسلیم نہیں کیا تھا۔ اس نے کسی موقع پر بھی ریاست کی حکومت کی قانونی خود مختار حیثیت سے انکار نہیں کیا تھا اور وہ ریاستی حکومت کے کسی فیصلہ اور اقدام کی راہ میں حائل ہونا نہیں چاہتا تھا اور وہ کسی ایسی تجویز کو قبول کرنے کے لئے آمادہ نہیں ہو سکتا تھا جس میں اس کے مؤقف اور ان اصولوں کو نظر انداز کیا گیا ہو جو اقوامِ متحدہ کے کمیشن برائے ہند اور پاکستان نے اپنی ۱۳۔ اگست ۱۹۴۸ء اور ۵۔ جنوری ۱۹۴۹ء کی قراردادوں میں منضبط کئے تھے اور چوں کہ مجلسِ تحفّظ نے ۲۴۔ جنوری ۱۹۵۷ء کو جو قرارداد منظور کی تھی اُسے منظور کرتے ہوئے مجلس نے کشمیر کے تنازعہ میں پاکستان کے اس تمام رویہ کو نظر انداز کر دیا تھا جس پر وہ کمیشن کی مذکورہ بالا قراردادوں کے بعد بھی قائم رہا تھا اور اس کی منظور کردہ یہ قرارداد ہندوستان کے موقف کے خلاف بھی تھی اس لئے ہندوستان نے اسے تسلیم نہیں کیا تھا۔

اس موقع پر پاکستان نے سب سے زیادہ زور اس بات پر دیا تھا کہ ہندوستان نے پاکستان اور امریکہ کے فوجی معاہدہ کو بہانہ بنا کر استصواب رائے کرانے سے انکار کر دیا ہے لیکن جیسا کہ بتایا جا چکا ہے ہندوستان ابتداء ہی سے اپنے اس موقف پر قائم رہا ہے کہ وہ اس سوال کے فیصلہ کے وقت بدلے ہوئے حالات کو نظر انداز نہیں کرے گا۔ اس لئے قابلِ غور بات یہ ہے کہ ہندوستان کشمیر کے سلسلہ میں اپنے جس مذکورہ بالا موقف پر قائم رہا ہے اسے بین اقوامی زاویۂ نظر سے حق بجانب اور درست قرار دیا جا سکتا ہے یا نہیں؟ اور معاملہ کے اس پہلو پر روشنی ڈالتے ہوئے ۸۔ فروری ۱۹۵۷ء کو مسٹر کرشنا مینن نے مجلس تحفّظ میں جو کچھ کہا تھا اس سے یہ بات بالکل صاف ہو جاتی ہے کہ کشمیر کے سلسلہ میں ہندوستان نے اقوام متحدہ کے کمیشن برائے ہند اور پاکستان کی جن قراردادوں کو منظور کیا تھا اگر وہ ان کی منظوری کو بعض واضح شرائط اور اس وضاحت کے ساتھ مشروط نہ بھی کر دیتا کہ وہ ان پر عمل درآمد کے معاملہ میں بدلے ہوئے حالات کو مدِّ نظر رکھے گا تب

بھی وہ بدلے ہوئے حالات میں ان پر عمل درآمد کو ملتوی کر دینے میں حق بجانب تھا۔

چناں چہ مسٹر کرشنا مینن نے مجلسِ تحفظ کے روبرو بین اقوامی قانون کے امریکی ماہر مسٹر ہال کے یہ جملے پیش کیے تھے کہ

کسی معاہدہ میں شریک کوئی فریق بھی ان حالات کے علاوہ جو معاہدہ میں شرکت کے وقت موجود ہوں، دوسرے (یعنی بدلے ہوئے) حالات میں معاہدہ کی شرائط کی پابندی کو لازمی قرار نہیں دے سکتا۔ دوسرے الفاظ میں ہر معاہدہ اسی وقت تعمیل کی پابندی سے آزاد ہو جاتا ہے جب کوئی ایسی اضافی صورت حال پیدا ہو جائے جو معاہدہ کی بنیادی قوت پر اثر انداز ہو کر اسے تبدیل کر دے[1]۔

پھر موصوف نے ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے صدر مسٹر روز ویلٹ آنجہانی کا وہ بیان بھی مجلس کے روبرو پیش کیا تھا جو انھوں نے ۹۔ اگست ۱۹۴۱ء کو دیا تھا اور جس میں انھوں نے بعض معاہدوں کو ملتوی اور تعمیل کی پابندیوں سے آزاد قرار دینے کے اسباب بیان کرتے ہوئے کہا تھا کہ

چوں کہ وہ حالات جن کے پیشِ معاہدہ ہوا تھا یا تو قطعاً بدل چکے ہیں یا ان میں جزوی طور پر تبدیلی آچکی ہے اور (موجودہ حالات میں) معاہدہ کی تعمیل سے حملہ کے شکار (ان) لوگوں کو نقصان پہنچے گا جن کی مدد کرنا امریکہ کا فرضِ اولین ہے۔ پھر معاہدہ کا اصل مقصد بھی یہی ہے کہ اس میں جن حالات کا ذکر کیا جائے انھیں قائم رہنا چاہیے[2]۔

اور مسٹر کرشنا مینن ایک اور ممتاز ماہرِ قانون مسٹر اوپن ہیم کی یہ رائے بھی پیش کی تھی کہ

---

[1] مسئلہ کشمیر دی۔ کے کرشنا مینن کی مکمل تقریر (ترجمہ اردو) سلامتی کونسل میں۔ صفحہ ۱۷۸

[2] مسئلہ کشمیر۔ وی کے کرشنا مینن کی مکمل تقریر (ترجمہ اردو) صفحات ۱۷۸ تا ۱۸۱۔

حالات میں بنیادی تبدیلی اس نوعیت کی (بھی) ہوسکتی ہے کہ (کسی معاہدہ کا)
ایک فریق ایسے معاہدہ کی ذمہ داریوں سے گلو خلاصی کی درخواست کرے جو
یک طرفہ فیصلہ سے ختم نہ کیا جاسکتا ہو۔ بہت سے اہلِ قلم حالات کے بدل جانے
پر معاہدوں کے ناکارہ ہوجانے کے اُصول کو تسلیم کرتے ہیں اور زور دے کر
کہتے ہیں کہ تمام معاہدے وقتی حالات کے مطابق ہوتے ہیں .... ہر معاہدہ
اس شرط کے ساتھ وابستہ ہوتا ہے کہ اگر حالات میں بنیادی تبدیلی کے بدولت
معاہدہ سے متعلق ذمہ داریوں کی ادائیگی کسی فریق کی اہم ترقی کے لئے تباہ کن معلوم
ہو تو اس فریق کو یہ حق حاصل ہونا چاہیئے کہ وہ متعلقہ ذمہ داریوں سے گلو خلاصی
کی درخواست کرے .... کئی ملکوں کے قوانین بھی اس اُصول کو تسلیم کرتے
ہیں کہ اگر حالات کی تبدیلی کی وجہ سے کسی معاہدہ کی تعمیل ناممکن ہو جائے تو اس
معاہدہ کو منسوخ یا فریق متعلقہ کو اس پر عمل کرنے کی پابندی سے آزاد کردیا جانا چاہیئے[1]

مذکورہ بالا حوالوں میں معاہدوں پر حالات کی تبدیلی کے اثرات کے متعلق جو کچھ
کہا گیا ہے۔ وہ نظریات اور اُصولوں ہی تک محدود نہیں بلکہ اس پر عمل درآمد بھی کیا جاتا
رہا ہے۔ چناں چہ مسٹر کرشنا مینن نے اس پر عمل درآمد کی مثالیں پیش کرتے ہوئے بتایا
تھا کہ جنوری اور فروری ۱۹۵۴ء میں جرمنی کے مسئلہ کو حل کرنے کے لئے برطانیہ، فرانس،
امریکہ اور سوویت یونین کے وزراء خارجہ کی جو کانفرنس برلن میں منعقد ہوئی تھی اس میں
سر انتھونی ایڈن، موسیو بیدو، مسٹر جان فوسٹر ڈلز اور مسٹر مولوتاف نے اس بات کا اعتراف
کیا تھا کہ

پوٹسڈیم کے معاہدے کے کئی نکات بعد از وقت ہو چکے ہیں[2]

---

[1]، [2] مسئلہ کشمیر۔ وی کے کرشنا مینن کی مکمل تقریر (ترجمہ اردو) صفحات ۱۰۷ تا ۱۸۱

اور ان تمام حوالوں کے بعد اس بات کا فیصلہ کرنا باقی رہ جاتا ہے کہ کیا واقعی ان حالات میں کوئی تبدیلی رونما ہوئی تھی جن میں ہندوستان نے اقوامِ متحدہ کے کمیشن برائے ہند و پاکستان کی ۱۳۔ اگست ۱۹۴۸ء اور ۵۔ جنوری ۱۹۴۹ء کی قراردادوں کو منظور کیا تھا؟

اس معاملہ میں جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے وہ ان حالات میں رونما ہوتی رہنے والی ہر تبدیلی کے وقت مجلسِ تحفظ کو اس کی طرف توجہ دلاتا رہا تھا لیکن اگر صاحب معاملہ ہونے کی حیثیت سے کچھ دینے کے لئے ہندوستان کی رائے کو نظر انداز بھی کر دیا جائے تب بھی ہمارے سامنے وہ اعتراف موجود ہے جو حالات کے بدل جانے کے متعلق خود اقوامِ متحدہ کے نمائندے کرتے رہے ہیں۔ مثلاً اقوامِ متحدہ کے کمیشن برائے ہند و پاکستان نے اپنی عبوری رپورٹ کے پیراگراف ۲۴۹ میں لکھا ہے کہ

> ایک لحاظ سے توجہاں کی واپسی کا سوال اس حقیقت پر مبنی ہے کہ ریاست کی لام بندی کو ختم کرنے کا سلسلہ جس کا ذکر کمیشن کی ۱۳۔ اگست ۱۹۴۸ء کی تجویز میں ہے موجودہ صورتِ حال کو ختم کرنے کے لئے ناکافی ہے۔ ریاست میں حالات بدل گئے ہے لیکن تجویزوں کی توں ہے۔ ان حالات میں کمیشن نے ایک بار پھر یہ کوشش کی کہ تجویز کی شرطوں کو توڑے بغیر کوئی سمجھوتہ ہو جائے لیکن حالات میں جو تبدیلی ہو چکی ہے اس کے پیشِ نظر اس سے اندازہ ہوا کہ حکومت اس دفعہ پر جو اس کے موقف کے مطابق ہے حرف بحرف عمل کرانا چاہتی ہے۔[1]

اور کمیشن نے اپنی اسی تیسری عبوری رپورٹ کے پیراگراف ۲۸۳ میں اعتراف کیا ہے کہ

> تغیر پذیر اور متحرک حالات کی بدولت، وہ توضیحات جو بہت دن پہلے کی گئی تھیں، سمجھوتہ کی راہ میں رکاوٹ ثابت ہو رہی ہیں اور ۱۳۔ اگست ۱۹۴۸ء کی

[1] مسئلہ کشمیر۔ وی۔ کے کرشنا مینن کی مکمل تقریر (ترجمہ اردو) سلامتی کونسل میں صفحات ۱۸۱۔ ۱۸۲۔

تجویز کا دائرہ ریاست کے حقیقی (موجودہ) حالات کی روشنی میں تنگ ہو گیا ہے [1]

لیکن یہ بات ظاہر ہے کہ کمیشن نے اپنا کام ۱۹۵۳ء کے آغاز میں ختم کر دیا تھا اور اس نے اپنی جو رپورٹیں مجلسِ تحفّظ کے روبرو پیش کی تھیں ان میں ان ہی تغیرات کی طرف اشارہ کیا گیا تھا جو اس وقت تک رونما ہو چکے تھے لیکن ۱۹۵۷ء کے آغاز میں بین اقوامی حالات عالمی قوتوں کے توازن اور خود کشمیر کے حالات میں وہ اہم تبدیلیاں واقع ہو چکی تھیں جن کا تذکرہ گذشتہ باب میں کیا جا چکا ہے اور اگر ۱۹۵۳ء کے آغاز تک رونما ہونے والے واقعات کو نظر انداز کرنا ممکن نہیں ہو سکتا تھا تو ان تبدیلیوں کو نظر انداز کرنا تو قطعاً ناممکن تھا جو ۱۹۵۳ء سے ۱۹۵۷ء کے آغاز تک ہوئی تھیں۔ چناں چہ جب مجلسِ تحفّظ کی ۲۱- فروری ۱۹۵۷ء کی منظور کی ہوئی قرارداد کے مطابق مسٹر گنر یارنگ نے برصغیر ہند آکر حالات کا جائزہ لیا تو انھیں غیر مبہم اور واضح الفاظ میں اس بات کا اعتراف کرنا پڑا کہ

> اس خطۂ ارض میں فوجی اور سیاسی قوتوں کا توازن بدل گیا ہے اور یہ آج کے بدلے ہوئے حالات میں ان تجاویز پر عمل درآمد ممکن نہیں ہو سکتا جو نو سال پہلے منظور اور طے کی گئی تھیں [2]

اور اس طرح مسٹر یارنگ نے بھی اس بات کی تصدیق کر دی کہ کشمیر کے سوال کے اُٹھنے کے بعد سے ۱۹۵۷ء کے آغاز تک حالات میں جو زبردست تبدیلیاں رونما ہو چکی ہیں ان کے پیشِ نظر ۱۹۴۸ء کی تجاویز کے مطابق استصوابِ رائے کا اہتمام ممکن نہیں ہو سکتا۔

لیکن اس باب کو ختم کرنے سے پہلے یہ بتا دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ کسی مسئلہ اور

---

[1] مسئلہ کشمیر۔ وی۔ کے کرشنا مینن کی مکمل تقریر (ترجمہ اردو) سلامتی کونسل میں صفحات ۱۸۱-۱۸۲

[2] مسٹر گنر یارنگ کی رپورٹ (خلاصہ)

معاملہ پر بروقت استصواب رائے نہ کرانے کے بعد استصواب سے دست بردار ہو جانے کا طریقہ بھی کوئی نیا طریقہ نہیں ہے۔ اور استصواب رائے کی تاریخ میں اس کی مثالیں بھی ملتی ہیں۔

چناں چہ مجلسِ تحفّظ کے روبرو مسٹر کرشنا مینن نے معاملہ کے اس پہلو کی وضاحت بھی کردی تھی اور بتایا تھا کہ ۱۹۲۱ء میں وِلنا میں رائے شماری کی تجویز طے ہوئی تھی، نیز چلی اور پیرو کے درمیان جو معاہدہ ہوا تھا اس میں بھی ایک علاقہ کے سلسلہ میں استصواب رائے کا فیصلہ کیا گیا تھا لیکن چوں کہ یہ استصواب رائے بروقت نہیں کرایا جا سکا اس لئے مجلسِ اقوام کی کونسل کے لئے اپنے اس فیصلہ پر عمل درآمد کرنا ناممکن ہو گیا اور اسے یہ بات معلوم کرنے پر مجبور ہو جانا پڑا کہ کیا متعلقہ فریق واقعی استصواب رائے کے خواہش مند ہیں؟ اور یہ کہ اگر استصواب رائے ممکن نہ ہو سکے تو کوئی دوسرا اور موثر طریق کار دریافت کیا جائے۔

ان تمام واقعات، قانونی نظریات اور ان کی وضاحتوں، نیز تاریخی مثالوں کی روشنی میں کشمیر اور اس کے ساتھ ہندوستان کے تعلّق کا سوال بالکل صاف ہو جاتا ہے اور اسے نہایت سادہ اور مختصر الفاظ میں اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے کہ

ہندوستان کے ساتھ، ریاست جمّوں اور کشمیر کا الحاق ریاست کے حکمران نے رضا کارانہ طور پر اپنے اس حق اور اختیار سے کام لے کر کیا تھا جو قانونِ ہند کے مطابق انھیں اپنی ریاست کو ہند اور پاکستان میں سے ایک ملک کے ساتھ ملحق کر دینے کے سلسلہ میں حاصل تھا اور انھیں اپنے اس فیصلہ میں کشمیر کی سب سے بڑی سیاسی تنظیم، نیشنل کانفرنس، اور اس کے تمام رہنماؤں کی جن میں شیخ محمد عبداللہ بھی شامل تھے کامل تائید اور حمایت حاصل تھی۔ یہ الحاق قطعی اور غیر مشروط تھا لیکن ہندوستان نے اپنے جمہوری نظریات کے ماتحت خود اس بات کی پیش کش کی تھی کہ وہ الحاق کی مزید تصدیق کے لئے، حالات معتدل ہو جانے

کے ہی استصواب رائے کرائے گا لیکن پچھلے بارہ سال کی مدت میں ایک جانب تو پاکستان کے مسلسل عہد شکنیوں کی بدولت حالات اعتدال پر نہیں آسکے اور دوسری طرف ریاست کی مجلسِ دستور ساز نے نہ صرف اس الحاق کی توثیق ہی کردی بلکہ ہندیونین کی دوسری ریاستوں کی طرح ریاست جموں اور کشمیر میں بھی دو عام انتخابات ہو چکے ہیں۔ پھر مسٹر گز بادنگ کے الفاظ میں اس خطۂ ارض میں فوجی اور سیاسی قوتوں کا توازن بھی بدل چکا ہے اور مسٹر اوپن ہیم کی رائے کے مطابق کشمیر کے باشندوں کو یہ حق بھی پہنچتا ہے کہ وہ اپنی اہم توقعوں پر استصواب رائے کے کھلے ہوئے نقصان رساں اثرات کے پیشِ نظر اس تجویز کو قبول کرنے سے صاف انکار کردیں اور ایسی مثالیں بھی موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ استصواب رائے کے فیصلوں کو صرف اس بناء پر ترک کیا جاتا رہا ہے کہ ان کی تعمیل میں دیر ہوئی تھی اس لئے اگر آج کشمیر کے باشندے استصواب رائے کی تجویز پر عمل کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں تو ہندوستان ان کے اس فیصلہ کے احترام پر مجبور ہے اور استصواب رائے کے معاملہ میں ہندوستان پر بدعہدی اور وعدہ شکنی کا کوئی الزام عائد نہیں کیا جاسکتا۔

غلط نامہ

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۹	۱۴	اسوتی کمسانجی	استوتی کمسانجلی
۹	۲۰	تات رام	تاب رام
۱۹	۱۱	دوشیزہ	زوجہ
۹۴	فٹ نوٹ	The Nations	Two Nations
۱۰۲	۲	نہیں جاسکتی	نہیں کہی جاسکتی
۱۱۰	۱	ثابت ہوجاتی ہے	ثابت ہوجاتا ہے
۱۱۴	فٹ نوٹ	Kasimir	Kashmir
۱۱۷	فٹ نوٹ ۱	Kashmin	Kashmir
۱۲۷	فٹ نوٹ ۲	in the mell ing	in the making
۱۲۸	فٹ نوٹ ۱	Hari Singh	to Hari Singh
۱۵۴	۵	حملہ آوروں کو	حملہ آوروں سے
۱۶۸	۱۱	مقدمات کی جماعت	مقدمات کی سماعت
۱۷۱	۱۳	مسطر باتوں	مسلمہ باتوں
۱۷۶	فٹ نوٹ	Alfredo Loyantl	Alfredo Lozano
۱۹۳	۳	حکومت کشمیر	حکومت کشمیر نے
۲۱۲	۱۱	انخلا کو	انخلا کے
۲۳۴	۱۵	مفر تھا	مضمر تھا
۲۵۵	۱۲	برخواستگی	برخاستگی
۲۵۷	۹	ریاستی طاقت	ریاستی انتظامیہ
۲۵۷	۱۰	غیر جانبدار ...	غیر جانبدار طاقت
۲۶۱	فٹ نوٹ	Two Nations and , shmir	Two Nations and Kashmir
۲۷۶	۹	رسالہ لک	رسالہ لک (Look)
۲۷۶	فٹ نوٹ ۲	(Look)	(خارج)
۲۸۸	فٹ نوٹ ۱	Ambla	Ambala
۲۹۹	۱۸	مسٹر کرشنا مینن	مسٹر کرشنا مینن نے